

ہر قسم کی نہایت اعلیٰ چھپائی و رنگین لیتھو پرنٹنگ کام
نیز فینسی پیپر باکس و بلاک بکھفایت تیار کئے جاتے ہیں
قادری پیپر بکس فیکٹری
نور منزیل - محمد علی روڈ - بمبئی ۳

TEL:-27656

Kadri Paper Box Factory.

CARDBOARD BOX MANUFACTURERS AND PRINTERS
NOOR MUNZIL, MOHAMEDALI ROAD, BOMBAY 3.

ادبی مرکز ہند پیشترز کا ماہنامہ

ایشیا

ہندوستان پر اشترز ماہنامہ ایشیا ادبی مرکز ہند پیشترز

ساغر نظامی

عبدالقادر محمد قادری

ادارہ
ذکیہ سلطانہ
ساغر نظامی

ناشر
ادبی مرکز ہند پیشترز

بائیکلہ بمبئی ۵۰

کرائسٹ چرچ روڈ

کورٹ رائیل

قیمت فی پرچہ

مشماہی چندہ

سلا ند چندہ

بارہ آنے

پانچ روپیہ

آٹھ روپیہ

ٹریبلشر ساغر نظامی ۷۷ قادری پریس نورمنرل محل مدی بمبئی ۷۷ میں چھپوا کر ادبی مرکز ۷۷ لے۔ کورٹ رائیل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۷۷ سے شائع کیا

ریگلو پروڈکس

ریگلو سیر آئیل

دور حاضر کا بہترین کیمیاوی روغن، گھنچ کو دور کر کے بالوں کو اکٹھا کرتا۔ گرنے سے روکتا۔ مضبوط۔ دیر اور چمکدار بناتا ہے۔ دماغ کی تازگی بخشتا ہے۔ اسکے متواتر استعمال سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ اور بوڑھے میں جوانی کی بہار لوٹ آتی ہے۔

ریگلو ٹانک

جگر کو تقویت بخشتا اور خون صاف پیدا کرتا ہے۔ وزن بڑھاتا اور چہرہ کو جوانی کا رنگ دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے قوت جسمانی دو فٹ ہوتی ہے۔ صفائی معدہ۔ طحال اور جگر کے لئے آکسیجن کی حیثیت رکھتا ہے۔

منجن پائیریا

مرض پائیریا کی مخصوص دوا ہے۔ مسوڑھیل کی سوجن دور کرتا ہے۔ منہ کی بدبو مٹاتا ہے۔ اور دانتوں سے خون و پیپ کی آمد کو بند کر دیتا ہے۔ ہلے ہوئے دانتوں کو اس طرح جما دیتا ہے گویا وہ کبھی ہلے ہی نہیں تھے

ریگلو بام

نزلہ۔ زکام۔ سینے کے جکڑنے۔ در دوسرے جوڑوں کے درد اور ہر قسم کے دھکیئے اکسیر ہے

ریگلو کمیکل ورس پر دھان منیشن۔ جے جے ہسپتال۔ بمبئی ۳

ایسیا

جلد (۱۰) فروری ۱۹۴۹ء نمبر (۱)

- ۱۔ انجام سے آغاز تک — ادارہ — ۴
- ۲۔
- ۳۔
- ۴۔
- ۵۔ سربج بہادر سپرو — ۷
- ۶۔ پیغامات — ادوارو قائمین — ۹
- ۷۔ طوفان سے پہلے طوفان گھبرا — ساعر — ۱۷
- ۸۔ امر جوت (نظم) — ذکیہ سلطانہ — ۳۳
- ۹۔ بحالیہ کا پیغام — موسیو پال رچرڈ — ۳۵
- ۱۰۔ تاثیرات (نظم) — احمد ریاض — ۳۸
- ۱۱۔ ساقی (نظم) — اختر چوشتیار پوری — ۳۹
- ۱۲۔ کہانی کی کہانی (افسانہ) — کرشن چندر — ۴۰
- ۱۳۔ سویرے سویرے (نظم) — عابد حشری — ۴۵
- ۱۴۔ غم زمانہ (غزل) — مضطر اکبر آبادی — ۴۵
- ۱۵۔ منفرک اثر اطلاق و عادات پر — خواجہ غلام الدین — ۴۶
- ۱۶۔ ایک پرتو (نظم) — اختر الایمان — ۴۹
- ۱۷۔ غزل — سلام بھلی شہری — ۴۹
- ۱۸۔ کچھ حقیقت کچھ افسانہ — ممتاز حسین — ۵۰
- ۱۹۔ توتلی شاعر (نظم) — بل راج کول — ۵۴
- ۲۰۔ نظم لائن اور نئی پریم چند — "ہنس" — ۵۵
- ۲۱۔ جنت غبار و نظم — باقر رحوی — ۵۶
- ۲۲۔ پوسٹ ماسٹر (افسانہ) — پٹکن (ترجمہ) — ڈوا احمد علی — ۵۷
- ۲۳۔ متواتر روایات — علامہ مولانا ابوالکلام آزاد — ۶۴
- ۲۴۔ زاویے (نظم) — قمر یاشی — ۶۵
- ۲۵۔ فانی کے نظریہ حیات کا اثر { غلیل الرب ایم ایچ — ۶۶
- ان کی شاعری پر
- ۲۶۔ انسان کی لاش (افسانہ) — مہندر ناتھ — ۷۳
- ۲۷۔ لرزشیں (نظم) — میراجی — ۷۶
- ۲۸۔ خوبصورت حقائق — اسرار الحق مجاز — ۷۷
- ۲۹۔ مارشل پلان — کلیم اللہ — ۷۸
- ۳۰۔ غزل — عالی جعفری — ۸۲
- ۳۱۔ دیوانی — غلام ربانی تاباں — ۸۳
- ۳۲۔ شادی کا باجرہ (افسانہ) — راجندر پرکاش — ۸۴
- ۳۳۔ انفلاس — ساعر — ۸۷
- ۳۴۔ غزل — مسعود زری میرٹھی — ۸۸
- ۳۵۔ سداہ عاشقے — خواجہ احمد عباس — ۸۹
- ۳۶۔ گور کی اور ناسائے — جوہر میرٹھی — ۹۱

انجام سے آغاز تک!

دیکھتے تھے۔ انسانیت کا خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے انہوں نے اپنی فکری و ملی قوتوں کو وقف کر دیا تھا خواب شرمندہ تو یہ نہیں ہوئے۔ لیکن خواب شرمندہ تعبیر ہوں گے۔ ہر چند کہ ۵ سال میں ملک کا نقشہ ہی نہیں بدلا، دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے۔ لیکن ہر دم اک بازہ فیر و لگائی ہوئی جیٹو ایک نیا گرب، اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بڑی تبدیلی بدلتی ہوئی کسرا رہی ہے اور خواب حقیقت مند رہیں گے۔

۵ سال قبل ہمارے سامنے ملک کی آزادی اور تیسرا صد تھا۔ بہر تقدیر آزادی کے بعد بھی پورا نہیں ہوا تبصر نے اس مقصد کی راہیں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں ان پیچیدگیوں کے پہلی تمام کوششوں کو بے اثر کر دیا ہے۔ لہذا اب اندر سے نئے حالات کی روشنی میں تمام بنیادی و تعمیراتی کوششیں کرنی ہونگی۔ جہاں تک ایشیا کے طریق کار کا تعلق ہے شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا دائرہ فکر و عمل کبھی محدود نہیں رہا وہ مسائل کے متحدہ حل کا قائل ہے اس نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ہے اور ماضی کے افراط سے آزاد ہو کر ہماری زندگی کی طرح نئی ہے اسی نئی تہذیب کو ہمیں نوا دانا اور نگہباز کرنا چاہیے۔

چنانچہ ہم اب بھی جداگانہ ہندو مسلم تہذیب کو کام پر نہیں لائے تہذیب سوشلزم کے خلاف آزاد ذہن کو مگر گے جن کے درمیان ہندو مسلموں کے تہذیبی مٹھوں کو توڑنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ہم تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی تقسیم کی ہر ممکن مخالفت کریں گے اور مٹھ ہندی کے دیوؤں کو ایک جھٹکے کے نیچے جمع ہونگی دعوت دینگے۔ اگر سب مل کر اپنے مشترک سرمایہ کی حفاظت کریں گے۔

ایشیا ۵ سال کے بعد پھر شائع ہو رہا ہے۔ التوا کی یہ مدت اتنی طویل ہے کہ اس کی اشاعت کا خیال بھی دل میں نہیں آتا چاہے تھا لیکن یقین کیجئے کہ ان پانچ برسوں میں ایک لمحہ بھی اس خیال سے آزاد نہیں گذر کر ان پانچ گونہ ہونا چاہئے۔

ایشیا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک جاری رہا یعنی کامل ۵ سال تک اس نے ان تمام سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریکوں میں اپنی بڑا ہرکے مطابق حصہ لیا جو اس کے نفاذ کی ترقی پسند تحریکیں تھیں اور جن تحریکوں کی کامیابی سے ملک کا مستقبل وابستہ تھا۔

ایشیا نے قومی تحریک کے ساتھ ساتھ ادب کی نئی تحریک کے لئے کام کیا۔ اس نے صاف سوچنے والے ہشجرا اور اپنی ظلم کا ایک ترقی پسند حلقہ اس وقت بنایا جب ترقی پسند تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور جب یہ تحریک شروع ہوئی تو ایشیا سب سے پہلا ماسما تھا جس نے اس کی تائید و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ نوجوان ذہن کے لئے و مستقل ترغیب تھا۔ اس نے نیا ادب نئے ادیب اور نئے ادب نواز پیدا کئے اور خاص طور پر اردو پر غور کرنے والے ہندو مسلم حوام میں سیاسی شعور بکھرنے کی ان تحریک کوشش کی جی جیاد دہلائی سیاست پر نہیں، سیاست کی بنیادی باتیں جاننے پر تھی۔

ایشیا نے صرف ہندو مسلم اتحاد کا دوا نہ تھا بلکہ اتحاد ایشیا کے گیت مٹانے والوں میں سے تھا اس کی آزاد و سوشلزم کے مشرق کے تمام کھمبے ہوئے تہذیبی رشتے اس طرح جڑ جاتیں کہ کچھ کوئی طاقت ان کو نہ توڑ سکے۔

وہ ان دواؤں کا ایک کارواں تھا جو سود و زبان سے آزاد ہو کر قومیت کا خواب دیکھتے تھے، تہذیب ملک کا خواب

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۳۷ء

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے راہ مکمل ہے اور ہم
 کے مقابلے میں ہمارے فریق بہت کچھ
 گئے ہیں ان اہم فرقوں سے عہدہ برآہوں کے متعلق
 اور دعوے کرنا آسان بات نہیں۔ ہم صرف اپنی بہت کا اظہار
 کر سکتے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے شاید اعلان
 کی ضرورت نہیں۔ ہمارے راہ صاف اور براہ راست ہے ہم
 راہ کے سج و جہ اور بہت شگن بہت فائدہ کسی
 کسی طرح عہدہ کرتے ہیں اور اپنی منزل پر پہنچ کر دس لیں گے۔

کو چار جاندار لگا رہے ہیں۔

کی طرف ہدایت ہو۔ یہ ذمہ داری کی ایک اہم دستاویز ہے۔ جس کے ایک ایک نقطہ ہم نے جبری دوم سے امیدیں قائم کی تھیں ہیں چنانچہ امیدوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے۔

ادب کی قدروں پریم کا اثر

تقسیم سے قبل اردو ادب جن راہوں سے گزرا وہ جدید و جدید کی
دلیسی اور اہم شخص جن میں سیکڑوں گزرتے ہیں اگر کسی شخص۔ ان میں
ہماری سے بھونٹے والے ہیں جسے اور حال سے نکلے ہوئے نے راستے
بھی۔ ان ماستوں پر کھنکھناتے قصورات اور متغایا خیالات کا انداز
ہے کا انداز لائے ایکسٹریٹ شاہراہ کی طرف جیتے رہے۔ بہشتا ہزار
بھانویں غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی شاہراہ تھی۔ جو ترقی پرستی
اور محنت پسندی کے حلقوں سے محفوظ نہ تھی۔

کیوں اودھا دیا ہے اپنی فوج تو خلیفہ تان سے ان دونوں کے
 حملوں کا مرادوار تھا بلکہ اس مقابلے سے اس میں بھی توانائی
 پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے قوی تحریک میں عوامی شعور بڑھتی کرتا
 گیا، ارب کے مضمون اور اقتصادی تحریک کے مسائل ملک کا ادبیں و حکمران
 مبرا پہنچ گئے جوئے سماجی شعور کے افسانوں کو گرفت مبرا لگی۔ اعجاز نکاح
 ایک ترقی و جرات اور جیکھا نانا زائے شعلے کا بعض گوشوں میں تو ادب کی نئی
 تحریک قوی تحریک سے آگے بڑھ گئی تاہم یہ نظریات اور عمل میں کوئی
 قطعی رابطہ پیدا کرنے کا کام نہیں تھا۔ بہت کچھ بے ربطی موجود ہے۔
 ہاں ملک ملک قیوم ہو گیا۔ اور میرے ربطی نقطہ وقوع پر منتج گئی۔

[illegible]

میرا زندگی بے جا نہ نہیں ہوگئی ہے۔ اگر تو میں سے تو اس کے سینے سے نہ نکلت
فرور کچھ لکھے اور ملائے وقت کی شاخوں میں کسی چولہا چولہا زندہ آج رہے۔
اگر مجھ پر نظام کو خلی غشی منج ابھرنی ہے اور فرور ابھرے گی تو اس
وقت نہ تو دنیوی فخر اگر نہ ملے گا ادیب کہاں پناہ میں ہے۔ ۹۔

تقریباً ایک خاندان کے افراد کو در سلطنتوں میں فرور بلاٹ دیا اور
دل فرور دینی ہر بلادہ زخموں کا انجام انہ مال کے سوا کچھ نہیں مانگیں انھیں
محبت کے آنسوؤں سے خالی نہیں اور جب تک انسان میں ناسائیت کی
پایں موجود ہے خالی نہیں ہو سکتی۔

اُن ادیبوں اور شاعروں کو جس کے لوہے میں فرق برستی، ارجحیت پسندی اور مذہبی محسوسیت کا زور محسوس کیا جائے۔ یہ سوشل جاسٹس کا ادب برلنی ہوئی سیاست کا غلام نہیں ہوتا۔ ادب کی تصویق یا ردی اس کی ایک اہم قدر ہے اور اسے اُنسانی ادب میں بھی بانی رہنا چاہیے۔

[illegible][illegible]

آج جب ہر طرف ذہنی اقتصاد ہے، ہزاروں برس کی تہذیبی مہدایات
الطریقہ ہدیہ ہیں ادب کی نئی تدبیر غلو میں ہیں۔ جسے آگے بڑھ کر لڑکی
مخافت کرنا ہے اور سطر لکھ کر کٹر کر لینا ہے جو دستخطوں کی علامت ملو
سیاسی خود مختاری سے پیدا کیا ہے اور درجہ پانچواں تیسرے پانچواں پانچواں ہے
بطریقہ لکھ کر کیا سیاسی خود مختاری کی بنیاد پر خردی علیحدگی اختیار کر لی
جاتے آں سوہ سے غلو کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر
لاتے ہیں۔ اگر دیا ہوا حق میں ایک دوسرے کے لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر
ٹری کی بددستی اور لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر لکھ کر

نویسہ سلطانہ
آغا نظامی

ڈاکٹر تاج بہادر سپرو

آزاد ہند کے آسمان پر ہزاروں نئے ستارے جگمگاتے ہیں لیکن زندگی کے افق سے کبھی یہ ستارہ طلوع نہ ہوگا جزیرہ ترک تہذیب کا ستارہ تھا متحدہ تہذیب کا ستارہ تھا اور متحدہ قومیت کے عرش کی فنونیل تھا۔!

مر تاج بہادر سپرو کی مسلسل علالت بجائے خود ہندوستان کا مستقل نظم و انضام تھی لیکن ان کی موت تو ایک ایسا نقصان ہے جس کی جلائی کوئی آنے والا زمانہ نہ کر سکے گا۔ ان کی ذات متحدہ قومیت، جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک آبرو تھی، وہ قدیم تہذیب و اخلاق اور جدید تمدن و تقسیم کا ایک شاندار مظہر تھے۔ ان کی ہستی کا قانون سیاست ادب و فن و صنعت اور علم و عمل کا ایک بکیرہ امتزاج تھی، وہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور ان کی سب سے نمایاں صفت اپنی یک رنگی برائے کائنات تھی ان کے دماغ و روح کے درمیان ایسا کوئی خلا موجود نہ تھی جہاں زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق شک اور تذبذب نے اپنا آشیانہ بنایا ہو۔

روح سے لے کر دماغ تک اور مذہب سے لے کر سیاست تک وہ ایک پالینک نظر، آزاد خیال مفکر تھے۔ جن کے انداز فکر میں کبھی دینی، سیاسی یا کونسلر عقیدت کا شائبہ نہ تھا۔ مادی ترقی کی ہوا میں پر پہنچنے کے بعد وہ تہذیبی رجعت کے دام میں نہیں پھنسے وہ اپنی ہی کا کونسلر سے تونڈ رہے اور احوال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ بالآخر اس مرکز پر قائم ہو گئے کہ ہزاروں سال میں ہندو مسلمانوں کے دونوں میل جول سے جو کچھ زبان اور زندگی پیدا ہوئی ہے وہ زندگی ہندوستانی قومیت کا ایک پورا نظام اپنے اندر یکجہل کر چکی ہے۔ یہی نظام ہماری موجودہ نسلوں

کے لئے ایک آدرشی نظام ہے۔ یہی ایک آئینہ تہذیب ہے جسے ہم اختیار کر چکے ہیں اور جو دیکھیں بس چکی ہے۔ ۱۰۔ سر سپرو کی محبت میں یقین ہوتا تھا کہ ہم ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں صرف ایک قوم سستی ہے۔ جہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی دوسری نہیں ہے۔ جہاں انسانیت کے سوا کسی دوسرے مذہب کی حکومت نہیں ہے۔

وہ مجتہد آدرش تھے، ایک اچھے ہندو کا، ایک اچھے مسلمان کا، ایک اچھے ہندوستانی کا اور ایک اچھے انسان کا۔! یہ حقیقت وہ اچھا انسان، اس وقت ہم سے جدا ہو گیا۔ جب ہم تہذیب کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ سپرو کی موت ہند کے دل میں ایک گہرا زخم ہے جو آسانی سے نہیں بھرے گا۔ یہ ایک ہی زخم ہوتا تو شاید کچھ بھی جاتا لیکن یہ احساس کہ نئے بننے والے سماج میں شاید اب کوئی دیگر سپرو پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بجائے خود ایک زخم ہے اور پہلے زخم سے نہیں زیادہ گہرا ہے۔

ڈاکٹر تاج بہادر سپرو فارسی اور اردو کے ممتاز عالم تھے تاریخ اور دینی تہذیب و ترقی سے متعلق ان کی مخلصانہ کوششوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

ہندی اردو کے سلسلے میں انھوں نے پوری رواداری اور وسیع الطبعی سے مسائل کو حل کرنے اور دوسروں سے حل کرانے کی کوشش کی۔ ان کی ادب نوآوری، اور اردو شاعری سے ان کا خلقی ذوق اردو کے تمام، قدیم جدید، نوجوان اور سن رسیدہ ادیب و شاعران کی ذات سے وابستہ رکھتا تھا۔ اردو بھی میر تقی میر کے قدیم شناس تھے، باوجود اختلاف خیال کے وہ اس عہد کے انقلابی شعراء

میں بھی اتنی ہی گہری دوستی رکھتے اور ان کی قد و منزلت کو جتنے جس قدر کہہ لکھو اسکول کے شرار کی عزت کرتے تھے۔ وہ ان کی مصافحہ فطرت سے نہیں ہمیشہ زندگی کی بد و چھوٹ اور سیاست کی ہمتیوں سے محفوظ رکھا۔

طاقت پر ترجیح بہادر و ایک ممتاز کھسروی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے جذباتی جذبات رادھا کشن پرورش میں ڈھکی چھپی کے عہدہ پر فائز تھے ان کے شیر کے سوز و زین میں ان کا شکار ہوتا تھا۔

وہ ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئے ۴ سال کی عمر میں ستھانے انفرانس پاس کیا اور آگرہ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر پیٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح ان کی شاندار علمی زندگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچی۔

تلافی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی عام سماجی و سیاسی تحریکیات میں نمایاں شہرت حاصل کرتے گئے ۱۹۵۷ء میں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے ۱۹۶۱ء میں یو۔ پی کی لیجلیٹو کونسل کے ممبر نامزد کیے گئے اور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک وہ اسپرل لیجلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ ۱۹۶۳ء میں وہ یو۔ پی کی لیبرل لیگ کے صدر ہوئے ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا میں قانون کے ممبر مقرر کئے گئے۔ ۱۹۶۳ء میں اسپرل کانفرنس کے ممبر کی حیثیت میں ان کی صلاحیت و علم پر کوسراہا گیا۔

ترجیح بہادر سپر لیبرل عقیدہ رکھنے والے سیاست دانوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انتہا پسند اور کانگریسی نہیں تھے۔ لیکن کچھ لبرل مافیا اور ایک متحدہ قومیت کے ترکیب مخالف کے متعلق انتہا پسندوں سے زیادہ صاف مغبوط اور مثبت راویہ نگاہ رکھتے تھے بے شک وہ انقلابی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک صلح خواہ اور بہتر و محب وطن فرد نہ تھے۔ خواہ اس حقیقت کو انقلابی ذہن تسلیم نہ کرے لیکن یہ ایک تین حقیقت ہے کہ بالآخر انتہا پسند قوم پرستوں کو بھی اپنی بلند یوں سے سیاست کی اسی سطح

پر اتر کر خلائی کاسٹرباب کرنا پڑا جو مسند لین کی سطح تھی۔ بہرحال وطن کی تعمیر میں بیچ بہادر سپر کی تعمیری کوششوں کو قومی سیاست کی تاریخ میں غور و فکر دی جائے گی۔ ۱۹۶۳ء میں سپر جیکر مشن نے حکومت اور کانگریس کے مابین ایک گولڈن کالفرنس کے لئے سمجھوتہ کی بنیاد رکھی۔ اور ڈاکٹر سپر نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو منوانے کے لئے متقابل قوتوں کو ایک نقطہ پر متحد کرنے کی جان فوڈ کوشش کی۔ یہ انہیں کی اخلاقی کشش اور قوت اراوی کا اعجاز تھا کہ اگست ۱۹۶۳ء میں ان کی دعوت پر بہا تاجی گولڈن کالفرنس میں شریک ہوئے۔

۱۹۶۳ء میں وہ پریسی کونسل مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں ۶ ہندوستانی لیڈروں نے کانگریسی رہنماؤں کے خلاف لگائے ہوئے الزامات کے خلاف ایک بیان دیا جس میں انگریزی حکومت سے آزادی تحفظات اور غیر جانبدارانہ ثالث مقرر کرنے اور رہنماؤں کو ہارگریز کا مطالعہ کیا۔ تاریکی اور دایوس کے اس بہت شکن عہد میں جن ۶ رہنماؤں نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو ختم کرنے کے لئے قدم اٹھایا ان رہنماؤں کے رہبر ترجیح بہادر سپر ہی تھے۔ سیاسی میدان میں ان کی آخری جھٹک ٹیکنیٹ مشن کی آمد کے موقع پر دکھائی دی، اس کے بیان پر فوج کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے۔

پیشامات میں ان کا آخری خطا بڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عین اس وقت جب گہری تاریکی میں اس چراغ کی ضرورت تھی موت کے بے رحم جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔ لیکن جوت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی زندگی ایک آدرش تھی ایک نمونہ تھی۔ جوابدہ ہندوستانییت اور انسانیت کی جوت جگاتی رہے گی۔

ادارہ

پیغامات

مادام صوفیہ واڈیا۔ بانی انڈین پی۔ ایسی۔ این

۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء

عزیز دوست!

آپ کے ہندو تارکے خط کا شکریہ خط سے زیادہ خوشی تو یوں ہوئی کہ میں خود آپ کے مسکن کا پتہ چلانے کا کوشش کر رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب سے میں نے آپ کا کلام سنا ہے۔ تب سے کافی مدت گزر چکی ہے۔

مجھے پیچیدہ ادبی مرکز اور ایشیا کی نئی زندگی کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ایشیا نے مجھے چند سالوں تک ہندوستان کی کچھل اور ذہنی زندگی میں اپنا حق ادا کیا ہے اور آہ ہندوستان میں ادبی مرکز اور ایشیا کے تازہ علمی و ادبی اعزاز کی حیثیت ایک اتارنے کی جہتی۔ پہلی ہی نہایت مختصراً اور نیک آندہ دین ان دونوں اداروں کے لئے بھیج رہی ہوں کہ یہ تمام دہار کی ہیں۔

آپ کی مخلص

صوفیہ واڈیا

محترم عصمت چغتائی بی۔ اے

بہن دیکھتے۔

یہ سن کر کہ "ایشیا" پھر سے جاری ہو رہا ہے۔ مسرت ہوئی۔ امید ہے کہ اسی کی صورت دیکھ کر یہ اختیار کچھ دینے کو جی چاہے گا۔ نیز امید ہے کہ "ایشیا" بجائے گنتی کے پرانے علم ادب کے سماروں کے بنے۔ نئے دلوں کی رہنمائی اور بہت اوقاتی ارگٹ زندگی کے حویہ تازہ کر ڈالے اس نے یہ جاننے کے حواس لوں کو چھٹکایا ہوگا۔

خاکہ عصمت

آرتھریل سٹرنی جی کھنڈر غریب سہمی

کیمپ جے پور
۲۲ دسمبر ۱۹۲۳ء

ہندوستان کی ذہنی اور کچھل ترقی کے لئے ہمارے ذہن طبقہ کی نگاہ تارکے غور کوشش بہت ضروری ہے، گذشتہ دور میں جب کہ ہم غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے معروف پیکار تھے قوم کی تمام کوشش اور توانائی سیاسی سرگرمی کی خاطر وقف تھی، جتنی کہ ہمارے کچھل سرگرمیوں میں سیاسی تنگ نظری کا رد ہوا، اس لئے کہ ہم ایسی کوشش چکر کو قبول کرتے ہوئے تھے جو ہمارے سیاسی شن کی کامیابی میں ہرگز آہستہ تھی، اب جو نیکو سیاسی کشیدگی آزادی کی زیادہ خوش گوار اور کچھل فضا میں ختم ہو چکی ہے، ذہنی اور کچھل سرگرمیوں میں ترقی کا بہت امکان ہے۔ ہمارے مستقبل کے لئے یہ ابتداء مبارک ہے کہ کچھل اتحاد کا مقصد پیش نظر رکھ کر بعض ادارے ہماری آزادی کے ادراک میں ہرگز بڑے حصہ دار کام کے منصوبوں کو لئے کرپش قدمی کر رہے ہیں۔ ادبی مرکز کا ایشیا بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، بالخصوص اس لئے کہ اردو، ہندی اور انگریزی کے توسط سے کام لیا جائے گا اور اس طرح ہمارے تہذیب میں تین گراں قدر دھارے سمونے چاہیں گے۔ میں اس کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں،

(ولی جی۔ کھیر)

ہنریکیسنسی کنورس ہمارا ج سنگھ گورنر آف بمبئی

گورنر ہاؤس بمبئی
۲۲ دسمبر ۱۹۲۳ء
ڈیر سٹرنٹ!

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۲۴ء

ہذا کیلئے نے خواہش کی ہے کہ میں آپ کے انفرادی رخ کے خط
کا شکریہ ادا کروں۔ اور ذیل کا پیغام بھیجوں۔

یہ فردت مسند پر بھی چلا وہاں اس پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا
کہ ہم اپنے پڑائے کو کے درخت کو محفوظ رکھیں اور اسے لالہ لالہ کریں، کچ
دنیا کو جسے توجہ سے نقصان پہنچا۔ ہاں پہلے کے سہارے کی فردت ہے
جاگدہ سرحد جو سکے میں ایشیا کی پوری پوری کامیابی کی آرزو
کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ وہ جریدہ ہے جو اس نصب العین اور
کچل اور اچھاو کے حصول کے لئے وقف ہے۔

(ایل۔ ایم۔ ٹاؤگرنی)

سرتیج بہادر سپرو بارلیٹ لا

۱۹ ابرق ۱۳۴۵ھ
مرورہ دار میرٹھ

جناب بندہ۔ تسلیم دنیاؤ

میں تو وہاں سال سے مرض نالج میں مبتلا ہوں۔ ایک قدم بھی
نہیں چل سکتا۔ کچھ کام ہاتھ سے کر سکتا ہوں۔ بے پنے میکیٹری
سے کہہ دیا ہے وہ خط آپ کو میری جانب سے لکھ دیتے۔

میں آپ کے رسالہ کی کامیابی دلی دجان سے چاہتا ہوں مگر غرض
کوئی کتاب یا اخبار نہیں پڑھ سکتا کہوں کہ اخبار یا کتاب اپنے ہاتھ میں پڑنا
میرے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ نیاز

بندہ
تیج بہادر سپرو تعلیم ذہن لعل سری دستور اسیکریٹری

ڈاکٹر سپراند سہا بارلیٹ لا

اولین صدر دستور ساز اسمبلی ہند

سہالا تیری ریڈو۔ پوسٹ بکس ۵۷۷ جی پی او۔ پٹنہ
۵ اکتوبر ۱۳۴۵ھ

میرے پیارے نظامی صاحب

آپ کا گیارہ دسمبر کا خط انگریزی اور دو دونوں میں مجھے اچھی
لا۔ میں نے آج اور پانچ دن کے قاعدہ ٹریڈنگ سے بڑے اور میں اس کی

سز کرشنا ہاتھی سنگھ

"ایشیا" کے لئے میری بہترین آرزو میں، قبول کیجئے۔
سز کرشنا ہاتھی سنگھ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

میرے واسطے خدمت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری
ہے کہ حضرت ساغر صاحب میں برگزیدہ نظامی نہیں کہوں گا) "ایشیا"
کو دہ بادہ جادی، اور ایک دارالاشاعت کو قائم کر رہے ہیں۔

ساغر صاحب اس درجہ مشہور، اور اسی کے دوش بدوش اس
قد مقبول و محبوب شاعر ہیں کہ انھیں میرے پاس کے تعارف کی احتیاج
نہیں لیکن ان کی اس خاص صفت سے شاید لوگ زیادہ واقف نہیں
کہ وہ ایک نہایت ضابطہ پسند، خوش سلیقہ ادیب اور متحرک انسان بھی
ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جن حضرات نے ان کے تجویز کلام بادہ
مشرق کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے
کہ جہاں تک کتابوں کی طباعت و اشاعت، اور ان کی زیبائش و
آرائش کا تعلق ہے، ہندوستان کا کوئی صاحب مبلع اور کوئی ناشر ان
کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مارگریڈہ" اور سنگ گزیدہ" کے ساتھ ساتھ
اس بدعت ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک مظلوم طبقہ ہے۔ جسے
"ناشر گزیدہ" کا خطاب دیا جاسکتا ہے۔ میں ان مظلوم ناشر گزیدہ
ہند کو غرور..... سننا تھا کہ اولی مرکز یہی ہیں ساغر صاحب کی زیر
نگرانی۔ "ہند پشتر" کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم کر رہے ہیں جس میں
ان کے تمام حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور ان کی دفعتی پیداوار کی
فراخ دلی و دیانت اور اسی کے ساتھ داد دی اور قدر افزائی کی جائے گی
وہ اسے اپنا ہی دارالاشاعت سمجھیں۔ اور اس سے مستفاد و اربہ
ہو جائیں۔

ساغر صاحب کی طرح "ایشیا" کے باب میں بھی کسی کی فردت
نہیں۔ "ایشیا" میرے جس آب و تاب کے ساتھ نکل چکا ہے، وہ سب کو
معلوم ہے اور میری قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شائع ہوتے ہی
تمام حیرت پر چھا جائے گا۔

جوش

کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے رحمت کر کے مختلف انگریزی اور دواہر ہندی کی مطبوعات کی ایک فہرست بھیجیں۔ تاکہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔

میں آپ کے منصوبہ کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص
ایلس۔ سنہا

مسٹر میک رنہاس میٹرف ملبی

از بمبئی

۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء

ڈیر سٹراٹفونڈا

آپ کا ارسا ریخ کا خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ جو ری سٹراٹفونڈے ادبی مرکز کے تحت اپنا سنا ایشیا کی اشاعت کا ادارہ بند ہے۔ بلکہ کے بارے ہوئے حالات میں، ایشیا کا مستقبل تباہ دار ہے گا۔ اس لئے کہ کچھ اچھا، وترقی اور کچھ نیا بھی جیسے مذہب الامین کے حصول کے لئے توجہ ہیں۔ میں ماننا ہوں کہ پوری ایشیا کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص
میک رنہاس
میٹرف

مسٹر یوسف مہر علی مویشی طلیڈ

کاجیٹا، اٹریٹ، بمبئی ۲۷

۱۲ دسمبر ۱۹۲۷ء

ڈیر سٹراٹفونڈا صاحب

آپ کا خط ملا۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ایشیا کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔ اس کوشش کے لئے بہت لوگ آپ کے ممنون ہوں گے کیوں کہ یہ بہت ہی اہم ہے کہ اردو اور ہندی بڑھنے والے دنیا کے سب سے بڑے براعظم کی زبردست بیواری سے واقف ہوں۔ ایشیا کی آبادی نصف دنیا کی آبادی کے برابر ہے

پروفیسر نجیب اشرف ندی ایم۔ اے

آپ کے ایشیا اور ہائے براعظم ایشیا کا حال یکساں رہا ہے، شاید یہ نام کی برکت یا اثر ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور اس مرتبہ مجھے یقین کا مل ہے کہ وہ نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ ان خوش گوار حالات میں آپ کے ایشیا کا بھی ایک نئی زندگی کے ساتھ ساتھ خیر و برکت و مگر جوئے کا مزدور خوش گوار خلقات کی دنیا سامنے لا دیتا ہے، خدا کرے میرے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوں۔ اس مرتبہ آپ نے جس جوش و آہنگ سے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ کامیابی کی بڑی حد تک ضمانت ہے۔ اس لئے کہ ساغر دہی کا راز ہے اور اس وقت تک کارآمد ہے جب تک کہ وہ گردشا میں ہو۔

آپ کا

نجیب اشرف ندی

ملک راج آنند

دی ڈبر سار صاحب

پیارا نام آپ کے ماہر اور فیاض ترین کامیابی کی آرزو کا حامل ہے۔ چارے ایک تین انہی اور عصر حاضر دونوں کے ادبی اور سچول کام کو پکڑنے سے ہی سہہ کرنا ادھاس کی قدر میں مہم کرنے کی سخت زندگی ہے۔ تینے کیوں کہ اگر ہم بلند ترین آزمائشوں میں مسلسل طور پر چڑھنا نہ ہوں گے تو ہم نے اپنی نشاۃ الثانیہ حاصل کیا ہے۔ اس ترقی کے معیار سے بلند نہ ہوں گے۔ جسے کو دوسری جگہ حاصل کئے جائیکے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی رہنمائی میں بہترین تخلیقی اور تنقیدی تحریریں اس رسالہ میں شائع ہوں گی۔

آپ کا مخلص

ملک راج آنند

کرشن چندر (رکن ادارہ نیا ادب بمبئی)

۲۲ فروری ۱۹۲۹ء

پیارے بھائی صاحب

اس کی مجھے بے حد خوشی ہے کہ ایشیا دوبارہ شائع ہو رہا ہے، اور آپ کی ادارت میں۔ ایک دوسرے آپ واقعی ایشیائی ادب کا ترجمان بنائے گئے۔ اس وقت پورے ایشیا میں عوام انقلاب کا رواج کھٹ کھٹا ہے، اس وقت اگر ہم ادیب لوگ سوئے رہے تو کوئی نہیں اٹھنے کا نہیں۔ عوام سوئے ہوئے کو پاؤں تلے دوںکر آگے بڑھ جائیں گے مجھے امید ہے کہ ایشیا بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے گا۔ لائقوں کے ادب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

کرشن چندر

خواجہ احمد عباس (رکن ادارہ نیا ادب بمبئی)

جس طرح دنیا کے اُن فی برائیاں کا دشمن شاہد امجد ہا ہے اُسی طرح لعین ہے۔ یہاں صاحب کا "ایشیا" بھی آسمانِ مصاف پر چمکے گا۔

"ایشیا" کو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ چلنا ہے۔ اور تمام ترقی پسندوں کو "ایشیا" کا ساتھ دینا ہے۔

احمد عباس

سید ممتاز حسین ایم۔ اے

ساغر نظامی صاحب نے ایک بار پھر ایشیائی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایشیا جس آب و تاب اور نئے پیغام کے ساتھ بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نکالنا گنا تھا اور ہم ایشیا آج پھر کبھی سے نکالا جا رہا ہے۔ ساغر صاحب ایشیا کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس وقت ایشیا میں ایک نئی تبدیلی پا رہی ہے۔ اور یہ تبدیلی ایشیائی زندگی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ آج پورا ایشیا اپنی آزادی کی آخری جنگ لڑ رہا ہے۔ ہمارے ادیب اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایشیا کی زندگی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔ وہ میانہ زندگی کو الٹیک کہتے اور تمام رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کا پیغام ہے۔ یہ خیال ہے کہ ایشیا کا نیا پرچہ نہ صرف

اور اس بل تھے قدمی وسائل دو خانہ ہیں کہ خواب و خیال میں بھی نہیں آتے ہیں۔ اس کے مختلف ملکوں میں سیاسی اور کچھ بیداری کا ایک طوفان برپا ہے اور ہندوستان کو اس طوفان میں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ آپ کا ایشیا منظر مول و درخت کشوں کی جدوجہد اور ان کی امیدوں اور خوابوں کا ترجمان بنے۔

آپ کا مخلص

یوسف ہرمی

مٹرائیس کے پاٹل ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی

کانگریس باؤس بمبئی ۱۹۲۹ء

۲۲ فروری ۱۹۲۹ء

عزیز دوست!

مجھے آپ کا پچھلے ماہ کی تاریخ کا خط مل چکا ہے۔ جب خواہش ایشیا کے لئے مختصر سا پیغام حاضر ہے۔ ہندوستان کی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اوسط ہندوستانی کا لفظ نظر بدل جاتا ہے اور اس لئے کہ ہماری مشکل سے حاصل کی ہوئی آزادی کو قائم ہو۔ ہر اجارہ دار کو ہٹا دینا چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری حکومت کی مدد کرے اور پھر دوسرے ہے کہ ایشیا بھی فرقہ دارانہ اتحاد پر کچھ دل جمعی کرے، وہ اپنی ترقی اور حکومت کے استحکام کے حق میں اپنا جائز حق ادا کرے گا اپنے اپنا کام کیا ہی کئے بغیر بہترین آرزو میں قبول کیجئے۔

آپ کا مخلص

ایس۔ کے۔ پاٹل

مٹرائیس کے۔ اے۔ فنی (رکن جیک کرشن چندر کمیٹی)

ایشیا ایک مدت تک سوئے رہنے کے بعد پھر بیدار ہو رہا ہے جس کی بڑی خوشی ہے۔ ہندوستان کا موجودہ دہائی پسماندگی کے دور میں ایسے مسائل کی بہت ضرورت ہے جو ہمارے ملک کے عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی صحیح طرف سے یہ پہچانی کر سکیں اور انھیں فرقہ دارانہ ذہنیت کے ادوار سے نکال کر عقل و اتحاد کا راستہ دکھلائیں۔ خدا کرے ایشیا کو اپنے تمام مصلحتیں کا سیاسی

حاصل ہو، اور موجودہ دور تا رہی، بلکہ ایک درخشاں ستارہ بن کر
قوم دھک کا رہبر کی کرے۔
آصف نعیمی

اخلاط طالبانوں کے خلاف جلال و جبروت کا مظہر ہو گا بلکہ
نئی زندگی کی جہانی قدروں کا سماجی ہو گا
ممتاز حسین

نواب محمد امین خاں صاحب کراچی ٹیوٹ سمیلٹی
مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ میرے نوجوان دوست
ساغر نظامی صاحب نے ماہ ذی القعدہ کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام
مکمل کر لیا ہے۔ ماہنامہ ایشیا ایک بلند پایہ ادبی رسالہ ہے جس
جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور اس ماہ رسالہ کے متعلق
یہ کہنا بھی ہرگز بے جا نہ ہو گا کہ یہ اردو ادب کا ایک صحافی رسالہ
تھا۔ ادیب و ادبی اس کے بند ہو جانے پر ایک خاص کمی محسوس کرتے
تھے، ساغر نظامی صاحب تحقیقی سادہ رنگ وادوں کے انھوں نے اپنی انتھک
کوششوں سے اس کمی کو پورا کر دیا۔

میری دعا ہے کہ الشرحاتی ماہنامہ ایشیا کو خاطر خواہ طور پر
کاغذ کرے۔ اور یہ رسالہ ادبی دنیا کے لئے مفید معلومات اور
ادبی و ادبی میں اضافہ کا باعث ہو۔

محمد امین خاں
ممبر کراچی ٹیوٹ سمیلٹی
۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

آنریبل نثار احمد خاں شروانی وزیر راعیت پونی
۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ء
ماہنامہ ایشیا، ایک عرصہ کے بعد پھر واپس آیا
ہے یہ بہتر جریدہ ساغر صاحب نظامی کی زیر نگرانی شروانی سے ماہ
بہ ماہ شائع ہو کر اعلیٰ ادب پیش کرتا تھا۔

میں ساغر صاحب سے ایک عرصہ سے واقف ہوں۔ کم عمری میں
ان کو شاعری کا شوق ہوا اور بہت جلد اپنے آپ کو اس نوجوان نے اعلیٰ
دنیا میں روشناس کر لیا۔ آج ہندوستان کا ہر ادب دانہ شخص
ان سے واقف ہے ان کی سیاسی نظیموں کے قلم پر ورنہ
جد بات کی تائید دہ ہوئی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں خراج تحسین

راجندر سنگھ بیدی بی۔ اے
فیس کچنر ٹیوٹ - کینڈل روڈ
مبمبئی

محترم سیّد ساغر صاحب تسلیم
ماہ ایشیا کی تجدید کے متعلق سننا۔ یہ خوشی ہوئی۔
زبان کے سلسلے میں جتنا جھگڑا ہے، اس کا سبب بڑا ضلیم ہے کہ وہ
زبان زیادہ سے زیادہ بولی جائے۔ اور نشر کی جائے۔
مجھے یقین ہے کہ ایشیا "ایسا ماہنامہ" کے مستقبل کی بابت
ہمارے سب شکوک و شبہات دور کرے گا۔ یہ جتنی وسیع ہر قسم کے تعاون
کا یقین دلاتا ہوں۔

نیا زندگی
راجندر سنگھ بیدی
۵ جنوری ۱۹۴۸ء

رامنند ساگر بی۔ اے

"ایشیا" کے دوبارہ اجرا پر میری طرف سے مبارکباد قبول
فرمائیے۔
خدا کے کہ "ایشیا" موجودہ دور میں ایشیا کی آزادی کا
علیٰ وارث ثابت ہو۔ اور مستقبل میں اس کا کافی فائدہ
رامنند ساگر

سیّد شہاب الدین دسنوی

آزادی کے بعد بھی "ایشیا" میں حرکت پیدا نہ ہوئی تو
ہوتا۔ اب ایشیا کے سامنے نئے زاویے اور نئے میدان ہیں۔ باوجود
ادب کے متواتر "ساغر" کی طرف آنکھ کھلے ہیں۔ ادبیات کے
ایسے نچوڑ کی ضرورت ہے جو ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے معیار
ماہنامہ ایشیا فردی طرز پر

کو بدل کے، بیارول و دماغ کی اصلاح کر کے اور مرجھائی ہوئی
روح میں بالیدگی پیدا کر کے۔

مجھے اُمید ہے کہ "ایشیا" یہ خدمت انجام دے سکے گا
سید شہاب الدین و سنوی
برجنوری ۱۹۴۹ء

اختر الامیان

دکن اداؤ ماہنامہ خیال "مبئی
"ایشیا" ان پروجس میں سے ہے۔ جن پر اردو کے ماہناموں
کو ناز ہے۔ ساعر صاحب سمجھ رہے ہیں کہ وہ چرچہ نکال رہے ہیں
میں سمجھ رہا ہوں کہ نبی آگے چلیں گے۔ دم لے کر دلی بات ہے۔
ایشیا نے پہلے بھی اردو کی خدمت کی ہے آج بھی اس
کی وہی نیت ہے۔ مباد کے بارے میں کچھ کہنا لا حاصل ہے۔

(اختر الامیان)
برجنوری ۱۹۴۹ء

قاضی بدر الحسن بدر جلالی بی۔ اے (ملک)

برادر عزیز حضرت ساغر نظامی نے یہ خبر خوش عنایت
فرمائی ہے کہ سادہ ایشیا اپنے نئے سببم و نئے روپ
میں پھر نرب نظر و فکر ہونے والی ہے۔ اگرچہ اطمینان
گھڑماں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں اور آگے نہیں دیدار کئے
گئے مضطرب ہیں۔ پھر بھی فرینک سے جو سرت و سببی
جوئی ہے۔ وہی اپنے عزیز جھائی کی نذر کرتا ہوں۔ ۶
برجنوری ۱۹۴۹ء

ہم ہندوؤں کی امت کے سیاست کا ایک ویشن
اور دلفریب پہلو احویت ایشیا کے حسین خوابوں کی وافی
تعبیر میں نہیں ہے، اس لئے حضرت ساغر کے ایشیا کی
نفاۃ نامیہ "ان آرزوؤں کی تکمیل کو ایک عزیزان
معلوم ہو ماسے جو اتحاد ایشیا کی آفرینش سے وابستہ ہیں۔ ایشیا ایشیا
ہمارے دوق ادب کی ایک رنگین چاہ گاہ ثابت ہوگا اور ہمیں مانگیر

دوسوں کی بھی ہیں۔

ساغر صاحب ایک خوش الحان خوش گوش شاعر کے علاوہ مشہور
ادیب بھی ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف نے ہندوستان کے نوجوان کے
دلوں میں آواز کی ایک نئی روح بھونکائی۔

آج جب کہ ہندوستان آواز دے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ
ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے ایک ایسا ترقی پسند و محنت مند
ادب پیش کیا جائے، جو عوام میں اتحاد و ترقی، یکجہ نکت و تعبیر کی روح
پیدا کرے۔

مجھے اُمید ہے کہ ایشیا ساغر صاحب کی زیر نگرانی و
ادارت ایسا ادب پیش کرے گا۔ ادبی دنیا میں یقیناً اس ماہنامہ
کا غیر عدم کما جائے گا۔

میری دعا ہے کہ ساغر صاحب اپنے مقام میں کامیاب ہوں
نثار احمد شیروانی

پنڈت سندر لال جی (الہ آباد)

بیارے بھائی ساغر صاحب

آپ کا ۱۱ دسمبر کا خط مجھے اب ملا۔ آپ اپنے ماہنامہ
"ایشیا" کو کچھ سے نکالنے جارہے ہیں۔ مبارک !

میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس ماہنامہ کی
فوریہ سبب مذہب کے لوگوں، خاص کر اس ملک کے ہندو
اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک
آویں، فرقہ پرستی بلکہ فرقہ دارانہ نقطہ نگاہ ماحول
سے بچے، ہم سب کے قدم ایک مشترکہ نویت و مشترکہ
کچھ اور مشترکہ سماجی زندگی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں
ہماری یہ بھی خواہش ہے اور درخواست ہے کہ "ایشیا"
کی زبان آسان و جان لی کی اور ہندوستانی ہو۔ مثالی
کے طور پر ہندو سہ سنا میں دیکھ لی جی وکلا جھب دیکھ
یا کیوں ہونی چاہئے۔ ایسے ہی مقصد کی جمع مقاصد نہیں
مقصد یا مقصدوں۔ اردو کو بھی اگر اس ملک میں زندہ ہونا
ہے تو یہی شکل اختیار کرنی ہوگی جسے ہندوستانی بننا ہوگا
ہندی اور اردو کی الگ الگ جانداروں سے ہٹ کر ایک
نئی ملی باری قومی زبان کو دوبارہ دینا اور بڑھانا ہی ہوگا۔

آپ کا بھائی
سندر لال

شیخ محمد عبداللہ وزیر عظیم حکومت ہندوستان

قزاقی ساغر صاحب

تسلیم آپ کے دونوں خطوط، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔
آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے، موجودہ حالات میں وہ بہت بڑا کام ہے۔
ہندوستان کے باشندوں میں بڑی دشمنی شوروں پر لگنا وقت کا سب سے اچھا
تھا۔ غلامی کے دشمنی غلامی نے زیادہ جھلک ہو کر آئی ہے۔ یہ
صحیح ہے کہ ہندوستان نے سال ہا سال کی انتھک کوششوں کو
فراموش کر کے جو جہانی غلامی سے آزادی کو حاصل کر لی ہے، لیکن
انگریز کی سامراجی طاقت نے ہندوستان کی بددلت جہانی طاقت
پر غلام بنایا تھا بلکہ ہندوستان کے ذہن کو بھی غلامی کے
سائے میں ڈھال دیا تھا۔ اور جب تک ہندوستان کے سینے
کھینچنے کے طریقے وہی رہیں گے، جو کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں
انگریز نے ان کو سکھائے تھے، جب تک یہ خیال کہ ہمارا دل
سامراجی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے بہت بڑا دھوکہ ہے۔ ہندوستان
کو یا تو پورے طور پر ہندوستان میں کر لیا جائے کہ جن کے گروہوں کی
وجہ سے ہندوستان انگریزی سامراج کے چنگل میں بٹھاتا تھا، جن کی
وجہ سے ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے، جب تک وہ گروہوں میں موجود
رہیں گی ہندوستان کی آزادی ہی وقت خطرے میں ہے، اس لئے وقت
اگلا ہے کہ ہندوستان کے دیل میں انگریز کے طریقہ اپنی ساری توجہ
مکمل کر کے کیوں کہ وہی طور پر آزاد کرنا، ان کی دیب ہی کا کام ہے، آپ
اس فرض کو انجام دینے میں جوا جوا کی ہے میں اس لئے آپ کو ہتھیلی
سے مبارکباد دیتا ہوں، اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

شیخ محمد عبداللہ

حسن شہید شہروردی

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو ماہنامہ ایشیا کا مقصد
بے زندقہ کر رہے ہیں اس سے نئی نسل انسان کی خدمت ہو سکے اور ہماری
بڑا شوق ہے کہ ان کی تحفہ جلا کر لیں۔ لوگوں کی پس کے اندر الگ جہانی
چارہ اور روانہ کی لڑتی دنیا، ان کے پس کا لالہ آخر کم نہ اور اس بات
کو کرتی دنیا کو لگا کر دوسرے کو بھی طرح طرح کی چیزیں ہیں جن کے بغیر
کام نہ کر سکی ضرورت ہے اور آپ کی کوششوں میں ہر طرح کی کامیابی کے اندر دعا کرتا ہوں

آپ کا مخلص

شہید شہروردی

قیادت کا سبق دے گا۔

”اس دعا میں، راجہ جیانی من باو“

پدر جلالی

قاسمی عبدالغفار مراد آبادی

ہماری نیم ادب میں ایشیا ایک جہدم دیرینہ ہے جو
پچاس برس میں داپس آ رہا ہے اور اس وقت داپس آ رہا ہے جبکہ
اس کی بہت اذیت تھی۔ تقسیم ہند نے وہ سب کچھ تقسیم کر دیا
جیسے عزیز تھا۔ ہماری شہر میں، رشتہ داروں نے، صرف ملک کو،
خانہ نون کو اور دونوں کو۔ تقسیم کر دیا بلکہ میں تو کہتے ہوں کہ
ہندوستان کی انسانیت کو تقسیم کر دیا اور ہمارے ہر جہتی
پر ایک ایسی ہر گاہ کی جو سند ہے ہماری سیاست کی رسوائی پر
اس بددلت تقسیم نے ہماری ادنی تحفوں کو بھی ناس تہرہ برسم کر دیا
کسا ہے دامن باغبان، کف جھلک، خوش کی کوئی پرچہ میں بھی
کہیں نظر نہیں آتی، اس محفل کو بھرا کر سر تو سنوارنا ہے
اور اس دیر نے کو بھرا کر دیکرنا ہے۔ جس گوشہ میں بھی کوئی چراغ
پتہ دامن باقی ہو اسے جلد سے بدل منظر عام پر آجانا چاہئے غلط
سیاست ملکوں اور قوموں کو تہہ نشاہ کر سکتی ہے لیکن دونوں اور
دشمنوں کے آتش خاوں کو سر نہ نہیں کر سکتی۔

آر دو ادب کے تمام حامیوں اور خاندانوں کی بہترین
تمنائیں حضرت سائے کے ساتھ ہیں۔ میرا یام نہت ایشیا ہی
ہے۔ جو اقبال کے ایک مصرعہ میں سوجانا ہے نہ
شکستہ بگریاں کشاے بوجہ گلاب اندھا

محمد عبدالغفار

کھٹنڈو ۳۱ جنوری ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر دوست محمد خاں

اگر آپ ابھی میدان میں نہ آتے تو تار سچ آپ کے
ادنی گناہ کو بھی معاف نہ کرتی۔ میں دل و جان سے ایشیا کا
خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اس کی کامیابی کی ہر ممکن کوشش
کروں گا۔

دوست محمد

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

آنر بیل ڈاکٹر سپہرہ نمانند وزیر تعلیم و محنت

حکومت یو۔ پی
لکھنؤ ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء

یہ فردی ہے کہ ہندوستان کے کلچرل ایتھا دیروہ لوگ
زور دین جن کی رائے اس موضوع پر مستند ہے۔ چار کلچرل ورثہ
بہت شاندار ہے جس میں بیسیوں سوئے مختلف مینوں کے نکل
کر اس میں سمونے گئے ہیں اور جن سے وہ ورثہ سرسبز و نہال
ہوا ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس نے ایک متحکم دھارے
کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے حیات بخش ذرائع مرگ ہندو
تک ہی محدود نہیں ہیں، میری آرزو ہے کہ ایشیا کو اپنی
کویششوں میں کامیابی حاصل ہو۔

سپہرہ نمانند

مولانا حفظ الرحمن

ماہنامہ ایشیا ہندوستان متا زاد اور مؤثر جرائد میں قی
ماہنامہ ہے۔

عمدہ اور مفید ترین مضامین کی اشاعت، بہترین
ترتیب اور طباحت کے اعتبار سے اس ماہنامہ کو اردو کے
اخبارات میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔

میں نے ایشیا کے بعض پرچے جسٹہ جسہ دیکھے ہیں
اس میں شک نہیں کہ ایشیا نے اپنی زندگی میں جو بلند پایہ علمی
اخلاقی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ علم و ادب
کی دنیا میں تدریجی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

میری آرزو ہے کہ ملک کے علمی حلقے ایشیا کی تدریجی
اور آسے ماضی سے زیادہ مستقبل کی کامیابیاں عیب ہوں۔

خادم ملک و ملت

محمّد حفظ الرحمن

۸ جنوری ۱۹۲۹ء

محمّد جالندھری

ساگر جانی

آداب عرض۔ ایشیا کا دنیا جہ مبارک! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ
ایشیا کو اب مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا جا رہا ہے اور آپ نے
ایشیا کی جس پالیسی کا خط میں اظہار کیا ہے امید کہ آپ اسے برقرار
رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

آج کا

محمّد جالندھری

ادیب لکھنؤ بی۔ اے

بلدہری (ضلع مراد آباد)

ارمان تھے جودل میں ان کی تائید ہوئی
زندہ پھر اہل دل کی اُمید ہوئی
پھر علم و ادب کی ہوئی سچی خدمت
صد شکر کہ ایشیا کی بحمدید ہوئی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۹ء

ساگر صاحب محترم۔ آداب

گرامی نامہ صادر ہوا۔ یاد فرمائی اور عزت افزائی کا شکر گزار
ہوں۔ آپ نے خوب کیا کہ ایشیا کے احیاء کا ارادہ کر لیا۔ ایشیا
جب نکلتا تھا تو آپ کے لطف و کرم سے اس کے مصلحہ کا
موقع ملتا تھا۔ میں اس کا جب بھی محنت تھا اور مجھے یقین ہے
کہ آپ کی ادارت میں وہ اب بھی اور مقبول رہے گا۔
کل میں لکھنؤ میں تھا ایک دوست کے بیان شام کی جانے پر
بہت سے نامور اہل قلم مل گئے۔ آپ کے ایشیا کا بھی تذکرہ ایشیا سب نے
بڑی سرکاز اظہار کیا۔ میں سمجھا ہوں کہ ایشیا کی حق میں یہ بڑی مبارک
بات ہے۔ میرے نہ کئے پر میرے سب دوست ہنگامہ مند ہیں۔ کیا انہوں
مشرمندہ ہوتا ہوں اور کچھ کہہ نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہمیشہ صاف فرماتے آئے
ہیں، جب میری خونہ بدلتی ہو تو آپ اپنی دفع کیوں بدلیں۔ یہی آپ
برہم ہوتے رہیں میں بیجا کی پراکتفا ہوں۔ امید کہ آپ سچ اچھوڑ دیں۔

رشید احمد صدیقی

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۲۹ء

طوفان سے پہلے طوفان کے بعد!

ابھی جب ۲۱ نومبر کو بمبئی میں طوفان آیا تو میرے مکان کے پہلو میں جو خانہ درخت تھے وہ بھی گر پڑے۔ مکان سے نیچے آقا تو کھٹا دیسوں پوڑے درخت ریزوں پر گرے پڑے ہیں۔ یہ مجھے روز آتے جاتے بڑے سلیم ہوتے تھے۔ ہینک، بد شکل، نفاست سے محروم، تہذیب کے دروازے سے دھنکارتے ہوئے بے بس گندے انسانوں کی طرح وہ راستوں کی خوبصورتی کے شمس تھے کسی نے کہا شریک گئی جھاڑ سے محروم ہو گئیں کوئی بولا راستے سونے ہو گئے۔ تھکے ہارے انسان درختوں کے سائے میں گھڑی بھردم تو لے لیتے تھے، میدے کہاں کے سائے میں دم لے کر ویریں واہ طے کرنے والوں کے سہارے مٹ ہی جاتے چاہئے تھے۔ ہیں ان جا بد بوڑے درختوں کا سایہ نہیں چاہئے۔ طوفان مبارک ہے کہ اس نے کسی تخلیق کی راہیں کھولیں۔ ہم کھٹے اور پھلے ہوئے عمر رسیدہ درخت نہیں چاہتے۔ ہم تازہ دم نئے پھولنے والے پودے چاہتے ہیں۔ خوشی کا آب و ہوا میں پھلیں پھولیں اور راستوں پر نئی خوبصورتی بکھیر دیں۔ اگر شریک بھی بھٹ جائیں تو بڑی خوشی کی بات تھی۔ مینٹ کی سڑکیں بھگے راہ کھنٹی۔ یہ ڈامر کی کالی کلوٹی سڑکیں اب نگاہوں کو بالکل نہیں بھاتی۔

میرے یہ فقرے بھنے والوں کی نگاہیں نہیں آئے اور وہ طوفان کی تباہ کاریوں کی داستان کہتے رہے۔ میں نے کہا تو سب وقیر لازم و ملزوم ہیں۔ گرے ہوئے درختوں۔ بے ہونے مکانوں اور مٹی ہوئی کشتیاں یا طوفان کی زد میں آئے ہوئے انسانوں کی شمار سے قاعدہ اب گزراں حادثوں پر کنٹرول ہانے سے کیا حاصل کرطوفان کیا ہائے گیا، کیا ڈوب گیا اور زندگی کو کس درجہ تو مہرور کر رکھا گیا۔ اب ہر کسکے ہو تو اپنی دنیا کی نا طاقتی، اپنی قوت مقابلہ کی خامی اور اپنی زندگی کی بے بسی کا اندازہ کرو۔ طوفان کی تباہی کا شکوہ کیوں ہے؟ تھر کے پنم ابرو میں رات اور رات کی پو خیدہ کیفیت

۱۷

طوفان زندگی ہر اک استفادہ سی نظر ہے۔ تخریب کا پیغام تفسیر ہے، ایک مضابطہ ہے۔ ایک نئی قریب ہے تاکہ ہم اپنی زندگی کی خامیوں پر نظر ثانی کر سکیں۔ ۹!

تقسیم ہند

جس طرح سندھوں میں طوفان آتے ہیں، زمین زلزلوں سے متق ہوتی ہے۔ اسی طرح قوموں کی حیثیت میں بھی طوفان آتے ہیں۔ مام طوفانوں کی طرح "تقسیم" بھی ایک طوفان تھی، خوفناک، بھیاناک اور خویش، قدرت کے طوفان غیر شعوری ہوتے ہیں، یہ انسانوں کا شعوری اور اختیار کی طوفان تھا جو تباہی زندگی کی خوشی بہا لے گیا۔ اس کی ہر موج بچائے خود ایک طوفان تھی جس کے پھیڑوں میں تاریخ، مذہب، بچکولے کھاتی رہے گی۔ اس طوفان نے تہذیب و تمدن، سیاست و مذہب اور معاشی جلا و حافی و اخلاقی قدروں کو سبقتور بنا دیا۔ اس کی موجوں نے ہمارے زبان و ادب کی راہی سہی خرموں کو تباہ و لاکر دیا۔ تو یہ

وچیزیں ہیں جن کا ہم شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن بے شمار متاع ایسی ہے جس کی بربادی کا ہمیں اندازہ نہیں۔ اس طوفان کے ایک نہیں ہزار لاکھ پہلو ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد تو اس کے پھر انسانی رنج بھی ہمیں صاف نظر آسکتے ہیں۔

پہلی نظر میں جس پہلو پر نگاہ جمی ہے وہ ہماری قومی جدوجہد کا پہلو ہے۔ اس طوفان نے ہماری قومی تحریک کی خامیوں اور ماضی کی اکثر غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تہذیب و تمدن زبانِ ادب اور جاسے ماضی و حال کے تمام در و زکِ حفاظت کے مدعی تھے۔ ان کے ہر دعویٰ کو باطل کر دیا ہے اور جو لوگ ایک قبیلی تہذیب، متحدہ قومیت، ملکی وحدت اور مشترک وطنیت کے سمار تھے انھوں نے اپنی تحریروں کو اپنے ماضی ہاتھوں طوفان میں غرق کر دیا اور خود نہ جانے کہاں سلیم ستون میں بیٹھے؟ اس بار کا ذکر نہیں، اس بار کے مدد کوئی نظریہ دیکھنے والوں پر تقسیم کے سامنے آنے والے نتجوں نے ثابت کر دیا کہ ان کی راہ غلط تھی انھیں معلوم ہو گیا کہ تقسیم کے بعد وہ ان طریقوں سے اپنے کسی ثقافتی ورثے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جن طریقوں پر ان کو یقین تھا کہ یہ تھا کہ وہ ان کی جدوگاہ نہ قومیت کے جملہ اغیازات کی پوری حفاظت کر سکتے ہیں۔

تقسیم کے وقتی نتیجے

تقسیم کا پہلا نتیجہ تبادلہ آبادی کی تباہ کاریوں کی صورت میں رونما ہوا۔ جس نے باقاعدہ حقیقت واضح کر دی کہ جو تباہی سے کہیں زیادہ انھما اور مشترک کی ضرورت تھی اور انھیں دو سو نو تین ہندوئی انسانیت کی دلدلی بہتری اور رفعت منتر تھی نہ ہندوستان جانے والوں کو اس قدر رنج و قلب لقیب ہوئی اور نہ پاکستان سے ہندو آنے والوں کو اتنا تک چین ملا۔

ان طوفانوں سے بہت کرنے والوں سے برداشتہ وہ اہم سیاسی مسائل تھے جو دونوں حکومتوں کی متحدہ کوششوں کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جیسے جیسے زخم بھر رہے ہیں، ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم نے اسے ہی ناخنوں سے اپنا منہ بوجھا ہے انسانیت کے رنج پریشانی خراشیں ہیں وہ ہمارے ہی پیچھے جنوں کی کاڑھ تیار ہیں لیکن ہم علیحدہ ہونے کے بعد بھی ایک جہت سے ضرورت سے انکار

نہیں کر سکتے۔ ہم ایک خون، ایک جسم، ایک روح ہیں، تقسیم کے بعد جو سب سے عجیب حقیقت سامنے آئی ہے وہ لادیمیت انجیادی ہے جس سے انکار کا نتیجہ تقسیم کی وحدت میں ظاہر ہوا۔!

متحدہ قومیت کا خواب

متحدہ قومیت کا خواب محض خواب نہیں تھا ایک حقیقت تھا جس کی اساس تاریخ میں بہت گہری ہے، اس اساس کو انسانی فلسفے کے بعد لطیفاتی نفس کے مطابق بے معنی و بکا ہے۔ مشرق کی اقوام باوجود برست نہیں وہ مدح کی اہلیاتی گہرائیوں کی حامل ہیں یعنی انسانیت کی ثقافتی اتحاد کی اصل بنیاد ایک الہیاتی تصور ہے۔ جرتسام انسان کی ذراہمب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اسی روحانی رشتے کے پیش نظر تمام مشرقی قومیں ایک ہی قوم تصور ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی مذہب کو مانتی ہیں۔ اگر متحدہ قومیت کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم ہیں تو ان کی دلیل زور نہیں تھی۔ دونوں قومیں روحانی علاقوں اور آسمانی قوتوں کی حامل ہیں اور دونوں ایک خدا کو مانتی ہیں۔

طوفان کیوں آیا؟ ایک وسیع اور اہم سوال ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے تاریخ اور وقت کے پہلوؤں سے سمجھنے والے قدرتی حالات و واقعات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ یوں کہ تاریخی انقلاب بعد جاسے ملک میں بھلائی سامراج کی فوس قدم آئے۔ تاریخ کے ارتعاش عمل کے لحاظ سے منطقی انقلاب نے زندگی میں کسی قدر تبدیلی پیدا کی اور انگریزی حکومت نے ہندوستان میں قدیم جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ اہم ایک زنداں سے نکالے اور دوسرے قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ جس کا محض قدرے۔

کشاہدہ تھا لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کا رد عمل ہندو مسلمانوں پر اس شعور کے ساتھ نہیں ہوا کہ وہ ایک نظام سے آزاد ہو کر دوسرے نظام میں داخل ہو رہے ہیں، پہلا جال زیادہ سخت تھا جسے ارتعاشی عمل نے توڑ دیا ہے اور نیا جال اس کے مقابلے میں کمزور ہے جسے وہ آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔ مگر اس انقلاب کا آخر ہندو مسلمانوں پر حقیقی صورت میں ہوا۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ برائی زنجیروں کی یاد میں کی گئیں، جتنی کھمبیں انھیں وہ تھے والے جانے کے لئے کھین آگے بڑھنے کے لئے نہیں عوام کا ذہن جزوی شعور اور بالآخر نہیں تھا نہ ہوت کی لٹا لٹا نائیر اور اچانک اسلام کے دور میں خباہت نمک

نہیں سکا اور ہمارے سیاسی مفکرین کے پاس (جو خود
 وراثت کی دنیا نو سیاسی قیدوں سے آزاد نہیں تھے) لے دے
 کر صرف ایک نسخہ تھا کہ وہ عوام کو ماضی کے نام پر سیدار کر رہیں
 اس نسخہ کی ایک اجزاء ترکیبی میں سب سے بڑا جزو مذہب
 کا تھا۔ جس کا نام لے کر غلامی کے مختلف عوام کا مورچہ بنایا گیا ہمارے
 سیاسی و اخلاقی طبقوں کی تشخیص ہی غلط تھی۔ انھوں نے مرض
 کی حقیقی علت کو معلوم نہیں کیا جو جاگیر داری سے لے کر سرمایہ داری
 تک عوام کو ملامت میں لگاتی رہی تھی۔ عوام کے مذہبی
 احساس کو مجبور کیا گیا کہ برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑی
 جائیں، برطانوی غلامی کو اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں
 کے اخلاق و اعمال کے زوال کی بنیاد قرار دیا گیا۔ سیاست دانوں
 سے لے کر شاعر اورادیوں تک نے ایک ہی راگ گایا کہ ہمارا یہ نجات
 مسلمانوں کے قرون وسطی کے واپس لانے میں مضمر ہے اور اس مقصد
 کے حاصل کرنے کے لئے برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑ دینا ضروری
 ہے۔ اس طرح مسلم عوام کے ذہن پر یہ چھاپ پڑی کہ آزادی کے
 معنی اسلامی حکومت کے قیام اور ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ہیں۔
 اس طرح ہندو رہنماؤں نے جن خطو پیر ہندو عوام کو جنگ
 کے لئے تیار کیا ان کے ڈانٹے بھی، پراچین تہذیب، ہندو سسکرتی
 اور انہرارسال قبل کی تمام ہندو روایات سے جاملے ہیں اور انہی کے
 احیاء کے وعدوں پر قوم کی مذہبی تربیت کی گئی اس طرح آہستہ آہستہ
 ہندو مسلمانوں کے عکس و عمل میں مسلسل تضاد پیدا ہوتا چلا گیا اور وہ اس
 وقت نمایاں آزادی کی منزل قریب آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تضاد کا پس منظر بہت وسیع ہے
 جس میں ہمیں دوسرے اسباب کی نشان دہانی بھی کرنی چاہیے
 ہمارے ملک میں سراجہ دارانہ نظام کی غامی اور سماجی نقائص سے بھی
 بہ نیکن بہر حال یہ ہمارے سیاسی مفکرین کی اپنی تھی کہ انھوں نے توین
 کے واضح خیال کی بنیاد پر ہندوستان کو عوام کی تربیت نہیں کی۔ اس کے
 اعمال و افکار میں قریب پسنندی کا اتنا ہی جزو تھا کہ وہ آزادی چاہتے
 تھے باقی جہت ہندی ہی جہت ہندی تھی جگہ گادیں، وہ پسن کر رہ گئے جن
 مسلمان اور ہندو عوام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال آلودہ کامیہ منہموم بنایا
 گیا کہ شاہی پھر واپس آ جائے گی اور آزادی کی تیسری مسلم اقتدار قائم ہوگا
 یا تیسری آمدت کا آر پائی اقتدار ہندوؤں کو حاصل ہو جائے گا اور وہ رام
 راج کی برکتوں سے مالا مال ہو جائیں گے ان کے ذہن آزادی کی غیر منفی

توجہ کیوں کر کر سکتے تھے حقیقی آزادی کا مقصد ایک نئے آدرش پر
 پر موقوف نہ ہو جو متحدہ قومیت کی بنیاد پر نئی قوم کی حکمت نمونہ کے مترادف ہو۔

زہر سے زہر کا تریاق

اور ہندو اور مسلمان رہنما گزرتے ہوئے دوسرے غیر برقی
 مذہبی ثقافت کے نام پر عوام کو انگریز سے لڑا رہے تھے اور انگریز
 بھی ان زہریلے فحشوں سے غافل نہیں تھا جو ہمارے سیاسی و اخلاقی
 طبیب غلامی اور حکومتی کے جراثیم کو پھیلانے کے لئے توڑ کر رکھے تھے
 زہر کا انگریز نے اس زہر کا تریاق انھیں کے زہر سے حاصل کیا اس نے
 اس اتحاد کو جو تہذیبی سیاسی شعور کی بنیاد پر پیدا کیا جا رہا تھا
 مذہب ہی کے نام پر ختم کر دیا پلان بنایا۔ اور ان تضادوں کو دھڑلے
 سے استعمال کیا جو قومی تحریک کے اجزاء ترکیبی میں موجود تھے۔ مذہب
 کے جزوی اور ذریعہ اختلافات کے نام پر برطانوی سامراج اور ملک کے
 غداروں نے قومی تحریک کا ہر تکیہ توڑ دیا اور اسے نمایاں کامیابیوں
 لئے ہوئی کہ ہندو مسلم عوام میں آج تک جس جذبہ یکجہاں کیا گیا تھا وہ دین
 دھرم کی غلط تعبیر پر مبنی تھا۔ اس جذبہ کے دو حصارے ایک دوسرے
 کے تحت الشوریات ف سے غافل ہو کر آزادی کے جنوں میں غلامی کی
 آہنی دلدیروں سے لڑا رہے تھے۔ انگریز نے پہلے ان دھاروں کا
 بند باندھا اور پھر انھیں دو مخالف سمتوں میں توڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے
 یہ دھارے بے بناہ سیلاب میں تبدیل ہو گئے اور ملک میں اختلاف
 و فغان کا ایک طاعون برپا ہو گیا۔

ہندو مت اور اسلام کے نام پر ملک میں جواگ لگائی گئی وہ آگ
 کلاہ اور ہشتنگز کے جھڑے لے کر آؤٹ مین کے عہد تک جا رہے
 اخلاق و انسانیت کو کھونٹتی رہی۔

جیسے جیسے انگریز کو طوفان آزادی کی نشوونما اور ہر گری کا
 اندازہ ہوتا گیا وہ نئے نئے بند باندھا گیا اس نے ہندوستان
 کی تاریخ میں تیسری تاریخ کی اس نے فحشیت کے نہروہ احساسات
 کو زندہ کیا اور مشترک قومیت کی داغ بیل کو مٹا دیے کی ہر ممکن کوشش
 کی۔ مادر سیاست کے بطن سے بالآخر فخر پرستی کی فرائی پید
 ہوئی۔ جس نے ہندوستان کو تمام عالم میں دھواں دہند نام کر کے
 چھوڑا۔

غلامی کے خلاف لڑائی میں قوم پرستوں کو وہ تمام مظالم سہنا
 پڑے جو حکومت، بیوروکریسی، فخر پرستی اور دوسرے وطن دشمن

عناصر کی طرف سے ان پر توڑے گئے، اور وہ انگریزی دہلیوی کی طرح کانٹا ہونی لگا۔ نہ بھلا سکے۔ انھیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اتحاد شکن قوتوں کے مقابلے میں کوئی خوری اور متحرک اقدام ان کے بس کا نہیں تھا، وہ کوئی ایسی قریب قریب برسر کار نہ لائے۔ جو سائنٹفک اصولوں پر مذہب زدہ عوام کی ذہنی تربیت کر سکتی یا ان کو مذہب کی مشترک حقیقتوں سے مدد دے سکتا تھا۔

میرے خیال میں جنگ آزادی کا وہ دور جو برطانوی سامراج کے لئے نئے دائرہ کی زندگی میں گزرا۔ ہماری زندگی کی پہلی تہوں میں المناک آثار پتہ کار رہا۔ مذہب زدہ عوام غرضی طور پر کچھ مدت کے لئے سامراج سے ملے، لیکن ان کے ذہن صاف نہیں تھے، متعدد تعمیر و تعمیراتی اور منزل کے آثار بہیم، اور ملکا اصل سبب تھا کہ ہندو مسلم عوام باہمی محبت کی بنیاد پر نہیں مل سکتے، مشترک عقائد کے مقابلے میں نفرت اور بغض کے اوج تک پہنچ گئے تھے۔ اس کمزور بدھ میں کوہا را حریف جب چاہتا کمزور کر دیتا تھا۔ جیسے ہی ملک میں مذہبی تضادوں کے نام پر ایسی تحریکیں اٹھیں، اتحاد نامکمل ہو گیا۔ اور اس سبک کی طرح میں لوگ پہلی طاقتوں اور دشمنوں کی لذت کو بھی بھول گئے، یہاں تک کہ چارسی دہائی زندگی تھی اور کڑوا سٹ کا نام میں گئی۔ مدح و تحریف کہ اس نام میں لیڈروں کا غیر ضروری جوش سبب سے زیادہ نمایاں تھا۔

دلی زبانون کا ادب اور قومی تحریک

اس کے باوجود کہ قومی تحریک میں مثبت اور صحت مند عناصر کی کمی تھی، لیکن اس نے ایک نیم بدھ سیاسی ماحول ضرور پیدا کر دیا۔ جس سے کم دشمن دلی زبانون کا ادب تاثر ہوا۔ ہندی، بنگالی، گجراتی، اردو، پنجابی وغیرہ کے مسابقت میں قومیت کی بنیادوں پر سیاسی تعلقات ہوئے، جو شعور اور انسانیت کا اور دلیب بھی پیدا ہوئے، جو تازہ انقلاب کے ساتھ جینے کی کوشش کرنے لگے، لیکن ان سب کے ادب کا شیر مردوں کی بڑی شہی سے زندہ کاٹ لیا، اور ان کی تخلیقات سے بڑی اور مٹی ہوئی زمینیت جھاگتی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح اردو زبان میں جو قومی ادب پیدا ہوا، اس کے عناصر ترکیبی میں بھی ماضی کی روایات اور مذہبیت پرچی ہوئی تھی

اور یہ عقائد، ماضی، ادب، اندازہ قومیت کے مطابق نہیں تھے، اکثر ادبوں میں شاعروں کا آغاز قوم پرستی سے تھا اور انعام بین اسلام انہم پر ادب کی اس دور میں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذہب کی گہریت میں دوچار سے بہتے رہے، انداز و عبادوں کو ایک کرنے کی کوئی نیا بارگشتہ قومی تحریک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ موبائی زبانوں کے ادب میں تخلیق اختلاں موجود تھا۔ جسے کم از کم شاعر و شاعر کا ہمارے عواموں اور شاعروں نے ملنے کی کوئی حد و حدیں کی اور مذہب کی خاصیت ہی پیدا کر کے جو ہماری کچھ رنگت کا موافق بن جاتی۔ بلکہ اس کے خلاف ہندی اردو کی کشمکش کی ایک طویل داستان بنی ہے جس پر قومی تحریک کے سربراہ اور ادب کے دستخط ہوئے۔ یہاں حالانکہ یہ طویل داستان ہندو اور مسلمان کے درمیان تہذیبی اور لسانی پہلو جو حاصل کرنے کے لئے فوراً دیکھ کر جس میں برطانوی حکمران نے تعین کی تھی، دونوں قوتوں کو اس صحت عملی کے پیچھے چھپی ہوئی اس سازش کو آشکارا کرنا چاہئے تھا، لیکن دونوں زبانوں کے ماننے والے اس سازش کا شکار ہو گئے اور بالآخر ادب و سیاست کی دوری نے زبان کے مسئلہ کو خطرناک صورت دے دی۔ رہبر سیاسی حلقے اس سلسلہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے وہ متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کی تکذیب اور فراق پرستی کی تصدیق کرتے ہیں۔

قومی تحریک کے اندر ڈالنے کے ادب کو اپنے دائرہ عمل سے بالکل خارج کر رکھا، اور اس کی افادیت سے فائدہ اٹھانے سے حیرت انگیز طور پر احتراز کیا۔ اگر ادب کی سب سے پہلی پر آنا ان کی شان کے منافی تھا تو وہ خود ہی کوئی ایسا ادارہ قائم کر سکتے تھے جس کے ذریعہ عوام میں صحت مند سیاسی شعور پیدا کیا جاسکتا، لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

عوامی انقلاب کی بنیاد

ادب سے قومی تحریک کے بانیوں کی روگردانی کوئی سمجھوتہ فرنگداشت نہیں ہے۔ یہ فرنگداشت ہمارے وطن کی بہت سی خوابوں کی ذمہ دار ہے۔ ملک کا مستقبل یوں ہی نہیں بن جاتا، قومیں محض سیاسی دائرے سے نہیں بنا کر تیں، قوم خیر کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب کوئی ناگہانی تخلیق نہیں ہے۔ انقلاب کے لئے دنیا کے ہر ملک میں برسوں ادب کے در وجود و جد کی کمی ہے۔ انقلاب فرانس کی کوئی حادثہ نہیں تھا اور۔ انقلاب دوس کوئی دینی سانحہ تھا۔ اس کے لئے عوامی اعصاب کو بہت چھلے

کے خداؤں نے بندگان ادب سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔
ادب سے کوئی محکم سیاسی و ملکی افادیت پیدا ہوتی تو
کیوں کر ہوتی؟ ۹۱

انجمن ترقی پسند مصنفین

۱۹۳۷ء میں نوجوانوں کے چھوٹے سے گروپ نے ایک
انجمن بنائی اور اس کے مینیسٹرو میں ادب کے نئے مقاصد کی
تئیں و نشر و ترویج کی سیرے خیال میں ادیبوں اور شاعروں کا یہ
نیا تصور تھا کہ ہندو مجریہ ۱۹۳۵ء کی تحریکوں نے پیدا کیا
خبر سے ہندوستانی عوام کی توقعات کے بالکل خلاف
وہ سیاسی آئین ہندوستان کو دیا جو چار برس شریک ادب
اور چار برس ملے بھلے کے لئے زمبر ملا بن گیا۔ ہمیں
سے اور ہندی ادب میں سیاست و ادب کا ایک
شفاف آمیزہ ترکیب یا نئے لگا جس نے ادب کی نئی ندرتوں کی
داغ بیل ڈال دی اور عوام کے ذوق و معیار کو متاثر کر دیا
مذکورہ گروپ۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے صفات صاف اپنے ۲۱

مینیسٹرو میں اعلان کیا:۔۔۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز
تفہیم کو مٹا دیں جس سے خاندان، مہربان، رشتہ، دوستی، سماج کے
باندھ میں رجعت پیدا ہو، جن پرستی کے خیالات کی۔۔۔ تمام کی حاکم
اور اس طرح رجعت و فرقہ پرستی کے خلاف قومی محاذ سے
جھٹ کر ایک نیا سوچ قائم ہو۔

چند ہی برسوں میں یہ تحریک نوجوانوں میں مقبول ہو گیا۔
جو کہ انجمن نے نئے سکھنے اور پڑھنے والے پیدا کئے، ادب
میں نئے موضوعات کا اضافہ کیا۔ ادب کی تکنیک بدل دی اور
نئے تصور کو پروان چڑھانے کے لئے انجمن کو بہت کچھ
بنیادی مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ پڑے سماجی حقوق اور
پرستی تحریک ایک مرتبہ بھی اس لئے آئے تھے لغت کے
ظہانوں سے بھی نمایاں بڑا، چند ہی برسوں میں یہ سب
کچھ ہوا لیکن وسیع پیمانے پر عوام کو متاثر کرنا اس کے بس
کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے یہ تحریک قومی جدوجہد کے
آس موڑ پر معرض وجود میں آئی۔ جب ملک دہلی طور پر
حقوق میں ٹپکا تھا اور عوام فرقہ پرستی کے غلط راستے پر

تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء سے قبل اکثریت کے مفروضہ پر
کرہوں گت جس عوام میں پھیل چکی تھیں، اکثریت کے متعلق
وہی عوام میں جو مضبوط اعتقاد پیدا ہوا وہ اعتقاد سینکڑوں
ادیبوں کی لڑائی کا نتیجہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو
انقلاب نامہ بھی ہو سکتا تھا۔ ۹۱

جس عہد میں ہندی قومی تحریک نے بال و پر نکالے انقلاب
دیں اسی عہد کا واقعہ ہے لیکن تاریخ کے اس عظیم انقلاب سے
ہمارے دہناؤں نے کچھ نہیں سیکھا کسی ایسی اجتماعی ادبی تحریک
کا تصور ان کے دہنوں میں نہ آ سکا جو اس بات کی ذمہ دار
قرار پاتی کہ وہ عوام کے ذہن کو ایک واضح مقصد کے سانچے
میں ڈھال دے گی۔ ۹۱

میرے خیال میں عوامی انقلاب کی کامیابی اسلام
نے کی، دنیا اس سے پہلے عوامی رجحان کی تربیت اور تحریکی
فائل نے تھی اس کامیابی اب تک اس اساس ادب اور فصاحت و بلاغت
کلام پر رکھی گئی۔ سب سے پہلا انقلاب قرآن کریم کی فصاحت
اور بہترین ادبیت کے درجہ پر سرکار لایا گیا اور دنیا کے
اس انمول ادبی ذخیرے نے عرب کی زندگی کے طوابع پر تیز
کی کامیابی دی یعنی قانونِ فطرت تھا، انسانوں کے شوق
زندگی، انقلاب اور کامیابی انقلاب کے لئے ادبی و شعری ہتھیاروں
اور ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی رہی ہے، قرآن نے فصاحت عرب
کو خاموش کر دیا، کہانت کے سحر ساندے ختم ہو گئے، خرافات کی
عربان نگاری دفن کر دی گئی، عقیدہ خواہوں کے فلو اور مخلوق
پرستی کو مٹا کر دیا گیا۔ نئے ادب، نئے انداز بیان نے
حسن فصاحت اور جمالِ بلاغت کی آغوش میں انقلاب پسند
اجتماع کو پروان چڑھایا۔ قدرت کے اسی قانون کے
تحت ہندوستان کے ادب کی مدور انقلاب پیدا ہوئی، وہ
اس کی کو پور کرنے کی ایک کوشش کی گئی جو ہندوستان کی
سیاسی انقلاب کی تحریک میں نمایاں تھی نئی زبان کے متفرق انقلاب
کی بنیاد ادب اور لٹریچر پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ غلامی اور مذہبیت
کی مجبوریوں اور جذباتوں پر!

اردو ہندی کے شاعر نے ماحول کی خود مدد اور
میں جن کی شاعری نے تحریک آزادی کو کافی توجہ بخشی لیکن
سیاسی اداروں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں رہا قومی صحت

چڑھ چکے تھے۔ اور اس صورتِ حال کا موثر عمل مثبت نہیں
منفی ہو رہا تھا۔

سیاست اپنے نئے تجربوں اور اندازِ بیج
میں معروف تھی، ادب کے بے نواؤں کی بات سننے والا کوئی نہ
تھا۔ میر درست ہے کہ بعض رہنماؤں نے انفرادی طور پر
انجمن سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی افادیت کو بھی تسلیم
کیا اس کے باوجود کسی کی تجویز یہ نہ آیا کہ اپنی انقلاب،
سیاسی انقلاب کی بنیاد ہے۔ اس لئے اس تحریک کی
بُست بنائی صانعِ مثبت تاریخ پیدا کرے گی اور اس کے
ذریعہ رجعت و فرقہ پرستی کو ختم کیا جاسکے گا۔

کچھ ہی برسوں میں نئے نظریوں، ادبی سیاسی فضا
حال نے انجمن اور قومی تحریک کے درمیان بھی خطِ فاصل
کھینچ دیا۔ اور اس طرح قومی لیڈر رشتہ نے ادب کو اپنا
کے اس موقع کو بھی کھودیا۔

یہاں تک کہ دو متقابل قوتوں لگ اور کانگریس
کی سیاسی رقابتوں نے ایک نئے المیہ کا آغاز کیا۔ میرے
لئے یہ فترت سی نہیں ہے کہیں بارہ برس کی المیہ کی سیاسی
تاریخ کو دہراؤں نے میرا یہ مقصود ہے کہ میں اگلے پچھلے گناہوں
کا شمار کروں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کا دردِ ناک
انجام کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہے۔ اس انجام کی نشوونما
ہمارے خوش غلطیوں اور سیاست کی بنیادی غامضیوں
کی گود میں ہوا ہے۔ یہ انجام ہندو مسلمان اور سکھ ہر فرقہ
کی نا عاقبت اندیش لیڈر مشابہ اور برطانوی سامراج
کی سفاکانہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔

تقسیم سے برسوں پہلے دہنوں میں دو حکومتوں کا تصور
گھر گرجا تھا۔ ہندو کے دہن میں ہندو راج کا اور مسلمانوں
کے دہن میں حکومتِ اُمید کا، یہ تصور اس غلط تربیت کا نتیجہ
تھا جو دونوں قوتوں کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ اس تربیت
کی بنیاد کوئی بدینی نہیں تھی، لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاسی
دہن کا عدم بلوغ اس کا اصل سبب تھا۔ عوام اور عوام بھلاؤ
کے دہن پرانی ودائیتوں سے آزاد نہیں تھے۔ ان کے دہن
میں بھی قومیت کا تصور صاف نہیں تھا اگر صاف ہوتا تو
تاریخ کی دوسری ہی شکل ہوتی۔

یہاں میں ہندو مسلم کے لیڈر رشتہ کے متعلق احترام
اور بے باک گفتگو کی کے ساتھ دو لفظ کہہ دینا چاہتا ہوں
کہ انہوں نے مصلحِ عظیم کا لباس تو پہن لیا لیکن اصلاح اور
تربیت عام کے سلسلے میں وہ اپنے یقین اور اعتقاد پر اٹل
رہنے کے بجائے عوامی جذبات کی رگوں میں بیٹھ چکے۔ انہوں
نے معبود اور خدا اور ذہنی بنانے کا کبھی غم نہیں کیا وہ تو
صرف دو لڑائیوں اور لڑائیوں کے حصول کے لئے عوام کے لاشعوری جذبات
کو طعن کرنے میں لگے رہے۔ ہمیں رہنماؤں کی اس کہنشاں میں ایک
ہی سب سے زیادہ روشن ستارہ ملا تھا اور اس طرح ملا تھا جس کی
استقامت بالآخر اور مراد بالعدالت نے اس سے آخری اور
سب سے زیادہ قیمتی قربانی تو لے لی مگر اس کو عوامی رگوں میں نہیں
بچنے دیا۔ اس نے اپنی اور دوسروں کی شفاعتوں کو غلط سمجھا
چڑنے سے ممکن طور پر مرد کانین تاریکی بڑھی ہی چلی گئی۔

اگر تحریک آزادی میں مختلف سیاسی رجحان رکھنے والے
قائدین کا دلِ حریفانہ نہ ہوتا اور تمام انقلابی حلقے اپنی متحدہ
قوت سامراج سے مقابلے کے لئے استعمال کرتے تو انگریز کی
حکومت علیٰ ناگہانی جاسکتی تھی۔ یہ غلامی اور سیاسی ذہن کی
ناجستکی تھی کہ انہوں ہی سے شکراؤ کے لئے میدان تیار کیا گیا اور عوام
کے ذہن ان کے حلقوں میں محدود کر دیے گئے وہ اپنے دام سے
آزاد ہو کر ریتا کو نہ دیکھ سکے جو کین گاہ میں بیٹھا ہوا ایک دوسرے
کے خلاف تیر چلنے کے لئے اُٹھا رہا تھا۔

سیاست میں عوام کا رول

یہ سادہ لوحی کچھ ہندوستانی عوام ہی میں نہیں، ہر ملک کے عوام کا رول
سیاسیات میں ایک ہی رہا ہے۔ یعنی آنکھ بند کر کے وعدوں
کے چکر میں آجانا جو بلند آواز سے تریاق کے نام پر ہر فردِ خلقت
کرے اسے سیما بھنجا، جو راستوں کو زیادہ تر بچ جائے اسے اپنا
رہبر خیال کرنا، جو ان کے جذبات کے خرس میں چنگا ریاں جھپا دے
اسی کو اپنا دولت سمجھنا، اور خود اپنی قوت کا احساس کبھی نہ کرنا۔
عوام بھولے ہیں۔ شریف ہیں۔ سادہ لوح ہیں، وہ اپنے دکھ
کی دوا چاہتے ہیں اور جو بھی ان کے دکھ کو دور کرنے کا وعدہ
کرے اسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیتے ہیں۔ ہندو مسلم عوام
دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس سے بڑھ کر سادہ لوحی

اد کیا ہو سکتی ہے کسی۔ پی کے ہندوئی مسلمان اس خیال میں
گمن رہے کہ تقسیم کے بعد ان کی کچھ انفرادیت باقی رہے گی۔!!

تقسیم اور اس کا رد عمل

اور جب یہ طوفان آ کر اتر گیا تو بجائے آنکھیں کھلنے کے
بہیں اوروں کو نظر آنے لگا۔ کئی خزانہ اوروں نے ہمارے
آنکھوں پر پڑے پردے کو الٹ دیا اور یہ غیر قدرتی نہ تھا۔ تقسیم
نے ایشیا کی سیاسیات میں ہندو کو نقصان پہنچایا، تقسیم نے
انسانیت کو تقسیم کر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تقسیم ہمارے سر پر
مٹی یا ہم نے اسے رخصت کر دیا؟ ۹۱

میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا لیکن تقسیم کو اس تربیت
کا منطقی نتیجہ تھی جو ہر حلقے میں مذہب کا سہارا لے کر عوام کو دیتی
گئی اور پھر جب ایک ایسا مرحلہ آ گیا جہاں یہ جھجک کوئی راہ باقی نہیں
رہ گئی تو ہمارے رہنماؤں نے رخصت کر دیا۔ اسے منظور
کر لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام ملک ملک خراب دیکھ رہے تھے اور اپنے
خوابوں کی تعبیر ان تقورات کی روشنی میں چاہتے تھے۔ جن کی انہیں
جیل میں دی گئی تھی۔ مقام کے اختلاف نے ان کے خوابوں میں خوفناک
تفاقی پیدا کر دیا تھا اس لئے اگر ان پر تقسیم کا رد عمل ہوتا تو غیر متوقع
اور غلط نہیں تھا، ہندو عوام ایک متحدہ ملک کا پسند دیکھ رہے
تھے وہ اسلام عوام ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے
جس میں یوں ہی بنگال اور پنجاب سا ہوتا ہو اور جس کا خون ہند
کے مسلم اقلیتی صوبوں کی شریاؤں میں بھی پوری مانگی اور دانی
سے دوڑ رہا ہو۔ ان غریبوں کا کیا قصور تھا؟ ان سے وعدہ ہی
یہ کیا گیا تھا کہ علیحدگی کے معنی تمام ہند میں ان کی جدا گانہ
وحدانیت کے قیام کے ہیں۔ ۹۱

لیکن عوام سے قطع نظر جن رہنماؤں نے تقسیم کو خوشی
منظور کیا وہ بھی اس کے رد عمل سے اپنے ذہن کو محفوظ نہ
رکھ سکے۔ اتنے خوف ناک طوفان کے بعد جس میں انان اور
انسانیت خس و خاشاک کے مانند بہہ گئی۔ دونوں طرف
حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا۔ اپنے غلط اقدامات اور غلطیوں
پر کڑی نظر ڈالنا چاہیے تھا کہ تقسیم کے بعد بھی خند نہیں
بھری گئیں، سوچے نہیں تو نہ ہو گئے۔ بلکہ اس قسم کا طرز عمل
اختیار کیا گیا، گو باجنگ کا یہ اولین مرحلہ ہے! یہ طوفان

کے بعد بھی نئے نئے طوفان آتے رہے اور طوفان ہمارے رہی
سہی خارج انسانیت کو بہا لے جاتا رہا۔

مسلم عوام اور ان کی بے بسی

ادمان طوفانوں میں ہندوئی مسلم عوام کی بے بسی، مایوسی
اور ذہنی انتشار کی کوئی حد نہیں رہی ان کے لئے کئی نئی مشکلیں
پیدا ہو گئیں۔ انہیں راہ بنانے والا تو درکنار کوئی جھٹکانے والا
بھی موجود نہیں رہا۔ انہیں اپنے گناہ سادہ لوحی کی بہت بڑھاپ
اور ان کی بڑھاپ۔ یہاں وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہٹ کر بھی، یہاں
کہ وہ بہت دنوں ان فاسد جذبات سے آزاد نہ ہو سکے
جنہیں وہ بڑھاپ کی دلیل اور منطق کے دلوں میں باقی رکھ کر رہے
تھے۔ اپنی تہائی خانہ خرابی اور سرمایہ کے اسباب و ادب
بھی انہیں سمجھ سکے تھے۔ تقسیم کے نتائج کو وہ ہم وطنوں کے جبر و ظلم
سے تعبیر کرتے رہے۔ لیکن اس حال کے حلقے زیادہ ذہنی مضبوط نہ
رہ سکے۔ حالات اور اس کے اندر بھی ارتقاء نے ان حلقوں کو
جلد ہی بھٹکا دیا، وہ آزاد ہوئے اور اس بوجھ سے بکدوش
ہو گئے جو ان کے احساس کی کڑواہٹ سے دے رہا تھا۔ خارجی اور داخلی ۶۳
احاسات و تاثرات انسان کو کبھی آزاد نہیں چھوڑتے۔ جسے ہی انہیں
اس بار سے بکدوشی حاصل ہوئی ایک نئی کیفیت نے انہیں آگاہ
وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرنے لگے۔ ان غریبوں
نے کبھی اپنے دماغ سے نہیں سوچا تھا اور ان کی گمراہیوں نے
اس تعلق کو ان کی نگاہوں سے مطلق پوشیدہ رکھا تھا جو ان
اپنی مادر وطن سے ہوتا چاہیے تھا۔

یہاں سے ہٹ کر مسلم عوام ان تمام روحانی امور کو
کے رشتے سے کٹ گئے۔ جو صدیوں کے رہن سہن اور
کچھ لادامت کا نتیجہ تھے۔ گناہ سادہ لوحی کی یہ قیمت
کوئی معمولی قیمت نہیں تھی۔ روحانی آسودگی۔ خارجی اور
اور داخلی مزاج کے مسلسل تقاضوں کو ہم پہنچا کا نتیجہ
ہوتی ہے اسے کوئی حادثاتی محبت یا چھٹائی نفرت پیدا نہیں
کر سکتی۔ چنانچہ دونوں طرف تقسیم کے بعد کے احساسات
اس کی کھلی پہلی تصدیق ہیں۔ نہ جانے والوں کو یہ چین ملا
نہیں آئے والوں کو۔

ہندی مسلمانوں کی نئی اجتماعی حیثیت

اجدو جہاں رہ گئے بالآخر اب ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ماں اور ایک خون نے انھیں جنم دیا ہے اور ہندی خاگ ہی سے ان کا ذہنی و ادبی رشتہ ہے۔ ملک تقسیم ہو سکتا ہے مگر روجوں کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں سے ملنا خوں سے کٹ جائیں گے، وہ ان سے اور قریب ہو جائیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ترقی کرنے کے بعد ان کی نئی اجتماعی حیثیت ہوگی اور وہ اپنی عظیم الشان قوم کا ایک ماحر اور مذی قوت حصہ ہوں گے جوہ ۳ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔

اس نئی اجتماعی حیثیت و قوت کا اندازہ کرنا ہندی مسلمانوں کا پہلا کام ہے، بعد از قیاس و تعورات میں اگر کچھ اور وقت برپا دیا گیا تو وہی قوت بھی مزاح ہو جائیگی۔ حالات کے جبر سے تبدیل ہونا یا تبدیل کرنا سب سے بڑی اخلاقی بات ہے، مسلمان جن بلند اصولوں کے ماننے والے ہیں۔ ان اصولوں کی توہین ہے۔ اگر وہ اپنے سینوں میں چھپیں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ایک نئے تزکیہ نفس کی ضرورت انہیں لگا رہی ہے۔ یہ تزکیہ نفس ان کے سر جھانے ہوئے یقین کو از سر نو نشا و اب کردے سکتا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہرجیال سے آزاد ہو جائیں اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

اکثریت کی غلامی

تقریباً ۷۵ ملین لوگوں کا ایک بد مذاق اور حماقتوں کا ایک سیلاب بھی اپنے ساتھ لایا، ان متعدد بد مذاقوں میں سے ایک بد مذاق ہندی مسلمانوں کا یہ احساس بھی ہے کہ وہ اکثریت کے غلام ہو گئے۔ یہ احساس ماضی کے احساس کمتری کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ نیا نہیں پڑنا زخم ہے اور اس وقت تک نہیں بھر سکتا جب تک ان میں روحانی تلبدلی نہ ہو۔ جب تک اس بد وطن سے محبت اور خود اعتمادی کامرہم نہ رکھا جائے۔ یہ مرہم کسی طبیب کے پاس نہیں ہے، کسی رہنما کے پاس

نہیں ہے۔ یہ ہندو مسلمان شعراء اور ادیبوں کے پاس ہے جنہوں نے ہر بزرگ موقع پر قلم اٹھایا ہے اور اب کوئی تازہ تر قوت بخشی ہے اور آج بھی انہیں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کے افراد تعصب سے پاک ہیں، جس میں ہندو، مسلمان، اور سکھ ایک آواز پر کر انانیت کی صدا لگاتے ہیں اور اس پس عوام کی قوتی ہوئی بہت بندھا رہے ہیں، مسلم عوام کے اس زخم کو یہ لوگ ہی بھر سکیں گے جو کمال دھوکے دلوں میں احساس کمتری نے ڈال دیا ہے۔ ملک ایک خطرناک طوفان کو عبور کرنے کے بعد جس دور میں داخل ہوا وہ بھی آندھیلوں کی آماجگاہ تھا۔ نفاذ ہاں بھی صاف نہ تھی یہ دور بھی تقسیم کے رد عمل کا تھنہ نشن تھا۔ جس کی پوری تصویر پیش کرنا اپنے رستے ہوئے ناسوروں سے خود بردہ اٹھانا یہ میں اس المناک تشریح کے لئے تیار نہیں لیکن تقسیم کے ادکاروں کی عمر یانی بہر حال ان لوگوں کے لئے درس عبرت بنی رہے گی۔

اس بار کا تو کہنا ہی کیا۔ اس بار والوں نے توشتوں کو خود توڑا تھا اور ان کا دل ہر شکل کے خلاف لڑے تھے یہی اس بار کی بد مذاقوں کی نہ جانے کتنی آندھیاں چا رہی بلندیوں کو زمین بوس کر گئیں۔ ذنا اور سی کے مطالبات زبان و تمدن کے رحمت پسندانہ انقلابات جدا لگانے و حدانیت کے طعنے اور بد لطافتی تعادیم کے سدا کرنے کے لئے خاموش ہوئے اور ایسے کہنے آواز سے بلند ہوئے جن کی گوج آج تک باقی ہے۔

وفاداری کی روح

اصل میں یہ نفرت و غفٹہ کی آخری قسط تھی جو تقسیم کے کھاتوں سے برآمد کی۔ یہ آواز سے لگانے والے اگر مٹا دیے دل سے غور کرتے تو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ ہند کی مذہبی اور بد لطافتی نیز بیگونی کے باوجود ایک قوم ایسی طبعاً موجود ہے۔ جس کے اندر تاریخی اور وطنی مزینگی ہے جسے بغیر مسلمان ذنا دار دشمنی ہو سکتا ہے اور نہ ہندو اور نہ کوئی دین دھرم والا۔ انہی مختلف اجزا کو کسی ترتیب و تنظیم پر ایک محبت منہذ ہنیت رکھنے والی متحدہ قومیت کا انحصار تھا جو وطن عزیز کی میج و اندھا دار اور محبت ہو سکتی تھی لیکن ذنا دار کا یہ روح کوئی جبر پیدا ہونے والی کیفیت نہیں۔ ذنا دار کا

اس گلدائے طبعی کا نام ہے جسے خلوص و صداقت کا جذبہ انسانی میں پرورش کرتا ہے۔ خلوص و صداقت کی یہ کیفیت ہمایوں کی بے ساختہ محبت اور حکومت کے حسن سلوک سے پیدا ہوتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وطن سے محبت معنی ایک داخلی اور روایتی کیفیت ہے وہ لوگ ان کے اس نفسیاتی زاویے سے ناواقف ہیں کہ کوئی داخلی کیفیت خارج کے اثرات کے بغیر کتنی نہیں ہو سکتی۔ ایک چھوٹی سی مثال غالباً اس کو واضح کر دے گی۔

وافرقت کیجئے اگر کسی ملک میں زندگی دس لکھیں پیدا ہوئیں اور وقت و ماحول کی ہزاروں سالگانہ لہروں کے بعد ان کی داخلی کیفیت (حب الوطن) کبھی عصری حالات سے متاثر نہ ہوگی تو اس نتیجے کی ذمہ داری ان لوگوں کی تداومت پرستی اور ہم شعوریت تھی لیکن کیا یہ وہی نسل کے لئے لازمی نہیں کہ وہ نیا شعور اپنے ساتھ نہ لائے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ جس ملک میں وہ رہتی ہے جس سوسائٹی میں وہ سانس لیتی ہے اور اس کے افراد جس ملک کے شہری ہیں اس ملک کے دوسرے لئے والوں کی حقیقی محبت بھی آئیں نہیں حاصل ہوا نہیں؟ اور ان کا وہ میکانہ دشمن شخص جس سے کسی بل پر وہ زندہ تھی وہ بھی محفوظ ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ روحانی رشتہ جو ان کے اور عقائد وطن کے درمیان داخلیت کا بنیاد پر ہے ٹوٹ جائے گا اور اس کے بعد وہ گریہ و فریاد کے لئے مجبور ہوگی۔ جیسا کہ ہوا۔

ہندی مسلمان اور کلچرل وحدت کا مسئلہ

تعمیم کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو پوزیشن ہوجاتی ہے اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، تعمیم کا سیلاب، جداگانہ انتخاب، جداگانہ حقوق اور دو قومی نظریے کے ہر تعلق کو کہا لے گیا۔ اور اب ان کی واضح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کا ایک موثر اور ذی قدر جزو ہیں۔ فرقہ پرستی اور مذہبی مبالغہ پر اب بیان کسی کو تشریح کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو اس اجتماع میں شریک ہیں اور جو یہاں رہتے ہیں، ان کا ایک جہی مقصود ہے اور ایک ہی منزل ان حقائق کو جاننے ہوئے بھی ایک شور و قیامت مہا ہوگا۔

”مسلمانوں کو چاہئے وہ خود کو الگ نہ دکھائیں اور کلچرل ہندوؤں کے ساتھ شامل ہوجائیں۔“

ادھر یہ مطالبہ، ادھر مرث ایک جذبہ فراہم!۔ مرث ایک خوف زدہ رسیدگار، یہ کلچر اور اس کے منتفی رکھنے والے مصلحتی تفسیر کی ابتداء میں منزلوں میں بڑی قیادت رکھتے ہیں۔ حاکمانہ جبر اور بڑے حاکمانہ استدلال سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ان پر غور کرنے اور نتائج کا نکلنے کے لئے سکون فکر اور قطعاً نہ جدید جہد کی ضرورت ہو کر رہتی ہے۔ انہیں ان مسائل کو انظار الی حالات میں پھینک دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ واضح بھی جو تمام عمر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے رہے تھے دو قومی نظریہ میں اپنے خواب کی تفسیر ڈھونڈنے لگے یہ ہم میں سے بعض کے لاشعور پر ہی تقاضے تھے جنہیں تعمیم کے رد عمل نے ناسودگی طرح ابھار دیا۔

آئیے در اس مسئلہ پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ لوگ کس قدر واقعیت پرست ہیں اور کس قدر جذباتی؟

کلچر کی تعریف

سیاست کی بازی گرنے تفسیروں نے کلچر جیسے سببی لفظ کو مبہم و دھندل کر دیا ہے۔ جس چیز کو کلچر کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

جسمی اور انگریزی زبان میں لفظ کلچر کے معنی ”ترتیب نفس“ کے ہیں اور کلچر کا بنیادی اثر یہ ہے کہ نفس انسانی کو بہت دہلے کرے۔ تاکہ انسان کا داخلی و خارجی شعور و اس طرح ہونے کو کوئی ترکیبی عنصر غیر متوازن نہ رہ جائے۔ نفس انسانی کے ترکیبی و اصلاح اور خارجی اظہار کے جھڑوے اور نظام ہو سکتے ہیں وہ تمام ذرائع و نظام کلچر سے وابستہ اور اس کی تعریف میں داخل ہیں۔

اس میں کسی قوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال، رہن رہیں کے طریق و رسم و رواج، معاشی و سیاسی نظام تمام اخلاقی ادارے۔ متنازع تخلیقی تقاضے جنسی رجحانات، عجائبات، نیز مذہبی و اخلاقی عبادت و ریاضات (مائی متاویجی) اور فنی امتیاز و مصیبت کے امتزاج سے مرتب ہونے والے زندگی کے اجتماعی طور طریق بھی شامل ہیں۔

ہندو مسلم کلچر کی وجہ مشترک

اتنے گونا گوں رنگ اور خطہ طاق ہیں۔ جن سے تمدن کی

کامل تصویر بنتی ہے۔ ہر تمدن کا ایک محمد ہوتا ہے جسے گزرتہ تمدن کی تبدیلی گردش کرنی رہتی ہے۔ الشیاء تبدل کا مرکزی نقطہ جس کے چاروں طرف مشرقی و مغربی تمدن ہمارا اندازہ آج بھی گردش کر رہا ہے وہ دونوں منشیات ہیں جو ”دوح“ اور اس کی زیر نگینوں کی حامل ہیں۔ گویا ہندو اور مسلمانوں میں سب سے بڑی وجہ مشترک ”دوح“ سے ملتی ہے۔ اندر یہ دوح مشترک تقسیم کے بعد بھی فنا نہیں ہوئی ہے۔ نہ صرف ہند کے مسلمان بلکہ پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا کلچر بھی ایک ہے۔

ملاحظہ فرمائیے پاکستان کا کلچر از عبدالواحد جادو یا ”ہم میں سے“ ۹۰ فیصدی ہندو آبادی وید اور ویدکا اطلال ہیں علامہ اقبال کو تو اپنے ہمین نسل ہند نے پرفصل کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم پاکستانیوں ہی کے آباؤ اجداد اربعین کلچر کے جنم داتا تھے۔ جگہ دارالعلوم کے راج تھے انگریز تہذیبیں اسباب کے مہار تھے۔ گندم چمکتی برفن کے ننگا رہتے اور اگر وہ نہیں تھے تو کسی عرب یا جاپانی ان کے جنم داتا تھے؟“

یاد ہے کہ ہمارے کارناموں نے تاریخ عالم میں شہرہ آفاق امتیاز حاصل کیا ہے مگر ہمیں یہی کہ آج کل ان کے وارث بننے سے انکار کرتے رہے اور وہ جن اس لئے کہ یہ سب کچھ ہم نے زمانہ ماقبل اسلام میں حاصل کیا تھا لیکن مغربیوں نے اسرار سے انکار کیا ہے؟ مذہب وراثتوں نے عقل و ذرات کی قدیم تہذیب کے دھند سے۔ ایرانیوں نے تو اہرن دیندان، تنگ کو اسلام کا دشیطان و خدا بنا لیا ہے۔ اور خود کو نبی اسلام کے بعد بھی کہہ کا نام کہہ ہی رہے دیا اور مغرب کو عجیب کہنا بھی ترک نہ کیا۔ لیکن یہ علم کیوں ہم ہی نے اپنے آپ کو اسلام کا ”صدقہ“ بنا کر اپنی ہزار ہا سال کے مائے ناز ماضی و تحقیقی ورثہ کو ہار یا ترک کر دیا ہے۔ اگر اسلام کا کلچر انتہائی ہی ہے جو میں سمجھا ہوں کہ نہیں ہے۔ تو قطعاً۔ کلچر کیا ہے؟ اسے سمجھنی ہوں گے۔ اسی بزم جہاں ہر کامہ خالی ہو۔ ۹۱ اب دقت آگیا ہے کہ غلط تاریخ کے پس منظر پر تہذیب سے ہم چٹکا رہا ہیں اور اپنی شکرانی ہوئی تاریخ کو

جو دیگر اقوام کے لئے باعث ہزاروںک رہ چکی ہے اور جس کے تخلیقی کارنامے آج بھی تاریخ عالم کا سہری باب ہیں پھر اپنے سینے سے لگا لیں۔

جو قوم اپنے قدیم ماضی کے تسلسل اور اس کے ساتھ اپنے احساس فکر کو کچھ مشتقی ہے وہ قوم اپنے مستقبل کے یقین اور اس کے اعتماد کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

تو گویا کلچر کی ایک اور بنیادی قدیم بھٹی کو قطع نظر اس سے کہ فلاں یا فلاں تاریخی دور کے کارنامے کس مذہب کا کلچر ہے وہ کہہ سرائیام دے گئے۔ ہر کلچر کی وحدت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے قیام ماضی سے ذہنی تسلسل قائم کرے اور حشائے اپنائے ورنہ کلچر میں چمکتی پیدائشیں ہر سکتی انداز کی ارتقائی نوعیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی جداگانہ وحدت

اگر اندر مسلمانوں کے کلچر کی ایک علیحدہ جزئی شکل بھی ہے اور وہ اس سے روحانی طور پر وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو ایک لادینی جمہوری ریاست میں انہیں اس کی آزادی اسی طرح ملنی چاہئے جس طرح عیسائیوں، مسیحیوں، اور دوسری ہندوستانی اقلیتوں کو مل سکتی ہے۔ ہر چند کہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی الگ تہذیبی زندگی ہے یا ہونی چاہئے۔ اس مسئلہ پر میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کونسا آدرش ہے جس کے سانچے میں ہم ایک تازہ دم قومیت ڈھال سکتے ہیں اور اس کے لئے کس قسم کے قدیم جدید عناصر ان کی ضرورت ہے۔

”کلچر“ کی بحث اگر ہمیں ایک محدود دہشتہ تو درست تھا لیکن بعض گمنام زبان..... کلچر کی بنیاد قرار دیر ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ ”دور و زمانہ کی بنا پر مسلمان خود کو جداگانہ ذہنیت“ سمجھتے تھے ہیں مسلمانوں کو پہلا کام یہ کرنا ہو گا کہ وہ اردو سے الفت کرنی چھوڑ دیں اور، آگے چل کر انہیں صاحب نے فرمایا

(۲۱) ”اردو زبان ہندو مسلمانوں میں رابطہ و خیال کے تبادل میں ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے۔“ اسی ذیل میں انھوں نے چین کی لسانی وحدت کا تذکرہ کیا تھا جس کا مقصود یہ

تھا کہ چین کے مسلمانوں کی زبان چینی ہے۔ اسی طرح ہندی مسلمانوں کی زبان اگر ہندی ہے تو غلط نہیں ہے۔ (۳۲) کتب ان یمنین باتوں کے ذیل میں اخصار کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر اجتماعی نقطہ نظر سے یہ غور کریں کہ اس باب میں عام رائے کیا ہے۔ مسلمان کیا جانتے ہیں؟ اور اردو کی وضع پوزیشن کیا ہے۔ ۲۶ برس سے کالجس کا کیا سوچ رہا ہے اور اب ہند کی جمہوری دستور ساز اسمبلی کو اس باب میں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

(۱) چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ وحدانیت کا سوال ہے اس کا تصور ہی غلط ہے اور اگر یہ کوئی جداگانہ وحدانیت ہے تو اس میں صرف مسلمان ہی نہیں، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی اور دوسری قومیں بھی شامل ہیں جو اردو زبان بولتی اور لکھتی ہیں۔ اس میں ہر قوم کے جہازی اور مل مزدور بھی شریک ہیں اور جہاں جاکندھی اور سرخ بہادر سپر و مرچ بھی اس میں تاراجند بھی شامل ہیں اور جہاں لالہ بی بی بھی۔ اودھ تمام ہندو مسلم سکھ پارسی اور دوسری قوموں کے عوام بھی جو صوبہ جاتی زبانوں کے ساتھ اردو زبان بولتے ہیں۔

(۲) متحدہ قومیت کا تصور محض سیاست نے پیدا نہیں کیا۔ اس کی داغ بیل اسی وقت چڑھ گئی تھی جب مسلمان ہند میں آئے اور ان کی کئی نسلوں کا خمیر ہریان کی مقدس مٹی سے گنبد بنے لگا۔ ایرانی اور ہندی فنِ تعمیر کے میل نے ایک نئے حسن کو آجا کر کیا۔ ایرانی معنوی اور مسیحی نے ہندی چتر کاری اور سائنس کے گلے میں پائیں ڈالیں اور ایرانی گلے بولے اجنبی کی نقاشی سے بنگلہ ہوئے۔ اس بلن کا حسین و جمیل مظہر ہونچل ہے۔ یہ ہندوئیسم آئینگی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آریئل ایرائیوں کو جو نسلِ اقلیت آریہ ورت اور اس کے کچلے سے تھا وہ ایک نئے حسن کی تخلیق کا سبب بنا۔

اودھ گھلاؤ اور یہ ملاؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے نسلی زبان بھی بھلا دی اور ایک نئی زبان کو قبول کر لیا جو نسلی اشتراک و اتحاد کے امتزاجی عمل سے جدا ہوئی اور دواس عظیم لٹن اجتماع کے قدرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ تقریباً سڑے تین سو برس کے عرصہ میں اپنی نظری جاذبیت و قبولیت نے اسے ہندو مسلم عوام کی زبان بنا دیا جو

لسانیات کے اہل جانتے ہیں کہ اردو زبان میں ہندوئی سنسکرت کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور یہ تمام ہندوستان میں کسی کی شکل میں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اودھ کو کھٹیا ہندی، ہندوستانی کھٹیا اور کوئی چوتھا نام رکھ لیجئے۔ لیکن یہی ایک ایسا رشتہ اکادہ ہے جو ساری قوموں کو ملاتا ہے۔ اور جسے آپ ملک کی قومی زبان بنا سکتے ہیں۔

اردو صرف بولی نہیں ہے۔ جسے نظر انداز کیا جاسکے اور کوئی بنیاد پر خود کو مسلمان جداگانہ وحدانیت کا تصور کرنے کا گناہ بھی نہیں کر سکتے۔ اردو ادب کی قدیم دھریہ تاریخ ہندو الفاظ پر داندوں، افسانہ نگاروں، افسانہ نگاروں کی ذہنی اور دماغی کاوش سے شاد رہتی ہے۔ دینی ناقہ مرثا، نیم اور حکایت جیسے عظیم الشان شاعر۔

..... اردو نے پیدا کئے اور میں اس وقت جب اس کی کشتی گرداب میں ہے، اس کے ناخدا اور گھوڑی سہلے قرآن ہیں آئندہ نرا بن لگا۔ کرشن چندر و شاعر مرزا علی اور پندرنا صاحب راجندر سنگھ بیدی۔ رامانند ساگر اور چندر اعلیٰ ہندو سکھ مسلمان شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو زبان کا ایک ترقی پسند ادبی ادب ہے اقبال اور جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر اور ابوالکلام آزاد جیسے حکم و ادیب اس نے پیدا کئے ہیں۔

اس کی بزم میں سیاسی تشنگی کی گناہ اور تہذیبی امتیاز پاپ ہے۔ اس کے آسمان پر جو ستارے چمک رہے ہیں ان سے انسانیت متوجہ ہے۔ اور ان کے دل انسانی وحدت کی جوت سے روشن ہیں۔

اردو سے ترکِ محبت کا مطالبہ کب تہذیبی جبر ہے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسے ہمارا شاعر، تجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ان کے زبان و ادب کے ساتھ محبت کرنے سے روکا جائے۔ ان سے کہہ جائے کہ وہ ہنگو، نذر اللہ اسلام، سنگ چٹری اور شہر فرور اور شاہی جیسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے دل سے فراموش کر دیں!

(۳) اردو کو آہنی دیوار کہنا بھی نامرغی طور غلط ہے، ایک گھلا ہوا ظلم ہے، اردو زبان نے فرقہ پرستی کے ہمارے کو کاٹ کر متحدہ قومیت کا ایک گنگا جہنی سنگ بنایا اور تمام صوبوں کے عوام کو ایک نئی بولی کی لڑیوں میں چھو دیا ہے۔ اردو نے شہباز اور فرقہ داری کے دیروزی کی حمایت کو چاک کرنے میں نمایاں امداد کی ہے اس کی محبت سے دست بردار ہونے کی دستاویز لکھو نا

ہرگز وطن دوستی نہیں۔

لسانی وحدت اور قومیت متحدہ

(۳) چین کا لسانی وحدت کی مثال ہندوستان پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے، وہ کئی ہندوستانی اور متعدد مذاہب کا سرچشمہ ہے۔ جہہ یک سا نہ ہزار پرہہ ہر جس سے لاکھوں نئے بھوتے ہیں۔ وہ ایک لازوال نمٹہ ہے جس میں سینکڑوں نے باہم دگر مل کر ایک مخصوص رمیز زبردیم پیدا کرتی ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اردو ایک ایسی وسیع و مشرک زبان ہے جو ملک کے ہر قریب و بعید حصے میں عوام کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی دہلی میں بولی جاتی ہے یہی مشرقی پنجاب میں اور اسی زبان کا دائرہ آخر مغربی و مشرقی پنجاب سندھ و سرحد، بولی و دیار اور سی و پی اور بہار و برکن کو گھیرے ہوئے ہے۔

بمقابلہ اردو اس اور بھی بچی اردو سے اثر لے نہیں رہی ہے بھئی ایک بین الاقوامی شہر ہے لیکن دہلی اور کھنڈ کے بعد آج اسے اردو کا مرکز کہنا جا سکتا ہے۔

ان مقامات پر اردو صرف بولی ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان مقامات پر اس نے اپنا تخلیقی پرتو ڈالا ہے ملک کے ان حصوں نے اردو زبان کے بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں۔ اور یہاں سے اردو کے سینکڑوں انجارات و رسائل شائع ہوتے ہیں بھئی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عظیم الشان چابنگ ادب میں جہاں سے بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور جن کے مالک ہندو ہیں۔ اردو کی وسعت اور دلکشی و تازہ کاری کا ثبوت وہ مسلمان ہندو اور سکھ ادیب و شاعر ہیں جن کی تہذیبی اور روحانی کاوشوں نے قومی تہذیب میں سیاست دانوں سے بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ صرف بھئی شہر بلکہ گجرات کا دینچ علاقہ اردو شعور اور ادب کا میدان عمل رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اردو کی قوت جاوید

اردو زبان میں بڑبڑائی اور جذب کرنے کی ایک ایسی قوت ہے ہر اچھے شعر کو اپنے وجود میں سمیٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں

گھلے ہوئے نغمہ کی سنسکرت کے شدید بھی سنسکرت کے لفظ نہیں معلوم ہوتے۔ سامراج، مہراج، اندوکن سنسکرتی لگتی جاگرتی اردو سیوں نے الفاظ آج اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ دلکش خصوصیات اور فطری اہلیتیں ہیں جن پر ترقی یافتہ سرشار اور عجبیت لوٹ ہوئے اور شاخ ہند و شجر اور ادب اور ایک پوری نسل کے نام اس کی فرست میں نظر آتے ہیں۔ مختصر میں گورداس کی روشنی میں یہ خود گزنا چاہئے کہ آج کل تمام ترقی پسند ہندو گزرا نے اردو ہی کو کیوں اپنے خیالات و محوسات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔؟

سیاسی جدوجہد کا انتہائی کلچر

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تمام تر سیاسی جدوجہد جس میں اقتصادی اور عملی بھی شامل ہے، کا انتہائی کلچر ہے سیاست تہذیب کا ایک شعبہ ہے جس کی سیاسی تہذیب کی حفاظت و ترقی پر منتج ہوتی ہیں۔ سیاسی مسائل کو کبھی تہذیبی مسائل پر اہمیت نہیں دی جاتی۔

آزادی تو دنیا کے بعض حصوں میں غیر تہذیبی قابل کو بھی حاصل ہے مگر آزادی ہی جس آزادی کا حامل نہیں، آزادی کا مقصد کچھ اور رکھتا ہے۔ سیاسی جدوجہد کے پڑاؤ معائنہ پیدا نہیں کوئے کرنے کے بعد اب ہر کچھ کی جنت لسانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ تہذیب کی اس ہیئت کو ہندو جنت اور مسلم جنت بنانے کا گناہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارا شامہ اقبال اب تاریخی کے جال سے آزاد ہو رہا ہے۔ اس کی انرجی سنسار پر بڑھ رہی ہے۔ دنیا جا رہے ایک ایک نئی کو بڑھ رہی ہے، اور انشا کی یلوس و مجبور نگاہیں ہر طرف آٹھ رہی ہیں ہمارے ذہن سے کہیں آس آدرشیں نظر نہیں جو ثقافتی اور ادبی اور ترقی پسندی سے مرگ کر گئی تھیں۔ اصل نے جو امانت ہمارے سپرد کی ہے میں اسے زمانے کی حاسدانہ نگاہوں سے بھی بچانا ہے اور اپنی تنگ نظریوں سے بھی۔ اور کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ آج کے ہندو مسلمانوں کا کلمہ ایک ہے۔ زبان ایک ہے وطن ایک ہے اور وطن کے دفاع کی منزل بھی ایک ہے۔ اگرچہ تاریخ نے مختلف تہذیبوں کے دھارے لگا کر ایک دھارا بنا دیا ہے۔ اس سے

جراثیم پھوٹتی ہیں ان کے بہاؤ کے کچھ منفرد رخ بھی ہیں ان
منفرد رخوں کے مند باندھنا ترقی اور تخلیق کو روکنا ہے۔ نئی نئی
قومی منفرد طبع کی خصوصیات کو بہر ترک کرانے کا ظلم بھی اصل
جو مجربہ تبدیلی مذہب ہی کے خاندان سے ملحق رکھنا ہے۔

صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ان کے ادب کی ترقی
میں تو ہرگز راندو ہی نہیں، صوبہ جاتی زبانوں کی بقا
اور ترقی کا بھی قائل ہوں۔ ہمارے ملک کی جتنی تہذیبی
خصوصیات ہیں ان کے بننے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔
جگالی، سرہئی، گجراتی، تامل، تلیگو، ملیالم، کڑیڑی وغیرہ اپنی
مستقل شاعری و ادب رکھتی ہیں۔ اور انہیں نہیں مٹا یا جکتا
تو اردو زبان جو سنسکرت پر مبنی ہے اسے کیوں کر مٹا یا جکتا ہے

ایک نئی تحریک

ڈاکٹر کاٹھو کر رنر منہل بگال نے اپنی ایک تازہ تقریریں
قومی زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے اس عقیدہ
کو ہر لاپاہے کو قومی زبان سنسکرت ہونی چاہئے۔

”علاقوں کی تمام زبانوں کا سرچشمہ مختلف حد
تک اور بعض کا بڑی حد تک سنسکرت ہی ہے میری
رائے میں پونیو ریشیوں میں سنسکرت کی تعلیم سے
ن صرف علاقائی زبانوں کو بے حد ترقی اور
وسعت حاصل ہوگی بلکہ ایک ایچے ہوئے مسئلہ کا
ایک منفقہ حل بھی اچھی طرح مل جائے گا۔

مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں
میں سنسکرت کی تعلیم کو وسعت دینے کے لئے
کل ہند میاں بے برسجدگی سے کوشش کریں تو
مختلف علاقائی زبانوں پر سنسکرت کا اثر
اس قدر غالب ہو جائیگا کہ بطور غدی ہی ایک
قومی زبان پیدا ہو جائے گی جس پر بحث ہونے
ہندسی اور خاص کر اردو کی طرف اشارہ ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب ہر شعبے میں علاقائی زبانوں
کے حق میں جدوجہد کی بات ہو کر رہے ہیں یہ امید مبہوم
ہے کہ کسی ایک علاقہ کی زبان کو ہندوستان کی

قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا۔

(خطبہ مملکت ہندوستان انڈیا گورنمنٹ، ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء)

تاریخ ہندی کی طرف جہت نہیں لگا سکتی

یہ ایک نئی صدا ہے اور واحد ہے لیکن اکثریت کے تہذیب
پرست حلقوں کے لاشعوری تقاضوں کو ضرور سمجھاتی ہے۔
یہ ایسی صدا ہے جو ان ترقی پذیر اور پیشوں کی بلند فوٹی سے ملتی
ہے جو صدیوں کی جاں فشانیوں کا نتیجہ ہیں یہ خیال ہمارے تمام
ستھہ نظام ہائے عمل کو مغروسادہ بنادیتا اور تعصبات کو اور بھی
مہم و مجیدہ کر دیتا ہے جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ ماضی ترقی
کا شاہکار ہے جس کی فکر ہمارے ترقی پسند حال اور ترقی سے
آنے والے مستقبل کے تصور کے لیے نہیں ہے۔

سنسکرت جو علماء اور پیشواؤں کی زبان رہی بھی برہمن
ہند میں حوام کی زبان نہ بنی، آج اس کے قومی زبان بننے سے
کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟ علاقائی زبانوں میں اس کے خستہ عناصر
ہیں ان کی ہیئت مختلف ہو چکی ہے اور تمام علاقائی زبانیں سنسکرت
پر مبنی ہی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ مکمل کے بعد کی طالع سنسکرت میں
تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں ان کو ملادینا مقصود ہے تو یہ ایک
جد کا نہ بات ہے۔

موجودہ ارتقاء دور میں جب سماج اپنے قومی دائرہ کو
توڑ کر بین الاقوامی حدود تک وسیع ہو رہا ہے۔ برائی تہذیب
کے خول پھول چکے ہیں اور ایک نئی عالمگیر تہذیب کے خوبصورت
چہرے ڈھل رہے ہیں، ہندوستان کو رجسہ کے اختیار کر کے
میں نقصان رہے گا۔ اس کی پہلی ضرورت ارتقاء سے ہم پیش
رہنا ہے۔ ماضی تو ماضی وہ اپنے پایہ رکاب حال پر بھی قیامت
نہیں کر سکتا۔

یہ ارتقاء تقاضوں کے خلاف ہو گا کہ لا ہزار سال
کی قدیم یا چند سو برس کی پرانی تہذیبوں کا احیا کر لیا جائے
سج ہو مجھے تو یہ انداز نہ کریں غلط ہے اگر ہندوستان
و پاکستان کے جالیس کر دڑ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر اپنی
تمام کوششوں کو بروئے کار لے آئیں تب بھی جو تاریخ
بننے والی ہے ماضی کی طرف جہت نہیں لگا سکتی۔

قانون کے خلاف وجہ اور نظر ثانی کرنی چاہیے اور اس پر توجہ کی بنیادی اینٹ ہی درست کرنا ہوگا۔

تیسری بنیادی اینٹ

تیسری قانون کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ قانون پر عوام کا مضبوط اعتقاد ہو۔ اور یہ اعتقاد قانون کے دہلے سے سید نہیں کیا جاسکتا۔ وہ قانون بنانے اور قانون کا نفاذ کرنے والے پر برقرار ہے جو ہر آدمی کے اس احساس سے پیدا ہوگا کہ عوام ان کے لئے نہیں، وہ عوام کے لئے ہیں، قانون کے لئے عوام نہیں، عوام کیلئے قانون ہے۔ انہیں عوام میں اس طرح متنازع نہیں ہونا چاہئے کہ وہ حاکم ہیں، اس طرح نمایاں ہونا چاہئے کہ وہ عوام کی خدمت میں راجت اور نیکوئی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں کے لافلافہ شے ہوں گے اور ہر شے میں قانون کی مخالفت قانون سے نہیں اس اعتقاد کے ذریعہ کرنی ہوگی جو عوام کے داخلی دماغ پر ہر قول کا نتیجہ ہو۔ نتیجہ اسی وقت برآمد ہو سکتا ہے جب کسی ملک کے جمہور کا ادارے اخلاقی منہمک کے خلاف بھی ادا کریں۔ اور ان ذمہ داریوں سے محفوظ ہیں جو انہیں ان قدر کے دام میں جکڑ سکتی ہیں۔

ایک ایک گوشہ میں انہیں بے مغوری اور جھجک کے جراثیم ملاک کرنے کے لئے علم کا آماج گاہ بنانا چاہئے گا۔ انسانیت کا داخلی دفاع داری، حتیٰ چھائی، عوام و حکومت کے تعلقات، شہریت کے فرائض، مذہب، مختلف فرقوں کے باہمی ربط و تعلق، فرقہ پرستی، غلط مذہبیت، ذہنی غلامی، رسوم پرستی، جہل و نادانی، فسادری تمدنی اقدار کا خلاف، تحفظ تبدیلی اور ترقی، اندامی قسم کے دوسرے مسائل کا حل ممکن قانون کی گہر میں نہیں، اعتقاد کی گہرائی میں ہے۔ شدید ہنگامی ضرورتوں سے قطع نظر میرے نزدیک فرقہ پرستی اور ایسی ہی خطرناک تحریکوں کو پولس اور فوج کے ذریعہ دبا جائیگا کیونکہ ایک عامی و سطحی طریقہ ہے۔ قانون کے ذریعہ سیاسی و سماجی بیماریاں جڑ سے دوڑ نہیں ہو سکتیں جب تک ان کے شانے کو کشش قانون کی حدود سے باہر بھیجا جائے۔ جب تک فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو تعلیم نہ دیا جائے تاہم اور مذہب کا صحیح فہم نہ کر کے انہیں فرقہ پرستی کی سمیت سے واقف نہ کر دیا جائے۔ اس کا نہ نہیں مر سکتا۔

قانون گرہ عوام کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال سکتا ہے

لیکن ان کے غلط اور بگاڑنے افعال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قانون مزاد دیتا ہے۔ اصلاح نہیں کرتا۔

شکلی تحریک یا اسی قسم کی دوسری تحریکی تحریکات کو موثر اور پائیدار ادب کے ذریعہ عوام کے ذہنوں سے نکالنا ہوگا۔ اسی طرح میری آرزو ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ان کی حکومت کے درمیان کے قانون کی ذات ہٹ جائے۔ اور اس کی جگہ اعتقاد دے لے۔

اس حقیقت کو کہ کبھی غلامی نہ کرنا چاہئے کہ حاکم نہ غرور اور دہریہ پنڈل، حکومت اور بے جا رگی سے پیدا ہوتا ہے۔ جمہوری ملک کے عوام نہ محکوم ہوتے ہیں اور نہ بے جا۔ یہ حکومت گراؤ اور قانون ساز ہوتے ہیں۔ جب قانون کا جادو ان پر نہ چلے گا ان کے تو قومی اور وطنی اعتقاد کو تباہ کرنا ہوگا۔ ورنہ برائے اور نئے حاکم میں کیا امتیاز ہے گا۔ اصل میں یہ تصور ہی غلط ہے کہ پرائے باغی بام عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ تصور نہ صرف قاتل ہے اور ان کی عمر بھر کی قربانیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

تاہم تاریخ میں باغی کی جاذبیت اسی وقت قائم رہ سکی ہے جبکہ باغی نے حاکم جو کہ تیسری سائل سے مستحق اپنا باغی نہ لایا۔ نگاہ باقی رکھا ہے۔ کہہ کر باغی محض حاکم بننے کے لئے باغی نہیں ہوتا، وہ تو پورے نظام سے بغاوت کرتا ہے اور جب تک پورا نظام نہ تبدیل ہو جائے وہ باغی ہی رہتا ہے۔ اور بلاشبہ جب تک سرسودہ و کونہ نظام کی جگہ نیا اور نیا نظام نہ ملے اسے باغی ہی رہنا چاہئے۔

اگر اس نے نئی جنیت سے پیدا شدہ مخالف کی جھوٹک میں اپنی باغیانہ جاذبیت کو خیر باد کہہ دیا تو پھر اس کی ذات میں وہ کیا جائے گا۔ باغی دہرے چلائے دالے تو انہوں نے انہوں میں پیدا ہوتے ہی رہے ہیں لیکن باغی کی تحریکی غلط میں بناؤ گا جو جذبہ پریشیدہ ہے اصل دولت خود کو تیسری جذبہ ہے اعلیٰ صدیوں کے بعد کی وجود میں آج بھر رہا ہے۔

عوام۔ جہمیشہ اس کا محول رہے ہیں، جنہیں اس نے بغاوت کے انداز سکھائے ہیں اسے بھانپتے ہیں ان کے نفسانی عمل اور رد عمل سے آنکھ بند کرنا باغیانہ دانشوری کے خلاف ہے۔ حاکم نہ تیر و عوام اور حکام کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیتے ہیں اور ان کے مزاجوں میں خوف

عے تعلق پیدا کرتے ہیں۔

پھر ایک دوسری حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گذشتہ نصف صدی سے زیادہ انھیں ہیشہ اجنبی حکام کے خلاف تعمیر دی گئی ہے۔ اس حکم کے اثرات سے وہ اجنبی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اجنبی ادارے انھیں اپنے حکام میں اگر کوئی نمایاں وجہ اختیار کران کو دکھائی دیتی تو وہ اور بھی ہاتھ سے نکل جاسکتے۔ یہ ایک کمزور خیال ہے کہ حاکمیتور ضعیف کے خلاف تشدد میں نئی دلکشی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نئی دلکشی کو بے رونق عوام کی عقیدت و محبت سے کیا تعلق؟ ۹۔ فریڈرک کے حقوق کی کوئی مولیٰ بیڑن اور حاکمانہ تیردول کے مابین کوئی نقش موازنہ نظر نہیں آتا۔؟

مقصود کے چہرہ کی تمام رونقِ فنا کی سیما ہی
میں تبدیل ہو گئی۔ تب جا کر اس چہرہ پر نورِ مسکرا ایسا
(باقی)

اچھا اگرچہ تو ایک مضحکہ انگیز عدم توازن! — ابن مسعود

ارتقاء

۲۲

زندگی اس محبوبہ ہزار شیوہ کے مانند ہے جو ہر نفس ایک نئے جمال میں جلوہ گر ہو، نئے روپ میں ظاہر ہو، نئے لباس میں مسکرائے۔

آج دنیا تبدیل ہو رہی ہے، گویا زندگی، گویا وہ محبوبہ بنرا شیوہ اُن ہونے حادثوں کے غسل کدے سے نکل کر مال کی لطیف و نازک چادر اوڑھے تعمیر نو کے توشہ خانے میں جا رہی ہے۔

یہ لطیف و نازک چادر عبوری دور کا عارضی لباس ہے، جب زندگی تعمیر نو کے گوشہ خانے سے بن سونہ کر نمودار ہوگی یہ حال کی حبابی چسادر دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو جائے گی

جن خیالات کو کل بناوت و سرکشی کا شاہکار سمجھا جاتا تھا آج رجعت پرستی کا انتراع فائقہ ہیں اور آج جن تصورات کو زندہ و الحاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ حقیقت و بناوت کے سرچشمے کا محض ملتے ہیں! آنکھوں اس مافوق البشر کو دیکھنا چاہتی ہے جو ارتقاء کی منزل پر مقصود معلوم کر سکے۔ کس کا جگر ہے جو اس کے لبطن میں پوشیدہ معجزات کی ہلک بھی سن سکے!؟

ساغر

اَمْرُ جُوت

(۱) اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اسی تاریک چادر کی تہوں میں
عدم کے خواب سے ناپائے جاگی
اسی تاریک چادر میں تمدن مسکرایا کھلکھلایا جگمگایا
یہی تاریک چادر خاور تہذیب کا مشرق بنی آخر سر کر لئے لاکھوں
یہی تاریک چادر اوڑھ کر جیوانیت نے روپ دھارن کر لئے لاکھوں
اسی تاریک چادر میں سمٹ کر گم ہوئی ہستی
یہی مشرق بھی مغرب

(۲) اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اندھیرے کی اسی دیوار چیں کو
کبھی سقراط کی حکمت نے ڈھایا
کبھی عیسیٰ کے خون گرم و تازہ نے کیا رنگیں
کبھی گوتم کی موسیقی کے سایوں نے اسے گھیرا
کبھی ضربِ محمدؐ نے کیا نکتہ
حُصین ابن علی کے خونِ ناحق کے تھپیڑوں سے کبھی کلہاڑی لڑی
فضا میں ایک چنگاری سی ترپنی
اور اسکے بعد - اس کے بعد

چھائی پھر وہی منحوس تاریکی - وہی منحوس تاریکی
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اندھیرے کی جبین آہنی سے
یہ کیسی جوت پھوٹی مسکرائی جگمگائی
یہ کس کی مسکراہٹ سے بنی انسانیت گلشن
یہ کس نے ہند کی تاریک دُنیا کو کیا روشن
دکھی دُنیا ستاروں سے بنی دُہن

ضمیر زندگی میں کروٹیں لینے لگی اک مستقل دھڑکن

ورق تاریخ نے تیزی سے اُٹے

تغیر لے کے ساز و برگ تعمیر جہاں آیا

بنی آدم کی دُنیا کو سجانے

دل سقراط و فیثی جھوم اُٹھے

جبین بُدھ سے مکی اک نئی جوت

اندھیرے ہی سے پھوٹا اک نیا سوت

اندھیرا اپنی ہستی کھو رہا ہے

اندھیرا نور میں سل ہو رہا ہے

(۴) نئے دیک کی جوتی مسکرائی

جہاں کو کر دیا روشن

جہاں کو ، مانوتا کو ، زندگی کو ، قلب و جاں کو کر دیا روشن

سہ خانے میں اپنا جال لے آئے نئے خاکے

نئی دُنیا بنانے کی تینا کے نئے خاکے

کہ پھر ظالم اندھیرا جنگجو حاسد اندھیرا

لئے تاریکیوں کے جال آیا

بکھر امن کے دیک پہ ٹوٹا

کبھی کرنوں کبھی دیک کو لوٹا

زمین سے آسمان تک موجِ خوں ہے

ابھی تک آدمی صیدِ زبوں ہے

اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید

(۵) اگر سقراط کا دیک ہے روشن

سراجِ ابنِ مریم گرا بد تک بچھ نہیں سکتا

کوئی جھوٹکا اگر شمعِ شہید کر بلا کو چھو نہیں سکتا

تو اے تاریک دُنیا تو اے مایوس انساں !

بچھا سکتی نہیں ہے کوئی آندھی

یوں ہی روشن رہے گی شمعِ گاندھی

ہمالیہ کا پیغام

موسیو پال رچرڈ فرانسسیسی عالم و فلسفی مشرق کی روحانی اور اخلاقی قدروں سے کافی متاثر تھے۔۔۔۔۔ ویدانتی کلچر نے انھیں اتنا موہ لیا تھا کہ وہ آربند و گھوش جیسی بگڑیدہ ہستی کے ساتھ پائیدہ سحری میں کافی عرصہ تک رہے۔ اس کے بعد وہ ہمالیہ کے ایک برف آلود مقام پر کچھ مدت عزت گزریں بھی رہے جہاں انھوں نے ایشیا اور ہند کے حال و مستقبل پر گہرا سوچ و چاہ کیا۔ ان کے یہ افکار ہمالیہ کا پینام اور ہند کے نام سے فرانسسیسی زبان میں شائع ہوئے۔ جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کتبلی صورت میں چھپ کر بچہ مقبول ہوا۔

ذیل میں ان کی کتاب کے اولین اوراق کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے جس کے ترجمہ کرنے والے پٹریٹ پیاسے لال شرما (مرحوم) وزیر تعلیم یو۔ پی۔ ہیں جن کی یاد آج بھی سیکڑوں دلوں میں باقی ہے۔

(مرحوم) موزیر تعلیم، لاپچی جس جن کی یاد انا بھی سینکڑوں دلوں میں باقی ہے۔
ویدانتی تصورات کی نفاست و انفعالیات سے متاثر ہونے کے باوجود موسیو پال کا فکر منفی اور فرار پسند نہیں ہے۔
ان کے سوچ میں شاداب و روحانیت اور فکر کی زندگی و تابندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ متحدہ ایشیا
ہی آنے والے زمانے میں تمام دنیا کے امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد میں ہمارے وطن کو بہت بڑا رول ادا کرنا
ہے۔ ایشیا کے مستقبل سے ہندستان کا مستقبل وابستہ ہے۔

زادہ ہم روحانی حکمران سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟
میرے پاس شہ راج کی یہ یادگار محفوظ تھی جسے میں ناظرین تک پہنچانا ہوں۔

سافر

وہ مساحت قبرستان۔ وہ عظمت گھڑی جب تو آزاد ہو گئی
 قریب کے قریب آؤ روئے، اگر صرف وہیں ہی جوتے جا یا تیری آؤ
 سے بہت زیادہ، بہت ارفع، زیادہ بقیں، اور ارفع، زیادہ متحرک
 وہ کسی مغلوب نہ ہونے والی، آزاد تھی کہ تو بھی اس کی طاقت سے
 مجبور ہو گئی
 یورپ کی قدیم اڑن کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظربانی کے ان پہاڑوں کے
سمند میں ایک حرکت نامتناہی ہے۔ اور یہی حرکت ہے جو جس
طرح تیز بغض محرک ہوتی ہے۔ یا جیسے کہ زندہ لفظ، اور ایمان کی جتنی
والی آواز سنو! ————— وہ آواز کچھ کسی ہے وہ آواز
ہند سے خطاب کرتی ہے۔ بھارت ماما اس پیغام کو سن جو ان بندگان کو
تے نے آواز۔ جو ہمالیہ کا پیغام ہے۔ یہ آواز کچھ ہے کتبہ کی۔

یورپ اور اس کے مقبوضات کے ساتھ ساتھ یہ رخصت ہو رہی ہے۔ جب جسم پہلے تو اس کا کوئی معنوی کچ نہ سکتا ہے تمہارے کی ملکت کا خاتمہ نہیں بلکہ یورپ کی سلطنت کا خاتمہ کچھ تو اس یقین سے ابھی اس کی تقلید کرتا ہے۔ پتا نہ چلتا ہے اس سے شک نہ کچھ کیا کرنا چاہئے (دیکھ لے) زور اور دشمنی دے اور یہ بھی سیکھ کر تجھے کیا نہ کرنا چاہئے کہ تو مظلماں دا مظلماں سے محفوظ رہے۔

یونکر رہ گیا آجہ میرا دیکھ اور جو آئندہ سامنے آئے اسکی طرف رجوع ہونا وہی سوچ جو ایک جگہ ٹہرتی ہے تو ایشیا کی جانب اٹھتی ہے مگر وہ ایشیا کو دیکھنے آدھی ہے۔ یہی آفتاب جو گزرتے ہوئے دن میں مشرق سے غمگین مغرب کی طرف دورہ کر رہا تھا لیکن اب وہ یہاں نمودار ہوتا ہے اگر صبح صادق کا نظارہ دیکھنا ہے تو ایشیا کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

میزان زمانہ کی یہی حرکت جس نے یورپ سے ادنیٰ ہوتے وقت ایشیا کو جھٹکا یا تھا اب یورپ کو جھٹکا رہی ہے ایشیا کو اٹھا دے یورپ کا زوال، ایشیا کا عروج، مساوات کے یہ دو جملہ ہیں اور انہی کے ذریعہ تو اجماع عالم کی تقدیر کا عقدہ حل ہو گا۔ دروازہ کے دونوں کواٹھ کھل رہے ہیں۔ یہ دروازہ کھلا رہے مستقبل کا باب آرزو ہے۔ ایک دشمنی میں ہے دوسرا دشمنی میں۔

”خیر ایشیا“ (داد رند) تم اس لئے خود کی کی عادت چھوڑ دو کہ کوئی قوم اور کوئی انسان تمہارے لئے زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی انسان یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے سے اونچی بلند کیونہ دیکھے۔ اقوام یورپ کی طاقت کا ایک سبب یہ تھا کہ زندہ یورپی جذبہ اُن سبب جاری انداز میں جاری تھا۔ اب ان کا خاتمہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ اُس اجتماعی جذبہ اور اُس یورپی جذبہ میں قاصر رہیں۔

ایشیا کی قومیں زندہ رہیں گی وہ محفوظ اور آزاد ہو کر زندہ رہیں گی لیکن صرف اس وقت جب اُن سبب میں اجتماعی جذبہ اور ایشیا کی حب الوطنی کی روح زندہ ہوگی۔

ایشیا والے یعنی ہندوستان، چین، جاپان، فارس، عرب کے شہری تو مجھے اس وقت سب جگہ نظر آتے ہیں لیکن ایشیا کے شہری ایشیا کے درند کہاں ہیں؟

ایشیا کہاں ہے؟
میں ایشیا نہ لے تو ہر جگہ دیکھتا ہوں لیکن ایشیا کہاں ہیں؟

دہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو اور جنہیں کثرت میں وحدت کا احساس ہو، وہ ایشیا جو تین نسلوں کا گہوارہ ہے پنج مذہبوں کی عبادت گاہ اداسات سلطنتوں کی سرزمین ہے دی سات سلطنتیں ہیں جو لکے بجائیں تو کی طرح گلہ ایک ہونے والی ہیں۔

دہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جو تمام انکار عالیہ عملی حالات کا ایک گلدستہ ہے۔ سچی ایشیا شمال میں اسلامی ایشیا مغرب میں، بودھ کی ایشیا جنوب میں، کھنڈر شمس کی ایشیا مشرق میں، دیروں کی ایشیا اسی گھر روحانی ایشیا سب گھر دہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جہاں نصف نوری نغمہ انساں آ رہا ہے وہ ایشیا جو اس وقت غلام ہے مگر آئندہ آزاد ہوگی وہ ایشیا جہاں ترقی اقوام مغرب طاعت کے زندہ ہوا رہے وہ اس لئے آزاد ہوگی کہ محبت سے اُن کے سامنے

جھکے۔

دہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ۹۰ درجہ صحران مدح میں اس وقت ایک ہے اور جس کو اس وجہ سے بھی پاجاؤ کہ اس مدح کا ظہور ہوا اور اس ظہور سے دنیا پر فخر ہو کر دیکھ ایشیا کے اتحاد و پروانگہ کے اتحاد کا انعقاد ہے۔

دہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہے؟ وہ ایشیا جسے قیامت نے ”نار عظیم کا خطاب عطا کیا ہے۔“

اور سہ: تو ایشیا کا دل ہے جس میں اس کا داغ اور جاپان تیر مضبوط ہاتھ ہے، ان سب سے علیحدہ تم کس طرح زندہ رہو گے؟

بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی قوم کی تقدیر یورپ کی تقدیر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ تمہاری تقدیر بھی ایشیا کی تقدیر سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی تمہارا سوال صرف تمہارا سوال ہی نہیں ہے وہ سامی ایشیا کا سوال ہے۔

یورپ کے لئے ایشیا ایک تعمیر شدہ شکار ہے اس غرض سے کہ وہ یورپ کا شکار بنے اسے چاہئے کہ وہ یورپ کے مقابلے میں ایک ہو جائے آزاد ہی اور اتحاد ایشیا کو سہارا ہے ایشیا کی نئی تہذیب ہمارا پروگرام ہے اور تو ایشیا کی انجمنیں ہمارا طریق کار مادر سندس مہیا رک و صحت کے لحاظ سے اپنی روح کا موازنہ کر۔

اور اب تم ماضی کے ماضی سمجھو، صدیوں تک تم مرد وحدت

میں زندہ رہیں، خلائی کی تنگ قبر میں زندہ رہیں لیکن وہ قبر تھا جسے
لے نہی زندگی کا گہوارہ تھی، جب کبھی بھی وقت آیا تھا اسے پیغام پر
نوردار ہوئے۔ انھوں نے تم سے کہا، قبر سے باہر آؤ، لیکن پہلے ان
رسوئوں کو جن سے تمہارے اعضاء کاٹنے ہوئے ہیں پھینک دو، اور اپنے
پیکر کو ان کی بجا ست سے پاک کر لو۔

انہوں نے تم سے کہا، سیدنا محمدؐ کی آزادی حاصل کر لو، برائی آزاد
حاصل ہو جائیگی۔ لیکن انکی آواز یا تو صلابت محرابی یا قید خانوں کے دروید
اس آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ تاہم تمہاری روح اس آواز کو سن سکتی تھی

دوسرے بیابان پر نوردار ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ اپنی
زنجیروں کو بچائے تو قونہ کھڑے ہو کر لو، اور کچھ کہتے ہیں کہ "اپنا جوا
سیدھا کرو" اور اگر ذکر کو تو اس کا خاتمہ کر دو" اصلاح ہو نہیں تو
خاتمہ، لیکن تمہاری روح اپنی خاموشی میں ایک اور آواز سن رہی ہے
اور یہ آواز کہتی ہے "جنہوں نے نہیں پہلے جگایا وہ جھوٹے تھے، کوئی
مرد وہ تک کھڑا ہو تو قبر پر نہیں نکل سکتا۔ اس دور جدید کے
لئے جو تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ تیار کیا کر دو۔"

جنہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ زیادہ آزادی کی طرف تمہاری مدد
کریں وہ تمہاری زیادہ معیشت اور بنیادی کا باعث ہے اور جنہوں نے
تمہیں اس کا سبق پڑھایا انھوں نے بغیر جانے تمہیں بنیادی کی طرف
پہنچایا لیکن وہ جیہ خیال کرتے ہیں کہ بنیاد میں تمہاری رد نما کی کوئی
وہ بھی اپنی باری میں تمہیں باہمی طور پر حاسب ہیں وہ انہیں لے
جانا نہیں چاہتے۔ سب ہی تمہیں ایک دوسری منزل کی طرف لے جائے
ہیں جو منزل نہیں ہے تمہاری تقدیر کی حقیقی منزل ہے۔

وہ منزل تمہاری نئی زندگی کی منزل ہے نئی تعمیر کی منزل ہے، نئی زندگی
میں نئی ساخت کی منزل ہے اور اس ساخت کے لئے اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں
پہلے کٹائی میں پڑنا ہو گا، یعنی تمہیں چلنا ہو گا غرض تمہارے لئے اختیار کا
زمانہ آئے گا۔ وہ اختیار جس سے نئی، صاف انداز دنیا پیدا ہو جائے

تم اپنے مستقبل میں خوشی سے داخل ہو جاؤ اگر نہیں جاؤ تو کہہ دو
داخل کی جائے تم اس میں داخل ہو جاؤ لیکن اس طرح نہیں کہ تمہاری
حسرت بھری نگاہ ماضی کی طرف مڑ کر رہ جیتی رہے۔

اس بات پر نا زان نہ ہو کہ تم کیا تمہیں کوئی نہ ایک
شاندار ماضی سے زیادہ جوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ تم اس
میں پابند نہ ہو جاؤ زمانہ حال کی کوئی چیز بھی اتنا خراب نہیں کرتی

جتنا کہ مردہ ماضی کی بھی ہوئی خاک حراں کرتی ہے۔

تم کہتی ہو میری تہذیب دنیا کی تہذیبوں میں سب سے
زیادہ شاندار تھی اس سے کیا حاصل؟ جب کہ وہ اب نہیں ہے اور
جو کئے والی ہے وہ اب بھی تک نہیں آئی "جو تھا" اور جو ہے" میں فرق
ہے، صرف باقی رہ جانے کا نام زندہ ہونا نہیں ہوتا۔

تم کہتی ہو "میرے شاہسٹر میرے راہ نمائیں اور میرے وید
میری بنیاد ہیں۔" دائمی وید ہر ایک زمانے میں کہے جاتے ہیں اور اس کا
کے شاہسٹر کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔

اپنے ریشوں کو نئے سرے سے دیکھنے کی اجازت دو۔
اپنے عاروں کو نئے رنگ لگانے دو

تم "شیوہ" کی پرستش کرتی ہو۔ جو طاقت اور حیات تازہ کا
دولت ہے جو ان تمام اسٹیمپا کو جن کی تجدید نامک ہو مبالغہ کر دیتا
ہے۔ کیا تمہاری یہ خواہش نہیں ہو گی کہ وہ تمہاری تجدید کرے؟
یورپ کا حال "کو گذر رہا ہے اور تم جاہلی ہو کہ تمہارا ماضی باقی رہے
وہی طاقت جو ایک کو نکال رہی ہے دوسرے کو بھی خارج کر دیتی
ہے۔ اور یہ مضبوط سے مضبوط مکتوں سے لٹکا ہوا رہے جسے
کوئی بچ نہیں سکتا۔

مستقبل کا حلیہ اس کو نہیں مل سکتا جو بیشتر اپنی قربانی نہیں
دیتا۔ جتنی عظیم الشان قربانی ہو گی اتنا ہی بغض بہا عظیم ہو گا اگر
تم حیات تازہ جاہلی ہو تو اپنے کل ماضی کی قربانی ادا کر دو۔
ایشیائے ایک گم شدہ جزیرہ کی جھوٹی سی قوم نے
انہی سی صد سالہ ماضی کی کھس قربانی مستقبل کے لئے پیش کی اور
وہ آزاد و مضبوط ہو کر تاریخ کی تازہ صدیوں میں داخل
ہوئی، اسے عظیم الشان قوم، تو جی اپنے ہزار ہا سالہ ماضی سے
نکل!

اپنے غیر موجودہ طریقوں اپنی قدیم روایات اپنی روح کو
متبدل کرنے والی آروں، اپنے ضابطوں، اپنے فیصلوں والی ہندی قانون
اپنی آہنی زنجیروں اور اپنی ذوقوں سے باہر آ۔
زمانہ ماضی میں وہ پہلی اور زندہ صورتیں تھیں، امدان میں اتنی
ہی کھک تھی جتنی کہ زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ جھوٹی اور
مردہ دکھائی دے رہا ہے اور کچھ بھی نہیں، وہ ایسی کڑی جیسے لعش

کا بھی نعرہ ہو رہی تھی یا نجات، یہی ممکن تھی، مایا نجات ہندوستان اور
ایشیا کے لئے ہے۔

اقوام اور نسلوں میں تو مسادات کا دعویٰ کرتی ہو اور وہی مسادات
خود دلوں میں معاہدات رکھتیں، تم اقوام کی ہمشیر اس وقت ہو گی جب
تمہارے فرزند آپس میں بھائی بن جائیں گے۔ اور تمہاری بیٹیاں ان
کی بہن اور برابری کی حق دار!

تمہاری بیٹیاں اندر غلامی میں رکھی جاتی ہیں۔ تو تمہارے پیٹے باہر
غلام نہا کر کیوں نہ رکھے جائیں، جب دنیا میں تمہاری عورتیں
سب سے زیادہ مخلوقیت کی حالت میں ہوں تو تمہاری قوم کی تقدیر
بھی وہی کیوں ہو۔

مستورات اور ان کی قوم کے مابین ایک پوشیدہ اور
قربانی تقدیر کی رشتہ ہوتا ہے۔ قوم کی حیثیت اس کی
سی حیثیت ہے۔ اور وہ مستورات میں شمار کی جاتی ہے۔
جس قوم میں عورتوں کے ساتھ غلاموں کا سلسلوں ہوتا ہے
وہ قوم خود غلام بن جاتی ہے۔

اکثر جاتی ہے
مگر جس طرح زندہ رہ سکتی ہو وہ تمہارے جسم کے بند نہیں ہیں
بند نہیں بن گئی ہیں، مختلف اعضاء کی مختصر نہیں رہیں، ان کی
تعمیم جلائی اور علیحدگی بن گئی ہے۔
اس طرح تعمیم شدہ جسم ہو کر تم جس طرح زندہ رہ سکتی ہو
جسم کو آزاد کر اس کے خون کو تمام رگوں میں آزادی اور خوشی سے دور کر
دو، اپنی ذات بات کی بندشیں توڑ دو ایک دوسرے میں شامل ہو کر دیکھو
تم یقیناً زندہ ہو گی جب موت سے مدد نہ ہو گی

ایک قوم کی حیثیت سے تم اس وقت زندہ رہو گی جب نئی نوع
انسان کا خلاف گناہ نہ کر دو گی۔ کیونکہ ایک انسان کی تدریل
نئی نوع انسان کی تدریل ہے۔ تم نے انسانوں کو "ہریہ" بنالیا اس
لئے دوسرے انسانوں نے تمہیں "ہریہ" بنالیا۔ قومی خودی کا
خیال کافی زہا، صورت کے لحاظ سے، خودی، کا خیال بھی تمہارے
لئے بے حد وسیع تھا۔ تم خودی کے انتہائی تنگ خیال ذات کی خودی
میں ڈوب گئیں!
نجات میں زندگی بسر کرو پھر تم یقیناً زندہ رہو گی۔
اتفاق سارے ایشیا ہی کا نوہ نہیں ہے ساکنہ ہندو

تاثرات

احمد ریاض

اب بھی اک پرویز کا دینگے ساتھ یہ ظالم دنیا والے
وقت کہاں لے آیا مجھ کو کیا سوچا کیا دیکھ رہا ہوں
طوفان کے بے مہر تھپڑے ساحل تک کیوں پہنچائینگے
دونوں ہی احسانِ نازک ناکہ چلن نوج رہے ہیں
میں بے ثروت تم بے بہت کون پرانی پٹناٹالے
خرمن کو بجلی کا سہارا لگچیں کھلیں گے رکھو الے
جب خجناؤ ڈوبنے نکلے شتی والے ساحل والے
کٹیائوں کے گھوڑا ندھیر محلوں کے زرکارا جالے
آپ کا تاج و تخت سلامت آگے اوجِ نجات مبارک
راہوں میں دم توڑ رہے ہیں مائیں بہنیں بچے بالے

اختر ہوشیار پوری

ساقی

وہ ابر آٹھا وہ بوندیں ہیں وہ دل ہوا غمنا بستی
 یہ در و فصل بہار ساقی نہ آئیں گے بار بار ساقی
 کلی کلی مسکرا اٹھی ہر روش روشن گدگدا اٹھی ہے
 مجھے خبر ہے گلوں کے پردے میں پل ہے ہیں ہزار کا
 یہ مانتا ہوں کہ تیرے ساغر نہ نہنگی خود جھلک ہی
 جہاں کی زقار کہہ ہی ہو پرائے شیشے نہ مٹا دیں گے
 نظامِ عالم بدل چکا ہوا لٹ چکی ہے بساطِ ہستی
 دیکھو ستاروں کی ہم گلوں کشید کر لیں تار خودی
 زدہ ستاروں میں نور باقی زدہ گلستاں میں تیا ہیں

۳۹
 ادھر بھی لاجم گھول کر ہم ہیں غم روزگار ساقی
 جو ہو کے یالوس جا چکے ہیں انہیں خدا را پکار ساقی
 گلوں کو جھولا جھلاتی آئی ہر نوع و ہر بہار ساقی
 تری نگاہوں کو جانتا ہوں نے قریب بہار ساقی
 ترے لبوں کو مگر مقابل کہاں سے غم شکر ساقی
 بجائے مے کے اُتق سے پھوٹیکا خون کا البتہ ساقی
 اگر بھی رنگِ انجن ہو تو کیا ترا اعتبار ساقی
 کہ صبح تو ہو چلی ہے کون اب ترا کرے انتظار ساقی
 تری نگاہوں میں ٹھونڈ تلہ جو کھو چکا ہے بہار ساقی

انہیں سے اختر نہیں گے اک دن انہیں سے غنچے کھلیں گے اک دن
 دیکھتے مار جو تجھ کو پہنارے ہیں اشکوں کے بار ساقی

کہانی کی کہانی

مورہ جہاں بیٹھا تھا۔ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے تھے۔ ایک بار وہ مولے کا قصہ تھا۔ دوسرا لوچکے کا قصہ تھا۔ اور اب دونوں ایک دوسرے کے جان کے پیارے ہو چکے تھے۔
پرتیز پر بولا۔ مجھے تمہارے حسین گیت نہیں چاہیں، میرے سامنے جلتا ہوا بارہ مولہ ہے۔ میری جوتی بہن کی دریدہ عصمت ہے مجھے پریشانی ہوئی۔ قبول شہر والی کی لاش ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

دوسرے درے سے رحمت خاں نے کہا۔ میں ریاست پونچھ کا مہمن ہوں، جھلندی کا رہنے والا۔ جھلندی جیسے میرے دشمنوں نے بدکاری کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے، جاتی ہوں لوگ تہذیب کی کچھ بھائی اقدار سے پنجابی مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں۔ پرتیز نے میرے کوئی رنگ گنت نہیں ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

آر بار۔ پرتیز اندر رحمت خاں کے مورچے تھے۔ راج میں سلیم کے نیگنے کی طرح چمکتی ہوئی ایک وادی تھی۔ میں نیچے وادی میں آگئی بیلکیں واں کوئی نہ تھا۔ گھراڑے اور بولک بڑے تھے۔ کھیتوں میں بیل چلے جتے جتے رنگے جتے جو پرتیز بانی کے گھر کے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ چرواہیاں کہاں تھیں۔ جواغیں اپنے سروں پر اٹھائے اپنی بھلی بھلیں جھکے کھیتی ہوئی گھنٹہ گھنٹہ کے مورچے پر غائب ہوئی کی ڈار کی طرح اڑی اڑی چلی جاتیں۔ میں اکیلے ہی کھڑی کھڑی واں ایک جیسے کے گناہے دن بجائے گی۔ اتنے میں دو آدمی داخل لے کہیں سے نکل آئے ایک نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں بڑے خوب صورت گیت سنائوں گی۔ دن پر ماچوں گی۔

وہ اکبر بڑی ظالمانہ ہنسی ہنس کے بولا۔ ہاں، ہاں گیت بھی

ایک روز میں نے کہانی کو بڑے خوب صورت کپڑے پہنائے، اپنے پیچھے کا زین پہنایا جس پر کشمیری کارکنوں نے رنگا رنگ نازک بیل بوٹے کاٹھے تھے۔ اُس کی گردن پر سرخ موتیوں کی تسلی پہنائی۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اُس کے بال سنوارے، اُس کے ماتھے پر افشاں چن دی۔ اُس کے پاؤں میں خفایا باندھ دیئے اور اُس کے ہاتھ میں ایک دف دے کے اُسے اپنی وادی میں بھیج دیا۔

کہانی بہت جلد دایر علی آئی پرتیز مردہ۔ برلیٹن۔ حیران دل برداشتہ، اُس کا چہرہ زرد تھا۔ بال اٹکے ہوئے فزن جگہ جگہ سے پٹھا ہوا۔ آنکھوں کا کاجل کا خود تھا۔ خفایا بے آواز تھے۔
میں نے گھر کے پوچھا۔ کیا ہوا۔ وہاں تو ایسا استقبال تھا! کبھی دیکھا تھا۔ کبھی ناہ۔ میں آنکھیں کھائے تمہارے منتظر تھے۔ پوچھا ہوں سے بادشاہوں تک بھی تمہارے دلکش، درباری، رنگین گیت سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے، جلدی کہو۔ وہاں ایسا سلوک تمہارے ساتھ کس نے کیا۔

کہانی بولی۔ تمہاری وادی میں آج کوئی میرے جیسے گیت سننے کو لے آیا نہیں ہے۔ دل کے کنارے چھوٹے چھوٹے تھے جو وعدہ کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ خود تیرے جو کچھ کھڑی ہو کر سن رہی کی طرح پہرہ دے رہی ہیں۔ کار بگر لگوں بنے کشمیر کا تانا بانا بن رہے تھے۔ کی کو فرمت نہیں ہے کہ میرے خوب صورت گھر کے کو دیکھے۔ میرے ہنٹوں سے بھولوں کی طرح کھٹے ہوئے گیتوں کو سننے۔ میرے پاؤں کے نازک خفایا لوں کی نفرتی جھکا دکھائے۔ مجھے وہاں سے واپس آنا پڑا۔

جی نے کہا۔ تو تم ہی جنگ پر گئی ہو تھیں۔
کہانی بولی۔ میں وہاں بھی گئی تھی۔ ایک پہاڑی درے پر۔ پرتیز مورچہ لگا دے دیکھ بیٹھا تھا۔ اُنکے سامنے دوسرے درے پر رحمت خاں

سنیں گے۔ ابھی پہلا تیری چٹیں تو سن لیں۔

پھر دوسرے آدمی نے بھی مجھے پکڑ لیا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اور میں دو دوں کے ماتھوں میں یکایک کا فذ کے برابر کی طرح مکالمے کے لئے ہو گئی اور چڑھ کر زمین پر گر پڑی اور وہ مجھے یوں اپنی بریت تبدیل کرتے دیکھ کر بے گہرائی اور دماغ سے بھاگ گئے۔

اسی کشمکش میں میرا قرن بھٹ گیا۔ اور غصا، بوٹ گئے اور میرے ماتھے کی اذیتاں نوچ ڈالی گئی۔ یہ دیکھتے ہیں اب تمھاری دادی کی بھی قبریں جاؤں گی۔ وہ سر جھکا کے رونے لگی۔

میں بہت دیر تک پریشان رہا۔ وہ بہت دیر تک سسکیاں پتی رہی۔ آخر میں نے اسے دلاسا دینے ہوئے کہا۔ اچھا میں نہیں دانہ نہیں بھیجتا ہوں۔ آج ہمارے نیا تاج محل ہو چکا ہے۔ میں نے اسے دے دیا ہے۔ میں نہیں رہوے گا کلرک بنانے کا وہاں بھیجتا ہوں۔ ہاں مگر ہمارے نیا کا اوتے احترام ملحوظ رہے۔ وہاں پر بھی مشرف طبع سے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ عقلی آداب کا بہت خیال رکھتے ہیں کہیں کوئی ایسی دیسی بات نہ ہو جائے گی۔ بلزن بدنام ہو جائے۔

میں نے کہا کہ کوئی چالیس برس کا ریلوے کلرک بنا دیا۔ نام مل وانکر، جو دو دو کہیں فیر ایک میں کام کرتا ہے۔ جس کے دانت کھنٹی رنگ کے ہیں۔ اور جو جوتا اور تمباکو کا کھاتا ہے۔ جس کے باغ کچے ہیں۔ ایک بیوی ہے۔ ایک بڑی بیوی ہے۔ دو جوان بہنیں ہیں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ بیوی کا ایک بھائی ہے؟ دو دفن آنکھوں سے اندھا ہے ڈر جو اسے جہیز میں ملا تھا۔ مل وانکر کا باب بھی ریلوے میں کام کرتا تھا۔ اسی لائن پر۔ اور اب مل وانکر بھی کام کرتا ہے۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی تاج محل ہوئی نہیں گیا۔ تاج محل کی ہول تو درکنار وہ کبھی بھی سنٹرل کے ریلوے سٹروں میں بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکا۔ اسی لئے یہ آج اسے تاج محل ہو مل بھیج رہا تھا، جہاں ہمارے نیا آنے والے تھے۔

پراناسال چار ہاتھ تھا۔ نیا سال پیدا ہو رہا تھا۔ یہ رات بڑی سہانی تھی۔ میں نے کوئی سات بجے کے قریب ہی مل وانکر کو تاج محل ہوئی بھیج دیا۔ اور خود میرے کرنے کے لئے سمندر کے کنارے چلا گیا۔ وہاں بہت دیر تک ہلٹا رہا اور ریل پر اور گھوم گھوم کر اٹھا کر گئے ان کا مکان بنانا رہا۔ اور پھر اس کے بھر دے پر گرایہ وادوں سے گھولی دھول کرتا رہا اور

پھر سمندر کی ایک بہت بڑی لہر آئی اور میرا گھوندا بھاگنے لگی اور میرے پلوے بھی گئے کھنٹی اور میں اس طرح غصے ڈاندار ہو کر واپس اپنے گھر لوٹا۔ راتے میں ساحل کے کنارے اب کھنٹی کشتیوں میں لائٹیں باندھیں بادبان ٹھیک کر رہے تھے، رات کو کمند میں کھلیاں پکڑنے جا میں گئے ایک بڑھا اپنے کتے سے باتیں کرتے جا رہا تھا۔ ایک جو ڈارین پر کھو احتلاط تھا پولیس کا سپاہی سر سے پرکھڑا اسگریٹ پی رہا تھا۔ دو رات مل بچنے والا پیٹھ پوڑ کر اپنی صدا لگانے ہوئے جا رہا تھا۔ یکایک آسان پر سائے سستا سے کھل کھلا کرتے ہوئے بڑے بڑے بچوں کی طرح جیسے وہ میری ٹوٹی ہوئی چیل میرے پیٹھے ہوئے پانچے اور دیر میں میں سی ہوئی رانی فیض کا نفاق اُڑ رہے ہوں۔ اور میں جلدی جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر چل آیا۔ اور میں ندول میں جا کر اب میں کبھی اتنا بڑا بس میں کر ساحل کے کنارے نہیں جاؤں گا۔ آج نئے سال کا جنم دن ہے۔ اور آج سب لوگ بڑا لباس دیکھتے ہیں۔ میرا دل نہیں کھینچتے۔

میں نے دروازہ دکھو لاد کر کپڑے تبدیل کئے اور کھانا کھا کر اور ایک عمدہ سی کتاب ہاتھ میں کر کے سیر پر دراز ہو گیا۔ دیر تک اسے پڑھتا رہا۔ گیا۔ رات گئے۔ بارہ بج گئے۔ ٹکسٹل وانکر واپس نہ آیا۔ میں نے سڑک پر دل ہی دل میں کہا۔ آج پہلی رات تاج محل ہو چکا ہے۔ اپنی جلدی کا کھانے کو لوٹے گا۔ اتنا سوچ کے میں نے کتاب کو بند کر دیا۔ اپنی بھاری اور بڑے مزے سے نرم نرم کر کے۔ زبردستی چیدنا سوچا۔ یہ نہیں کتنی دیر سوتا۔ با ککاک ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ میں نے بجی لگا کر دیکھا گھڑی میں تین بج۔ ہے تھے۔ یہ اس وقت کون سی فون کر رہا تھا۔ یہ غصہ میں چونکا اٹھا اور رات بھر میں کہا ہون چہ

اب یہ سال وانکر اب یہ رات کھنٹیک تاج محل سے بول رہے ہو جسے پوچھا۔

ابھی میں بولا بکے تھانے سے بول رہا ہوں ما وانکر نے بڑی گھبراہٹ میں جواب دیا پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور بلاصاف مجھے ہاتھیں باندھ کرے۔ آپ فوراً جا جائے۔

خیر عاصب میں رات کے تین بجے اٹھا اور بھاگا بھاگا تھانے گیا اور اسے صاف پوچھ پڑایا بس کی ٹیکر کھٹی ہوئی تھی اور اُس کا منہ سوچا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خوشیوں کے نشان تھے۔ میں نے پوچھا تمہیں پولیس نے مارا ہے۔

پھر نیتاجی کو بارہینائے گئے۔

انہاں بھائی گھنٹیں

ایکدیس پیش کیا گیا

تایاں بھائی گھنٹیں

ٹھہر۔ ٹھہر۔ میں نے داکٹر کو ٹوک کے کہا۔ یہ تو تم نے
بتایا ہی نہیں کہ ایڈریس میں کیا تھا۔ جواب کیا دیا گیا۔

دل داکٹر نے بڑی حسارت سے کہا۔ ایڈریس میں ہی تھا جو ایسے
ایڈریس میں ہوتا ہے۔ مینی آپ بہت بڑے تیس مارخاں ہیں۔ اگر آپ
نہ ہوں تو ملک دھب جائے۔ قیامت آجائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ
ملک کا ایک دلد آپ ایسے وغیرہ وغیرہ قسم کے دانشوروں کے ہاتھ میں
اور ملٹی سنڈلیکس۔ اور جواب بھی اسی قسم کا تھا۔ مینی آپ لوگوں نے
میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ میں راجہ لڑا آدمی نہیں ہوں۔ بڑے
بڑے مسئلوں کا سہا بھج پر پڑا ہے۔ درنہ بھی تو ملک کے سامنے بہت سے
بڑے کام ہیں۔ اے بڑے کام میں جن کے مسئلہ بڑے سوچ کا پرکھوت
ہے۔ اس وقت ملک کے سامنے بڑا قصہ ہندوستان ہے

اور اب میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ آگے کی ہوتے والا ہے۔ کون اتنی بڑی
ذمہ داری لے آتا کہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کو میرے اوپر دشمنی
رکھنا چاہئے اور ملک میں بڑے امن سے رہنا چاہئے۔ اس کے لئے بہت
فردی ہے کہ آپ لوگ شراب نہ پیئیں۔ سنیہا مال میں سیکرٹ نہ پیئیں اور
بارہ بجے تک نہ سول اور ٹھہر سوسائٹس۔ درنہ ملک تباہ ہو جائے گا
برن کی طرح یہاں بھی کیونزیم پھیل جائے گا۔ اس لئے سمرایہ داروں
کو چاہئے کہ وہ گورنٹ کا ساتھ دیں۔ اور میں مزدوروں کو مشینہ
کرنا ہوں۔ کہ وہ چڑتا یں نہ کریں۔ پیداوار کو بڑھائیں۔ اس موقع
پر مجھے نہیں آگیا۔ میں نے اپنی سیٹ سے پھیل کر کہا۔ میں آپ سے
ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ سب لوگ میری طرف گھور گھور کر دیکھتے
گئے۔ جیٹھ جاؤ۔ جیٹھ جاؤ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کہا۔ نیتاجی۔ میری خواہ چالیس روپیہ ہے۔

ایک آدمی بولا۔ چالیس روپے والے آدمی کا تاج میں کیا کام۔

اے باہر نکال دو۔ اے باہر نکال دو۔ بہت سے روساء
اک دم چمکے۔

میں نے کہا۔ نیتاجی۔ آپ مزدوروں کے بڑے حامی بنے تھے
آج آپ کو تاج محل میں آنے کی فرمت ہے۔ فیورڈ سٹروں سے لائسنس
ڈگریاں حاصل کرنے کی فراغت ہے۔ بے لاکھم کا نفرین میں شرکت

نہیں۔

پھر کیا بتیوں سے بھرتے رہے ہو۔

دہ بولا۔ ہاں بڑی شریف بیان تھیں۔ بڑی خوب صورت
سائرمیاں پہنے تھیں اور شراب میں دھت تھیں۔

میں نے کہا۔ تم اتنے میں کیسے پہنچ گئے۔ میں نے تو ہنس لگایا
ہوٹل بھیجا تھا۔

دل داکٹر بولا۔ جیجی تو۔ آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں
اپنے دوچار ایسے تھیں کو لے جاتا۔ وہاں جیٹھ لیتا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ
مجھے اندر گئے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ میرا لباس بہت شاندار تھا۔ یہ
نیکر۔ یہ قمیض۔ یہ جوتا وہاں کے تو میرا لوگ بھی بہت اچھا لباس پہنتے ہیں
یہ آپ نے کیا کیا۔ اگر آپ کو مجھے وہاں بھیجا ہی تھا تو کوئی شرف ہی دیا ہوتا تاکہ
عموماً سندھوستانی لباس۔ یا کتھن سارڈن کرنا۔ اور۔ یا دھوتی۔ اور بڑے
جیکٹ اور سرسریک شفاف سا گاڑھی ٹوپی۔ آج کل یہ ڈریس بھی خوب چلتی
ہے۔ ملن۔ منسا ہے۔ کسی زمانے میں اس ڈریس کو دل گئے نہیں دیتے تھے۔ مگر
توجہ دل کو وہاں اس لباس کی بہت عزت تھی۔

میں نے کہا۔ تم اپنی بات سناؤ۔

دل داکٹر بولا۔ پہلے تو ان لوگوں نے میری وضع قطع پر شکل نشا
پر اعتراض کیا۔ مگر چونکہ میری سیٹ بگ تھی۔ اور جب میں پہنچا میں اسی
وقت نیتاجی سیرمیاں چڑھتے رہے تھے اس لئے بٹکر لے مجھے اپنی
پریشانی میں۔ یاد دیر تک رکھا نہیں۔ اس کی نگاہ نیتاجی پر گئی اور میں
بال کے اندر چھپا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے منہ پر دو جوڑے
پہلے سے بٹھے تھے۔ ایک پارسی جوڑا تھا۔ ایک بھرتی۔ دونوں شراب
پانی نہ تھے۔

دیکھ کر آگے مجھ سے پوچھا۔ آپ کیا پیئیں گے۔

میں نے کہا۔ ٹھنڈا پانی۔

دیکھ کر ناک سکڑ کر گردن دھکی کر کے اپنی کالی نو سووار تاجو
چلا گیا۔ وہ دونوں جوڑے میری طرف دیکھ کر بڑی حسارت سے
مسکرائے۔ پھر انھوں نے گردن موڑ کے سیک میں اینڈ بوائے کے جینڈ کی
طرف دیکھا۔ جہاں سے ایک نیلے بلندہ ہوا تھا اور جہاں پسید و شریخ
لوگیاں چھوڑا ہوا تاجی قص فرامی تھیں۔ یہ لوگ ان دو دو گ جگہوں کے
سوا بالکل نکلی تھیں۔ اور بار بار دیکھتے گھمائی پھر تھیں۔ کبھی دانش
شروع ہی ہوا تھا کہ نیتاجی اندر داخل ہوئے اور ایک داکٹر کو گھبرا
اور رضا میں بندے ماترم کا نذر گونج اٹھا۔

کرنے کے لئے وقت ہے۔ آپ کو دیوے کے ایک غریب کلرک کی زندگی دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ ذرا دوش کے لئے میری کہانی سن لیجئے نا۔
 دیکھئے۔ میں ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام مل مانگو ہے۔ میں داد کیسین بئر ایک پر..... چمکے بیٹھے رہتا۔ دو چار آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنی کہانی سنا کر رہوں گا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ میرے گھر میں بچے بھوکے ہیں۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ جن کی بچھے شادی کرنی ہے اور میرا خزانہ چالیس پونڈ ہے۔ میں تو نیا جی کو اپنی کہانی مقرر سناؤں گا وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ اس پر بڑا اعلیٰ تھا۔ اور میری میر پر جو دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انوں نے غصے میں آکر برائے اندھ فوج لیا۔ اور دو ایک خوش پوش آدمیوں نے مجھے مارا بھی۔ پولیس آگئی۔ اور آفسر نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور کو لے کے تھانے میں لے گیا۔

میں سر ہلا کے ہنسنے لگا۔ تو تمھاری کہانی دباں کبھی کسی نے نہیں سنی۔

مل مانگو نے غصے میں آکر مجھ سے کہا۔ آپ نے مجھ کو دباں بھیجا تھا کیوں تھا۔ دباں کے فرصت ہے ان باتوں کا۔ آپ نے خواہ مخواہ مجھے ان کے عیش و آرام میں داخل ڈالنے کے لئے بھیج دیا۔ مگر اس سے کچھ ہوا محوڑی ہی۔ محوڑی دیر کے لئے بد مزگی پیدا ہوئی۔ پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔ جب میں دال سے باہر نکلا جا رہا تھا۔ سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اور ایک عین کے بیڈے نے اک نیا ہوا میں رقص شروع کیا تھا۔

مل مانگو نے سر ہلا کر کہا۔ اب میں دباں کبھی نہ جاناؤں گا اور وہ میری طرف پلٹھوڑے ٹوکے الگ بیٹھ گیا۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح۔ میں بہت دیر تک سر کھتا رہا۔ کچھ کچھ سن رہا تھا۔ اب کیا کروں اسے کہانی بھیجوں۔ آخر سوچ سوچ کے میں نے مسخروں والا لباس تیار کیا۔ اور اسے کہانی کو پہنایا۔ میں نے کہانی کی ستواں ناک کو ٹوکا کر دیا اس کے سرخ ہونٹوں کو سفید کر دیا۔ اس کی بے داغ تھوری بڑا یک بہت بڑا ماتا لگایا۔ اور اس کے سر پر ایک لمبے بھندے والی انگوٹی توپی چنا کر اس سے کہا۔ جاؤ۔ جہاں پر تھکے تھے بچے کھیلے ہیں اور بے فکر اور

معصوم روح میں سکرانی ہیں۔ یہ تنگائی ہوئی تھی دنیا بھاری پیاری پیاری کی کہانیاں سن گئی۔ اندھ ندکی میں پھر سے پرستانوں کی بہار آجائے گی۔ جاؤ۔ مسخرے جاؤ۔ تم دیکھ کی طرح ناچو، مہار کی طرح ڈنڈی جاؤ۔ اور بندہ کی طرح ناچ کر بچوں کی دنیا میں ہنسی کے فوارے پھال دو۔

مسخرہ اپنا گدھے کی جھول سنبھالتا ہوا مجھ سے رخصت ہوا اور کوئی پانچ چھ دن تک داپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا خلاف معمول اب کے کہانی لینی ہوگئی۔ میں تو اپنی ہی کہانیاں نہیں لکھتا ہوں اب کے کہانی کو کیا ہوا جو اس قدر لمبی ہوگئی۔ ابھی تک آئی نہیں۔ ہفتہ ہونے کو آبا۔ اتوار کے روز جب میں قریبی بازار صنفین کے جلسے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ کسی نے دروازے کی گندھی کھٹکھٹائی۔ میں نے دیکھا۔ مسخرہ ہے۔ لیکن کوئی ٹوٹی غائب ہے۔ ناک کوئی نہیں ہے۔ شور مچا رہا ہے۔ غائب ہے۔ گدھے کی جھول نہیں پہن رکھی ہے بلکہ سچا چہرہ والا لباس پہنے دروازے پر کھڑا لفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ میں نے کہانی سے پوچھا۔ مسخرہ میرے سامنے فٹ پر بیٹھ گیا۔ رائفل کو مقام کے

بولا۔ دباں کچھ ایسی ہی بات ہے۔

کیوں کیا ہوا۔

مسخرہ چپ رہا۔ بہت دیر کے بعد بولا۔

اب کے میں بہت خوش تھا سوچا تھا۔ خوب خوب لوگوں کو ہنساؤں گا۔ شیشین کے قریب ہی مجھے سات آٹھ سال کا بچہ مل گیا وہ میری طرف بڑی دھکی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا کہانی سنو گے بڑی اچھی کہانی ہے میرے پاس۔

وہ بولا۔ میرے پاس کہانی سننے کا وقت نہیں ہے۔ بکروں کی طرح

ماں باپ مر چکے ہیں۔ اور اب میں ریل میں شترے کی گولیاں میچتا ہوں۔

میرے ایک چھوٹی سی بہن بھی ہے۔ اسے دیکھو گے۔

وہ مجھے شیشین سے باہر لے گیا۔ ایک گدھے کی ایک بچی پر

تھی اور جب چاہا ہاتھ پھیلائے بیگ مانگ رہی تھی۔

وہ بولا۔ جب ہم لوگ گرجا میں تھے تو رات کو بڑی

اچھی اچھی کہانیاں سننے تھے۔ اب ہمارے پاس کہانی سننے کے لئے

وقت نہیں ہے۔ شترے کی گولیاں لو گے۔ ایک آنے میں چھ۔ ایک نے

میں چھ - ایک آنے میں چھ - پھر وہ کوڑک کے بولا - اگر تم اپنا لباس مجھے دیدو - تو میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے سترے کی خریدیاں خریدیں گے -

میں وہاں سے بھاگ نکلا

وہاں سے نکل کر میل ایک گلی میں گھس گیا - چند لوٹکے تینگ بنا رہے تھے - میں نے کہا - میں نہیں رنگارنگ تینگوں کو ادنیٰ قیمت ادنیٰ اڑانے کا طریقہ جانتا ہوں - یہ طریقہ میں نے زعفران دس کی پرک سے سیکھا تھا - زعفران دس کی پرک -

میں یہاں تک کہنے پایا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکا بول اٹھا - بڑے میاں کیوں ہمارا دنت خراب کر رہے ہو - ہم لوگ تینگ بناتے ہیں ، تینگ لٹاؤ گے نہیں ہیں - وہ دوسرے بچے ہونے ہوں گے - ہم لوگ اگر شام تک بچا پس تینگ نہیں بنائیں گے تو بھوکے مر جائیں گے - تم یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ -

میں وہاں سے نو دو گیا - رہ بیو گیا - اوڑھ لک گھر کے اندر گھس گیا - باہر دروازے پر تالا تھا - لیکن میرے لئے کھاروک ٹوک لگی - میں گھر کے اندر گھس گیا - کیوں کہ گھر کے اندر سے براہِ رچلے کی آواز آرہی تھی - اندر جا کے میں نے دیکھا کہ بندہ کانا بچہ ہے - مشکل سے چار سال کا لڑکا اور وہ ایک دودھ پتی بچی کو پیٹ رہا ہے -

میں نے سے کہا - بچے بچوں سے یہاں نہ رہو - بیٹے نہیں ہیں -

یہ رتی ہے - بچے - جواب دیا -

یہ کیوں رتی ہے - میں نے پوچھا -

یہ بھوک ہے -

اس کی ماں کہاں ہے -

ماں کا دھانے ٹٹسی ہے

باپ کہاں ہے -

باپ بھی کارخانے گیا ہے -

ماں اس کو کارخانے کوں نہیں لے گئی -

ماں کام کرتی ہے - دن کا - خانے لٹی ہے - یہ بھوک ہے - میں بھی

بھوکا ہوں - یہ روتی ہے - میں اس کو مار مارا ہوں -

میں نے کہا - اسے مارو نہیں - کیچو بھر ہم نہیں جڑی اچھی

کہانی سناتے ہیں - ایک تھا بادشاہ!

بادشاہ لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں - لڑکے کے کہا

تم سے کس نے کہا - میں نے پوچھا -
باپو کہتے ہیں - بادشاہ اچھے نہیں ہوتے - وہ بھوکا رکھتے ہیں -

اچھا تو ہم تمہیں پر یوں کی کہانی سناتے ہیں - وہاں بھوک نہیں ہوتی - پر یوں کا دس تڑا سند ہے - وہاں بڑے سندر مکان ہوتے ہیں - وہاں پر شہزادہ دودھ کی نہریں ہوتی ہیں -

آبا - دودھ - ہمیں دودھ ہی تو چاہئے - لڑکا اچھل پڑا - تم کہانی تو سنو -

نہیں - ہمیں دودھ دو - چار ہی بہن دودھ مانگتی ہے یہ دتی ہے - ہم اسے مانتے ہیں -

اور اس پر یوں کے دس میں ایک دن پریم کاراجہ
ہمیں پریم کاراجہ نہیں - دودھ چاہئے - پریم کاراجہ نہیں سنئے

ہم - دودھ - دودھ - دودھ -

لڑکا فزور زور سے رونے لگا - اور اپنی ننھی بہن کو بیٹے لگا میں جلدی سے وہاں سے نکل آیا - پھر وہاں نکل کر میں بہت سی بچیوں پر گیا - بہت سی بچیوں میں - باہاروں میں - گلی کو چوں میں - کھیتوں میں - جنگلوں میں - شہروں میں - دیہاتوں میں - کسی بچے نے میری کہانی نہیں سنی ، وہ بہریشان ہو چکے ہیں - نوٹے ہوئے جاچکے ہیں اور ان کی منہسی کھلا بھوکوں کی طرح مرجھانے لگی ہے -

تو اب تم یہ ساری کالیاں ہمیں کسوں آئے ہو؟
وہ بولا - اس لئے کہ اب میں لڑکا بننا چاہوں - اس ننھی کے لئے لڑکا

چاہتا ہوں - میں نے سنا ہے کہ میں اب اس کا کسان بنے گا - اس کا نام ہے - وہ اس ننھی کے لئے لڑکا ہے - اور میں نے یہ سنا ہے کہ اندر ویشیا بلی کی

فولاد بن کا کٹن ہے - اور وہ اس کے لئے لڑکا ہے - اور میں نے سنا ہے کہ

میلک کو ہار چہ مار گا کہ وہ اس کے لئے لڑکا ہے - اور میں نے سنا ہے کہ

برما اور ملا یاودھنہ بنی کے گلے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کے لئے لڑکا ہے - یہاں بھی اس ننھی کے لئے لڑکا ہے - اب میں ان کو بہتر

رکھا تو نہیں بننا چاہتا - ہنسلے والا سحر بھی نہیں بننا چاہتا - کمزور احتجاج کرنے والا - بھوک بھی نہیں بننا چاہتا - میں چاہتا ہوں کہ مجھے اکوئی ٹیسی کارٹس کی گونی بنا دو - اور مجھے وہاں بھیج دو - جہاں

انسان ، انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے -

سویرے سویرے

کبھی تو میری زندگی کے اُفق سے چھٹنگے یہ پُر جمل، خونیں اندھیرے
 شب تار کے تلکے آنچلوں سے کمانگ نہ برسیں گے نوری سویرے
 غریبوں کی کُٹیا ہو یا قصر شاہی یہاں بھی دھندلے وہاں بھی اندھیرے
 یہ دُنیا ہے یاں چین لینے نہ دینگے سماجی درندے رواجی لیٹرے
 گزرنے بھی دے یہ غبارِ منظم نکلنے بھی دیں یہ سلسلِ اندھیرے
 بڑی دیر سے منتظر ہیں ہمارے گلابی اُجالے شہابی سویرے
 چل اپنے لئے اب نئی راہ دھونڈیں کریں کیوں لحاظ رواجِ زمانہ
 یہ دُنیا کی رسمیں نہ تجھ سے نہ مجھ سے یہ دُنیا کے بندھن نہ تیرے نہ میرے
 مجھے اپنے دامن کی پٹائیوں میں جگ دے بھی دو اب رو پہلی اُجالو
 میری جستجو میں ہے ظلمت جہاں کی تجھے ڈھبہ ڈھبہ پھر سے ہیں اندھیرے
 وہ یوں روح میں ڈوبتے جا رہے ہیں وہ یوں میرے احسانِ بچارے ہیں
 فضا میں دبے پاؤں سولج کی کرنیں بکھر جائیں جیسے سویرے سویرے
 زمانے نے لی کیسی کر دٹ یہ حشری یہ کیا ہو گیا مسکراتے دلوں کو
 جو انساں کبھی تھے امینِ محبت وہ انسان اب بن گئے ہیں اُٹھتے

۴۵

مضطر اکبر آبادی غمِ زمانہ

خیالِ امروز، فکرِ فردا، غمِ محبتِ غمِ زمانہ
 عجب تماشا سا بن گئی ہے چین میں تعمیرِ آستانہ
 گزر گیا دورِ بند شوقِ سمٹ گئی گردشِ زمانہ
 جمالِ ساحلِ نظر سے اوجھل دھڑکیں فالِ اُدھم بھی فانی
 حقیقتِ مرگِ زیت بر کیوں لڑے ہو اُجھنے والو
 نہ اب ہے وہ دورِ ریتِ اریں شکرِ اریں آہِ واری
 اگرچہ میں خوش دلی سے سہارا زمانہ کے نازِ حیا
 یہی مری مختصر حقیقت یہی مرا مختصر فنا
 کبھی فنا نہ فنا حقیقت کبھی حقیقت کافنا
 جو آستانہ کبھی قفسِ تھاوی قفسِ آستانہ
 ہوا مخالفِ بصورتِ کشتی بہینا سب سے ڈوب جانا
 حقیقتِ مرگ بھی فنا نہ حقیقتِ زیت بھی فنا
 کین کا نام آگیا زباں پر کہ غم گئی گردشِ زمانہ
 مگر مجھے ہر قدم پہ مضطر فریب دینا رہا زمانہ

خواجہ غلام التبین

مشیر تعلیم حکومت یحییٰ

منہج کا اثر اخلاق و عادات پر!

کی انسان دوستی میں زمان اور مکان کی حدود کو توڑ کر ایک عالم گیر قوت بن جائے۔ یہ سچ ہے کہ آج بہت سے لوگ اس طرح کی بات کرتے ہیں۔ گو یا ہندوستان کی تہذیب کسی خاص قوم، کسی خاص نسل، جماعت یا مذہب ہی گردہ کی خاص ملکیت ہے۔ جہاں بعض نام کی چیزیں زیرِ مکتبی شامل ہو گئی ہیں، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ تہذیب کے ٹکڑے نہیں کٹے جاسکتے۔ اگر آپ انسانی خون کو اس کے اجزائیں تقسیم کر سکیں، نفع میں سے اس کے زیرِ دم کو جدا کر سکیں، خوب صورت ریشم کے ٹکڑے کا تانا بانا الگ کر کے دکھا سکیں، ادب کی شیرینی، اثر اور قوت میں سے مختلف جماعتوں کا حصہ الگ الگ نکال کر دکھ دیں، اگر آپ یہ سب کچھ کر سکیں اور خون، خون ہے، نندہ، نندہ رہے۔ ریشم، ریشم رہے۔ ادب، ادب رہے، اس وقت آپ ہندوستانی تہذیب کے بھی حصے بخرے کر سکتے ہیں۔ اور اس کو خالص درپور بنانے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔

خیر، کوئی ایسا تھا کہ جس تہذیب کی مدد سے (جنس) اور تاریخ اس قسم کی ہو، اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ مغرب کا اثر قبول نہ کرے خصوصاً جب مغرب کی تہذیب ایک حاکم قوم کی تہذیب بن کر گئی تھی۔ عربی کا ایک مشہور قول ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے راستے پر چلتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن یہ ایک دم نہیں ہو گیا بلکہ اس کی ایک دیکھ بھال رہے جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ ابتدا میں انگریز تاجروں اور مشینوں کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہندوستانی اس وقت اپنی تہذیب کو بہت بلند سمجھتے تھے۔ اور مغرب سے آئے ہوئے یہ لوگ، جن کی

ہندوستان پر مغرب کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مناسب موقع ہے کیونکہ ابھی ہم حال ہی میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ اس طے میں باوجود اس سیاسی کشمکش کے جو ہندوستان اور برطانیہ میں ہوتی رہی، مغرب نے ہماری تہذیب اور تمدن، ہمارے رہنے، ہماری زبان اور ادب، ہماری ذہنی اور فنی سیرت پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تقریباً اس سلسلے میں اس کے مخالف پہلو آپ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میرا کام آج یہ ہے کہ مغرب نے ہمارے اخلاق و عادات پر جو اثر ڈالا ہے اس کا تجزیہ کروں۔ زندگی کو بنانے اور عمر کے ساتھ چلانے کا ایک سہرا اصول یہ ہے کہ ہم اچھی چیزوں کو اختیار کر لیں اور بری چیزوں کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ اب جب کہ آزادی نے ہمارے سامنے ترقی کے راستے کھول دیئے ہیں اور ہم ایک نئے تمدن اور نئے سماج کو بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ بے لاگ طریقہ مغرب کی میراث کی جانچ کریں اور اس میں جو اچھی چیزیں ہیں انہیں کھلے دل سے اپنائیں۔ ہماری ہندوستانی تہذیب تو اس بات پر ناز ہے کہ اس کا دامن مختلف اثرات کو توڑ کر بننے لے لے کھلا رہا ہے۔ اور اس نے ہمیشہ ان کو ہم آہنگ کر لیا کہ جو شش کی ہے۔ اس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں سے اچھی چیزیں لیں اور ان کو جو کہ وہ جہاں ہم آہنگی پیدا کی وہ جہاں تاج محل کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کہیں تاج محل کی نمونہ بنی ہوئی ہے کہیں کبیر اور مانا سنگ کی نمونہ بنی ہوئی ہے۔ کہیں دکن کی لکھا جی تہذیب کا رد ہے اختیار کرتی ہے۔ کہیں ٹیگور اور قبائل کی شاعری میں دل سے بھلائی ہے۔ کہیں بنگالیوں کی انگریزی کی نظموں اور جواہر لال کی بین الاقوامی سیاست میں ظاہر ہونے والی ہے اور کہیں ہانگ کانگ

چڑی گوری تھی، اور جن کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب پر سے الگ تھی۔ انھیں کبھی عجیب اور مضحک سے معلوم ہوتے تھے۔ اگر آپ انھیں دیکھیں اور انھیں صدی کی نگاہ سے دیکھیں تو آپ پر ہنس پڑے گی۔ یہ دیکھیں گے کہ ہمارے کھانے والے اور دشواران کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ میں سیاسی قوت آتی گئی، اور ملک کے حالات سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس تبدیلی سے ساری صورت حال ہی بدل گئی۔ ان کا لباس جب سے ڈھنگ کا بن گیا، اب تہذیب اور شان کی علامت بن گئی، ان کی زبان، حکومت کی زبان بنی، اور اس کی فعل کرنا کمال سمجھا جانے لگا۔ جبری کاٹنے سے کھانا، جسے ہمارے زرگر بڑا سمجھتے تھے، اب فیشن میں داخل ہو گیا۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، ہر پتے پتے کے ڈھنگ نئے بن گئے ہیں۔ دھنچک شروع ہوئے۔ اور شیشہ زندگی میں لگ کر نئی تعلیم یافتہ لوگوں نے انگریزی تہذیب کی فعل شروع کر دی۔ وہ اس کی نقلی ہری جگہ تک سر اس قدر چکا چوند ہوئے کہ انھیں اس کے مقابلے میں اپنی چیزیں گھٹا اور نقلی معلوم ہونے لگیں۔ ان میں سے بعض کی سب سے بڑی آمد و رفت بھی کہ زمان کو مر دگر انگریزی اس طرح بولیں کہ نادر آدھی انھیں تازہ دلالت اور آکسفورڈ کی سپردا دیکھیں، ان کے بتلون کی کرنا اور اپنے بزرگوں کی تلوار سے زیادہ تیز ہو، کیڑے لندن کے سٹے ہوئے اور پیرس کے ڈھلے ہوئے معلوم ہوں۔ اپنے میل جول کے طریقوں اور آداب نشست و برخاست میں بھی انھوں نے اپنی تہذیب کی روایات کو چھوڑ کر مغربی طریقے جو ایک دوسرے ماحول کی سپردا داری تھے، بغیر سوچے سمجھے، بغیر تنقید کے اختیار کر لیے جس وقت انیسویں صدی کے آخر میں سال گزار دی گئی تھی، ہندوستان کی تعلیم یافتہ نوکری شیشہ چاہت مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

لیکن اس دور کی بڑی غرابی یہ تھی کہ انھوں نے اپنا لباس اور وضع قطع بدل لی بلکہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو اپنی قومی خودداری کو، اپنی عزت نفس کو بھلا بیٹھے، اپنی ہر چیز کو حقیر اور مغرب کی ہر چیز کو برتر سمجھنے لگے۔ دراصل غلامی کا اثر تھی قوم کی سیرت اور اخلاقی وعادات پر ہمیشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ایک آزاد خود مختار ملک میں وہ لوگ عزت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں جو ملک کی خدمت اور صلاح کی سپرد کرتے ہیں۔ سائنس، ادب، فلسفہ، آرٹ وغیرہ میں نام پیدا کرتے ہیں۔ انھیں کو بڑے اعزاز اور عہدے ملتے ہیں۔ لیکن ایک غلام ملک میں ان چیزوں کی کوئی خاص پوجہ نہیں ہوتی۔ وہ ان بڑائی ناموری اور سرداری میں ان لوگوں کے لئے ہے جو ملک کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ ان کے مفاد اور غرائف کی خدمت کرتے ہیں، حکومت قوم کو دبا کر رکھتے ہیں اس کی مدد کرتے ہیں اور خوشامد، جھوٹ اور ناحق کا ساتھ دے کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ حکومت اپنے لوگوں کی دل سے عزت نہیں کرتی۔ لیکن اپنی غرض سے انھیں آگے بڑھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جن حکومت نے بددلوں، گھماندہ صی، جواہر لال، مونی لال اور لاجپت رائے، سی۔ آر۔ داس، ابوالکلام، اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور محمد علی جوہر میں ہندو کی اور ان کے ساتھ سیاسی اچھوتوں کا سلسلو کیا اس سے بہت سے ایسے لوگوں کو عہدے اور اعزاز دئے جو طاقت، دیانت داری اور فخر پرستی قوم پرستی اور سیاسی سوچہ بوجھ میں ان کے پاس کبھی نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن میں نہایت سخت اصول پرستی، دلچسپی اور انشاری صلاحیت نہ تھی، ذلت کے آسان اور آرام دہ راستے کی طرف پھسل پڑے اور اس زمانے میں پہلے تعلیم یافتہ انگریزوں خزان طبقے میں خوب ملن اور با اصول لوگ کم درجہ اور اب وقت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان میں قومی خودداری کے بجائے خوشامد سچائی کے بجائے مصلحت پرستی، بہادری کے بجائے خوف، قومی ضرورت کی لگن کے بجائے خود غرضی کی جڑیں پکڑ گئیں۔ ان کو عوام کے ساتھ یک جہتی کا احساس نہیں تھا اور خود کو ایک الگ ذات سمجھنے لگے اور بجائے خن کا دکھ درد مٹانے اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے خود اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ مغرب کے اثر کا ایک ترین پہلو ہے۔

لیکن شروع سے ہی اس تحریک کی مخالفت بھی ملک موجود تھی۔ جو مختلف شکلوں اور مختلف وجوہ سے ظاہر ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں بھی بعض گروہ ایچے تھے جو کسی دامنوں اپنی تہذیب اور اپنی روایتوں کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر مسلمانوں کی ایک نہ ہی جماعت تھی جو مغربی تہذیب اور عیسائی مذہب کے پرچار کو ایک دوسرے سے وابستہ سمجھ کر چاہتے تھے کہ

مسلمان انگریزی تعلیم، انگریزی زبان اور انگریزی نوکریوں سے بالکل الگ ہیں۔ اگر آزاد آدمی نے اپنی شاعری میں ان کو کچھ کا پتہ کھٹا، خاکہ، اثر پایا ہے۔ جو مغرب کی اندھی تقلید میں گرفتار تھے۔ اور نذیر احمد نے اپنے ناول میں اہل وقت میں اس تحریک پر تنقید کی ہے۔ لیکن اس کے خلاف جو زیادہ گہرا اور با اثر رد عمل شروع ہوا وہ ہماری سیاسی ساری کامیابی کا ایک پہلو تھا، اور اس نئی تحریک کی قیادت، جس کا مقصد ہندوستان میں سچی خود ارادی پیدا کرنا تھا، گاندھی، ٹیگور اور اقبال کے لیے۔

ان تینوں جہازوں میں کوئی بھی مغرب کا مخالف اور اس کی ہر چیز سے برا نہ تھا۔ انھوں نے خود بہت کچھ مغرب سے حاصل کیا تھا، مادہ اس کی اچھی اور بیادہ چیزوں کی تکرار کرتے تھے لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ کوئی قوم ذہنی اور مذہبی غلامی کی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنی خودی کا، اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کو جرأت اور روشن خیالی کے ساتھ مغرب کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس میں جو باتیں صفا صفا ہیں ان کو لگانا چاہیے جو اچھے چرس ہیں ان کو اپنی تہذیب میں شامل کر لینا چاہیے۔ ٹیگور نے ہندوستان کو، اس کی تہذیب اور آرٹ کے خزانوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے اخلاقی اور روحانی اصولوں کی یاد دلائی اور مغرب کو انسانیت اور محبت کا پیش نما کر ہندوستانوں میں اسے فروغ بخشا۔ اس کا احساس پیدا کیا۔ گاندھی جی نے ان تمام اثرات کے خلاف جہاد کیا جنھوں نے ہندوستانی سیرت کو کمزور اور ان کی قوت عمل کو مشکل کر دیا تھا انھوں نے لوگوں کو عیش پرستی کے بجائے سادگی، لاپرواہی کے بجائے سادگی، سادہ کا سبق دیا۔ ان کی تحریک کا مقصد تھا کہ لوگوں میں ایسی سیرت پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں اس کی دنیا میں ناس لے سکیں، اور اس کی حفاظت کر سکیں۔

اقبال کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک کوئی فرد یا جماعت اپنی خودی کا گہرا تجربہ نہیں کرے تو اب اور سچی نہیں پیدا کر سکتی وہ کمزور اور بے اثر رہتی ہے۔ غلامی، تقلید اور رسوا کی حالت نے ہندوستانوں کو بے بس بنا دیا تھا اقبال نے انھیں خود اعتمادی و سرمدی کی تعلیم دی۔ انھیں سب بات کا لگ بھگ ہے کہ ہندوستان نے اپنی تہذیب، لاپرواہی، آزادی کا مونی کو گرہ لگا دیا اور غلامی کی زنجیروں میں لپکے اور ان کو شکایت مغرب سے نہیں بلکہ خود ہندوستان سے تھی۔

معلوم ہے کہ ہندو کی تقدیر کو کتاب نمک: بے چارہ کی تاج کا نام ہے جس نے جان بھی گریو، بدن بھی گرد غیر: انوس کا بیانیہ نمک ہے جس نے یورپ کی غلامی پر غما مند ہوا تو!

تھو کو گلا گھڑے سے ہے یورپ سے نہیں ہے اس لیے ہم اب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ جب اپنی خوشی اور عقل کے مطابق مغرب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، انگریزی ادب اور انگریزی فکر کی دولت سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے ڈھنگ، سائنس اور دکانگری کے جدید آلات اور دپانیشن، مکان، لباس، خورد و خوراک، سیر و تفریح میں نئے راستے، سفر کے نئے طریقے، اور صنعت و حرفت کی نئی مشینیں، ان سب نے چلنے کے خیالات اور عادات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یورپی تہذیب کا جدید لوازم مل کی طرف دلچسپی، موٹر، ہوائی جہاز، ڈاک، تار اور کارخانے چلنے والی مشینیں شامل ہیں۔ دوسری طرف طلباء کے نئے نئے ڈھنگ اور سرکاری کسٹے نئے آلات، تیسری طرف ملک کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ملکی طریقے اور جو بھی طرف اخبار، پچھی ہوئی کتابیں، مگر مومنوں، ریڈیو اور سینما، خبر کے درپور لوگوں کی تعلیم و تفریح کا انتظام کیا جانا ہے۔ یہ ہماری زندگی میں کیا ہوئے ہیں اور اس کا رنر انہی مطلب ہیں کہ وہ ہماری مادی و معاشی زندگی میں گہرا اثر ہے۔ بلکہ ان سے ہر ایک نے چلنے والوں اور عاداتوں پر اثر ڈالا ہے، اور ان کو تسلسلے میں دھکا ہے۔ جو آدمی لیگاڑی کو چھوڑ کر پٹرولین میں غرق نہ ہو وہ صرف نا فائدہ کوئی تیزی سے طے نہیں کرتا بلکہ دوسرے ملکوں کے دروہوں کے مستحق اس کا نقطہ نظر بھی بدل جاتا ہے، اخبار سے دنیا کے حالات بھی باخبر کھتے ہیں اور اکثر اس کی ذہنی آزادی بھی چھین لیتے ہیں۔ ریڈیو اور سینما، اس کا دل بھی بھلاتے ہیں لیکن اکثر اس کی عقلی قوتوں کو کم کر کے اس کی تفریح کو مشینی بنادیتے ہیں۔ یہ سب اثریں ہمیں جہتے ہیں، اچھے اور بُرے، لیکن، بدقسمتی سے اب تک ان چیزوں کے ساتھ غلامی کے رہنے کا نہ کبھی ملا ہوا تھا۔

اب ہم اس اثر سے آزاد ہو کر ان کو اپنی تہذیب کی قوت اور لذت میں شامل کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ہم اس معاملے میں تنگ نظری کا ہم نہیں لیں گے، ہندوستان کی تہذیب ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے۔ اور اب اس زمانے میں جب بین الاقوامی میل جول بڑھ گیا ہے ہم اپنی بڑی مدد اہل کو کر نہیں سکتے ہیں ان میں روزیہ دہان والی ہوگی (دہاجنرٹ آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

ایک پرتو

قمر کی فرحت نوا زکریاں لئے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی محو خواب ہوں گی وہ سُرگیں غم فروزا نکلیں
ہر اک شجر سو گیا ، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہر ایک شاخ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں باہیں !
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریبِ صبح بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیل سے ایک پرتو ابھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تہا سے کھینچتی ہیں مال ہو کر
یہ شب کی حسرت بہ دوشِ سستی ہو چھوڑ دیتی ہے آزار ؟
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے
حسین امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے

غزل

سلام پھلی شہری

آجکل جس سے کچھ شکایت ہے یا سہیں مخ ہے ، سر و قامت ہے
شاد مانی زندگی معلوم پھر غمِ زندگی کی حسرت ہے
مجھ کو دیکھو ، سجو ، پھلو پھلو آئینے کی بھی کیا ضرورت ہے
انہیں اُجڑی ہوئی نگاہوں سے گلستاؤں کی زیب و زینت ہے
یہ غزل کچھ نہیں سلام ! مگر ہم نئے شاعروں کی جرأت ہے

کچھ فسانہ کچھ حقیقت !

بہت سے معنوں بھی افانے ہوتے ہیں لیکن افانہ معنوں سے مختلف ہے۔ یہ معنوں میں منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، جذباتی ارتقا کی جگہ منکر کی ارتقا ہوتا ہے۔ ترقی ہی ہتھیارا فسانہ پر از بھی اختیار کرتا ہے لیکن اس کا افسوں مختلف ہے، وہ منطقی اور علم کی کرامات دکھاتا ہے۔ کچھ فسانہ پر از ایسے بھی ہیں جو شاعرانہ اظہار خصال سے جذباتی ترقی کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ یا تباری کو رہا رہا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بددیانتی ہے چونکہ معنوں کا کام دفنی طور پر متاثر کرنا نہیں ہے۔ اس لئے ہر جو جس معنوں ایک قسم کی خطابت جو جس کا لفظی فقر پر اور شاعر سے ہے۔ یہ معنوں وہی معنوں ہے جس کی عمارت کی تمام انیس بنیادیں دراصل اس سے تیار کی گئی ہیں اور جس کے گارنٹی دہن منظر خلق کا ماتھے ہو۔ پھر بھی یہ چیزیں ہی معنوں کو اچھا نہیں بنا سکتی ہیں۔ تاؤ دیکھا اچھا لکھنے والا صاحب اسلوب نہ ہو اور اس میں زبان کی اتنی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنے خیالات کو دماغی صورتوں میں ڈھال سکے۔ دراصل یہ کام فن کار کا ہے اس لئے اچھا معنوں کا وہ نہیں ہو سکتا۔ جو فن کار نہ ہو۔ پھر بھی آپ معنوں کو افانے سے پہچان لیتے ہیں۔ خواہ آپ میں جاننے کا یہ سبق ہو یا نہ ہو کہ آپا معنوں نگار نے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے یا واقعی اپنے ذہن کو دوسرے کے ذہن سے ملایا ہے ان الفاظ کے علاوہ اگر آپ معنوں کی تعریف کرنا چاہیں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ معنوں کا ایک بنیادی خیال ہوتا ہے جس کا وضاحت اور تشکیل میں درہریت سے خیالات کی بددیانتی ہے اور عین اس خیال کی تشکیل جو واقعی ہے تو وہ معنوں ختم ہوتا ہے۔ برے معنوں کی پہچان صرف مزید زحمت برہمی نہیں ہے۔ بری منطقی، برقعہ دار بیانات، منطقی تسلسل کی کمی، مرکز خیال سے ہٹ کر دوسرے

افانے کی تکنیک پر انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں ہیں۔ اور ان تمام کتابوں نے افانے کی میت پر کافی زور دیا ہے۔ لیکن شواہد تو یہ ہے کہ افانے کی تکنیک نے مواد سے ہم آہنگ ہو کر ہمیشہ بدیلتی رہی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کلاسیکی انداز میں افانے کی تعریف اور اس کے قواعد و منوالطاعتیں بھی کر دیں تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ تمام افانہ جن کے قواعد اور منوالطاعتیوں نے بنائے تھے آج کچھ اس طرح بدلے نظر آ رہے ہیں کہ اگر آپ اس کلاسیکی معیار پر جانچ کر کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی مایوسی ہوگی۔ ڈرامے کو لیجئے، اس کی صورت پر ان میں گہرے بھی تو کھینچنے کے کڑیاں۔ جب یورپ میں احیاء علوم کا زمانہ آیا تو نو کلاسیکی تحریک کے ذہن میں پرانی ڈرامے کے بہت سے قواعد کو برتنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ مایوسی اور یوں اس کی سخت مخالفت کی پھر تو ڈرامہ زمانہ و مکان اور اصل کی وحدت سے بھی آزاد ہو گیا جب وہانیت سے حقیقت نگاری کا دور آیا تو ڈراما صناعی مباحث کا ترجمان بن گیا۔ اگس اور برنارڈ شا پید ہوئے۔ بیویں صدی میں یہ تغیر ہو کر مختلف نوعات کا حامل بنا رہا لیکن ان تقیوت میں کوئی نہ کوئی چیز ثابت اور پابندہ ضرور رہی ہے۔ آپ ڈرامے کو افانہ نہیں کہتے ہیں خواہ وہ صرف پڑھنے ہی کے لئے کیوں نہ لکھا جائے۔ آپ پانچ ایچ کے طویل ڈراموں کو ادلی بھی نہیں کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے کی کوئی نہ کوئی خارجی میت ایسی ضرور ہے جو باوجود تبدیلیوں کے ابھی تک اپنی جگہ برقرار ہے اور آپ ایسی میت کی بنیاد پر اسے دوسری معنوں سے متاثر نہ کر لیتے ہیں انھیں معنوں میں افانے یا کہانی کی بھی ایک خارجی میت ہے، اور اس خارجی میت کو قائم رکھنا افانے میں بہت ضروری ہے۔ وہ خارجی میت کیا ہے؟ کہانی کی ابتدا اور ختم ہونا؟ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو

خیالوں کو اہمیت دینا یہ تمام چیزیں ایک مضمون کو ناقابل قبول اور نہ بڑے جانے کے لائق بناتی ہیں حالانکہ مضمون سب سے نیا وہ آزاد صنعت ہے، آپ ٹیم پر مضمون نگہ کر سکتے ہیں۔ نظریہ اضافیت کو سمجھا سکتے ہیں، مغز شاعری سے بحث کر سکتے ہیں اور صفحات کے اسٹیج پر بکھرے ہوئے کٹر بریگی کر سکتے ہیں۔ اگر کم اچھے بڑے مضمون کو پہچان سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہانی کو پہچان نہ سکیں۔

پہلا بیان۔

کہانی کسی مرکزی خیال کی ترجمان نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ مرکزی مضمون (THEME) کے ارتقا کا نام ہے۔ اس بیان کے تحت کہانی کے لئے کسی بے بنائے ہوئے پلاٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلے سے مرتب کئے ہوئے پلاٹ میں ایک مضمونیت پائی جاتی ہے۔ یہ مضمون کا منطقی ارتقا ہے۔ پلاٹ خود دنیا بنا کر اسے دیکھنے کے لئے ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی تخلیق کے موقع پر کہانی کے آدھے تہائی حصے کا پلاٹ ضرور متعین ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کاغذ پر آنے کے بعد اس پلاٹ کی اہمیت بدل جائے۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں قابل غور ہیں۔ کہانی میں زندگی کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے اور زندگی کبھی بھی مرتب نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کا اختتام ہمیشہ درامائی انداز میں ہو کر رہتا ہے پھر کہانی کے اختتام پر کسی درامائی کیفیت کو تلاش کرنے کے کیا سہمی ہیں۔ اگر یہ درامائی کیفیت خارجی ہے تو یقیناً یہ ایک عجیب ہے لیکن اگر داخلی ہے تو اس سے کہانی کا لطف دوہلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا بالعموم زندگی کی دو متضاد طاقتوں کو پیش کرتا ہے۔ یا پھر بہت سے متضاد عناصر میں کسی ایک عنصر یا جذبے کی سمت تلاش کر لے۔ متضاد عناصر کے ٹکڑے زندگی کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ یہ ٹکڑے خواہ آخر میں ہو یا کسی اور جگہ کہانی کو ڈرے سے قریب لاتی ہے لیکن اس چیز کو کہانی کی بنیادی خشت نہیں بنائی جا سکتی ہے کیونکہ کہانیاں نکلنے نکلنے تاثرات کے ذخیرے سے بھی تخلیق کی جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ تاثرات ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرا بیان

کہانی کے لئے کسی کردار نگار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بیان میں بھی حقیقت ہے کہ کہانی صرف فن کار

کے ذاتی شاہد سے بھی بن سکتی ہے۔ وہ صرف کسی وقت کی تصویر کچھ کچھ لکھتا ہے، یا کسی جگہ سے باہر کسی کی غیر شخصی داستان بھی بیان کر سکتا ہے۔ مثالی طور پر کرشن چندر کی "پنڈ اور اکپرس" کو لیجئے۔ یہاں ریل گاڑی کا ہی سب سے بڑا بیان کرتی ہے۔ جس کے بیان میں کوئی خاص آدمی اور کوئی شخصیت نہیں ابھرتی ہے۔ صرف بربریت کا مظاہرہ میں کے کچھ طنزیہ انداز میں فن کار کا داخلی عمل موجود ہے۔ آپ اسے کہانی مانتے ہو تو سمجھیں لیکن اس قسم کی کہانیوں کی مثالی ہمارے تحت کے لئے مفید نہ ہوں گی۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے کہانی کی مختلف قسموں کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ کیونکہ کیا کیا دانتے سے متعلق لکھی جاتی ہیں چنانچہ ان کہانیوں میں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی ہوتی ہے۔ کچھ کہانیوں میں صرف کردار نگار کا ہوتی ہے لیکن ایسے موقع بھی کر بڑے کٹر کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کہانی کے کیڑے سوس پڑیں آسکتا ہے۔ بڑائی کیا کیا اے اس موضوع کو کچھ اس طرح بناتے ہیں۔ حکمرانی کی طرف کیوں کر ایل ہوا، زید اپنے کٹر کردار کو کیوں کر سمجھا نہی کیا کیا اس موضوع کو دوسری طرح بناتے ہیں، وہ برے کردار میں جو سوں کے لئے ڈھونڈتی ہیں، برے کردار کے سماجی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ مثلاً اور سید سی اس ذیل میں ہے کہ ۵۱

عصمت نصیاتی ان کہانیوں پر مبنی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن کرشن کے یہاں کردار کی اہمیت بالکل ضمنی رہتی ہے کرشن کچھ اس طرح سوچتا ہے۔ شخصیت کی تشکیل مادی آسائش اور محنت کا گونا گوں کیفیات ہی کے ہندسے ہیں۔ ایک وہ شخص جس نے نہ تو بہت بھر کر کھانا کھا یا ہے اور نہ دل کھول کر محبت کی ہے اس کے کردار ہی کیا، کرشن اس طرح سے شخصیت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ وہ موجودہ شخصیتوں سے کم بحث کرتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی امکانات، اور شخصیت کی بھرپور تکمیل کا ایک خواب پیش کر لے۔ وہ کالوہنگی پر کہانی نہیں لکھتا ہے کیونکہ کالوہنگی نے نہ تو عشق ہی کیا ہے اور نہ بہت بھر کر کھانا کھا یا ہے۔ یہ کرشن چندر کا بالکل اچھا انداز ہے جہاں وہ بڑائی حقیقت نگاری سے اپنے کو الگ کر لیتا ہے۔ کرشن کو اپنے کردار کی منفرد خصوصیات نہیں ملتی ہیں وہ اپنے کردار کے ان احسانات اور تعلقات کو پیش کرتے لگتا ہے۔ جو اظہار کی برکت سے محروم ہے جس کرشن اس شری وجدان کو اچھی طرح نباہ لیتا ہے کہ اس کے اسلوب میں شریعت اور گداز ہے لیکن کہیں کہیں رانخلان کا موقع بھی دیتا ہے۔ پھول سرخ ہیں "اس کہانی کو کیجئے۔ اندر سے

کو بھول ہے اتنی محنت جو جاتی ہے کہ اس کا وہ انداز شعری ہے جا ملتا ہے
پڑھنے والا بوجھ سکتا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ شاعر جواب دے سکتا
ہے۔ لیکن فائدہ نگار کے لئے ذرا وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ ذرا
کے سماجی اور سیاسی شعور کی صورت میں اس کا حال رکھنا بہت ضروری
ہے کہ ہم اس کی ذہنی سطح سے اور پرواز کریں۔ ذہنی سطح پر وہ کر
سکتی ہیں اپنی ناول کی حقیقت پیش کر سکتے ہیں۔

تیسرا بیان

کہانی کے لئے کچھ بھی ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک شعوری
تعبیر ہے جو غرضاتی ہے، اس کے کھٹکوں کا درست ہونا بھی ضروری
نہیں ہے۔ اس دعوے کو اس بیان سے تقویت مل سکتی ہے کہ کردار،
پلاٹ اور ایسی قسم کی تمام چیزیں صرف موضوع کے رتقاء پر چلی جاتی ہیں
اس لئے ان کی حیثیت منفی ہے۔ لیکن چند چیزیں لازمی ہونے
چاہئے کہ اس میں ہیں۔ ہر ادیب اپنے ہی لاشعوری روئے پیش کرتا ہے وہ
تحلیلی بھی کرتا ہے تو اپنے ہی خیال سے کام لیتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں
مفہم کا بھرا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ لے تری ہی میں بھی ایک مفہم رہتا
ہوتا ہے لاشعوری روئے کے لئے یہ بتانے ہیں کہ لاشعوری دنیا ایک

۵۲

پراسرار ہستی ہے جس کا کوئی کنارہ اور نہ ساحل۔ یہ انشائیں
ہے اور جب انشائیہ کو ایک خارجی جسم دیا جاتا ہے تو وہ جوت میں تبدیل
ہو جاتا ہے۔ انشا کو قائم رکھنے کی اس سے بڑی اور کیا کوشش ہو سکتی
ہے۔ صحت ہی کو شاعری سمجھنا، تھا ان شنیوں کو بھی شاعری کا لانا
کھینچے گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان شنیوں میں شاعری کا کارنامہ
موجود ہے لیکن بلاغت کے وہی مواقع بتائے جاتے ہیں جہاں قفے
کے مختلف پہلوؤں کو نظری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر
چلتا ہے کہ صرف کلاس کو زور دے کر کے صلاحیت ان قصوں کی
خوبی کی حامل ہے۔ نگار بلاغتیات اس سے زیادہ اہم ہے اور یہ
مطالعوں قفے والی شنیوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کی غنوی
کے مقابلے میں جس کی شنیوں کیوں بھی ہے، اس کا جواب ہی مطالعہ
فصل اور مطری انجانہ ہے۔ میر نے واقعات اور نفسیات کی حالت
پر زور دیا ہے۔ شہزادی ادیرکینز کے کرداروں کو سفر و حیثیت
ہے پیش کیا ہے۔ تیسرے ایسی داخلیت کو شنیوں میں اس قدر اہم
کہ کہ پیش کیا ہے کہ وہ قفے کی ناجائز کو وہن لادتی ہے۔ کوئی
بھی ہر دہرہ، کوئی بھی ناول یا کہانی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی

جب تک کہ مصنف نے خود کو شعوری ہر قفے سے الگ نہ کر لیا ہو۔ وہ کہتا
اور موضوع کی تخلیق ہی اس لئے کرتا ہے کہ اس کا مخصوص نقطہ نظر اور اپنی
مخصوص ناول حقیقت کو دوسروں کے سامنے پیش کرے پھر اسے جا
دیا کہ وہ ان کے درمیان مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب
ایک شاعر کسی قفے کی تخلیق کرتا ہے تو اس کی پہلی توجہ موضوع کا نقطہ
پر ہوتا ہے اس نے قفے کو نظم و عبارت میں کیوں پیش کیا؟ اس کا جواب
یہ نہیں ہے کہ وہ شاعر کا ناچا تھا ہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے اندر ذاتی محنت
محسوس کرتا ہے کہ نظم میں شکر کا سزا پیدا کرنے یا پھر وہ نظم و حیثیت
سے پیش کرنے کو اپنے لئے زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ کوئی منظم نثر لکھ
کوئی نثر منظم لکھ، شیعہ اور ایسی قسم کی دوسری تخلیقی کوششیں
صرف موضوع ہی کے تعقیبات پر راجحی کا سکتی ہیں۔ فصاحت
بیان اور زبان تو بد میں بھیجی جائے گی۔ اگر اس تخلیق میں دوچار
ملکولے شاعری کے کچھ ہیں اور شاعر موضوع کو نہیں نباہ سکا
ہے تو ہم اس کی پوری کوشش کو ناکامیاب سمجھتے گئے۔ لیکن جو یہاں
چاہئے ہے انشائیں میں بھی تاثر رہتا ہے۔ میں لکھی کہانیوں
کو کہانی نہیں مانتا ہوں تاہم انشائیں کوئی (PATER N)
نہ رکھا یا جائے۔ اس کی کوئی مخصوص سمت نہ دریافت کی جائے۔

اور اگر (PATER N) درست پیدا کیا جاسکتا ہے تو یہ انشا
ٹرسے گا کہ ایک شعوری کوشش ہے۔ جس میں صرف ناول حقیقت
کی کوشش کی جاتی ہے اور جب یہ شعوری کوشش ٹھہری تو پھر کوئی وجہ
نہیں معلوم ہوئی کہ ہم ان کہانیوں میں کہانی کیوں نہ دریافت کریں
کیوں کہ ہر شعوری کوشش کا ایک معنی ہوتا ہے۔ اگر انشا
کو حقیقت سمجھ کر اس کی نقل اٹانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر تو حقیقت بھی
موضوع بحث میں جاتی ہے۔ یہ انشا کس کلمے، معنی کا کسی خاص طبقہ کا
اگر صرف نصف کا ہے تو وہ اپنے انشا سے دوسروں کو کیوں متاثر کرنا چاہتا
ہے۔ یہاں چہرہ بھی بھولنا چاہئے کہ وہ نہ اپنے انشا کی تعبیر ہی
نہیں کھینچ رہا ہے۔ بلکہ وہ اپنے اس طرح نظر سے متاثر بھی کرنا چاہتا
ہے جو اسٹیل انشا کی تخلیق میں حصہ لے رہا ہے۔ ایسے ادیب موضوع
اور فن دونوں ہی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخری بیان

کہانی کی ایک ناجائز ہیئت ہے جس کے زیر کوئی بھی کہانی کہانی
نہیں کی جاسکتی۔

یہ خارجی حیثیت کہانی کا (MEDIUM) نہیں ہے کیوں کہ کہانی شریں بھی لکھی جاسکتی ہے اور نظم میں بھی۔
 شکستہ کے بہت سے ڈرامے منظر میں بھی کئی بار ادا ہوئے ہیں۔
 کہتے ہیں، اردو اور فارسی کی بہت سی نئیوں، داستان یا قصے کے ضمن میں آئی ہیں۔
 بات ان قصوں اور کہانیوں کے لئے صحیح ہے جنہیں نثر میں پیش کیا گیا ہے۔
 پہلے مضموع کو جانچے کہ آیا کہانی لکھنے والے نے اپنے مضموع کے ارتقاء میں تمام جزئیات سے کام لیا ہے کہ نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو کوار کے نیچے رکھتا ہے کہ نہیں، واقعات کے بیان کرنے میں حرجیت کو قائم رکھتا ہے کہ نہیں؟ اگر وہ اس کو پورا کر چکا ہے تو پھر انداز بیان کو جانچئے۔

آج کل بہت سی ایسی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جہاں کہانی کی خارجی حیثیت انداز بیان کی رنگینی میں کھوجاتی ہے آپ بھی شریں کی تعریف کرتے ہیں تو کبھی شاعری کی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس کہانی کا مضموع ہے جو صحیح معنوں میں فن کار کی تحقیق ہے۔ اگر ہم نے فن کی اس (OBJECTIVITY) پر زور نہ دیا تو پھر ہر مضموع یا رنگین چیز پر ایک وقت، اضافہ، مضمون، ڈرامہ، نثر، منظوم اور منظوم نثر سب کچھ ہو جائے گی۔ اگر ہم لکھو کھا اناؤں سے ملنے کے بعد ہر ایک شخص کو ایک مخصوص شخصیت کا نام دے سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ادب کی مختلف مضمون کو ہم ان کی مخصوص خصوصیتوں کی بنا پر نہ پرکھ سکیں۔

ملک راج آنند کا زیر طبع ناول

دوپتی اور ایک کلی

یہ ڈاکٹر ملک راج آنند کا وہ مشہور ناول ہے جو دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ چھ سات برس تک انگلستان میں اس کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ آسام کے چاؤ کے کھیتوں کے انگریز جاگموں نے انگلستان کی نام نہاد جمہوری حکومت پر اس لئے دباؤ ڈالا تھا کہ کالے لوگوں پر ان سفید چٹری والوں کے مظالم کی ان گنت داستانیں جہتد دنیا کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ اور ان کے شراب میں ڈوبے ہوئے قہقہوں و دران کے پُربوس شیطنت آمیز افعال اور ان کے چٹے کے ہنٹروں کے فراتے چائے کے کھیتوں میں کام کرنے والی مزدور دو شیراؤں کی چیخ میں دب کر رہ جائے

اس ناول کو وشوا متر عادل نے اردو کا جامہ پہنایا ہے

قنوطی شاعر

بلال کول

سکستی شب کی گنتی سیاہی میں کون آنسو بہا رہا ہے ؟
یہ کس کی دھڑکن ہے جس میں ارمان ہوئے ہوئے بلک رہے ہیں ؟
یہ گیت کیسا ہے جس میں آنسو ہیں، سردا ہیں ہیں۔ موت کی سی فسر دی ہے ؟
یہ کیا ہوا ہے کہ اس کی کلیں زمین پہ ذروں کو کن رہی ہیں ؟
ہو آئیں شاخوں میں سرسراہی ہیں دور تک تیر کی ہے تارے بجے ہوئے ہیں
فضا کے سینے میں میکیسی سی بھڑک رہی ہے ۔

سب ترسک کر بھارتی ہے
میں اک اشارہ ہوں اپنے خالق کی زندگی کی سیاہیوں کا
میں آج تک ایک محروم دل کے لبوں پہ نوحہ کناں رہی ہوں
ہو آئیں اک دوسری سے پیہم یہ پوچھتی ہیں !
یہ کون ہے جو یہ کون ہے جو ؟

کبھی وہ لمحے تھے جب یہ انسان
چلا کھٹا راہ حیات پر مسکراتا، ہنستا سجیلے گیتوں کے پھول لے کر
اور اپنی ہلکوں پہ آرزوؤں کے تارے بٹھائے یہ سوچتا تھا
لگن سے اترے گی وہ پری جو حسین آنکھوں سے جلم گدا دے گی اس کی ہستی
اسے مسرت کی مسکراتی حسین کلیوں کے ہار پہنا دے گی محبت کے گیت گاکر
جوان امنگوں کو گد گدا دے گی مسکرا کر

۵۴

مگر وہ ہنستا بکھر چکا ہے
کہ جیسے عمر کی سیاہیوں نے جیل تارے نکل لئے ہیں
اور اب یہ مقوم، نیم مردہ سلگنا انسان ٹرپ رہا ہے
حیات کی سب سیاہیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر کو تار کیوں کا مسکن بنا رہا ہے

کوئی اسے کاش یہ بتا دے
کہ زندگی کی پھرتی موجوں میں نیچے مٹے کروڑوں تنکے بھٹک رہے ہیں۔
کروڑوں تنکے حسین سینوں کا خون پیتے ہیں، اپنی آہوں کے گیت سننے میں، زندگی گزارتے ہیں
کروڑوں تنکے نہیں کے سینے پہ باربن کر ٹرپ رہے ہیں
کوئی اسے کاش یہ بتا دے
دبا جلا لو، غموں کے مسکن کو بھونک ڈالو،
آٹھاؤں کلیں کہ زندگی میں جھلپاں بھی ہیں، روشنی بھی ہے نکستیں بھی،
افق کے ماتھے پہ چھللاتی ہوئی شعاعیں بھی ناچتی ہیں

مگر وہ جھلا کے سر گھڑی یہ بھارتا ہے،
مجھے نہ چٹو، مجھے نہ چٹو،
نہیں ہمارے ہوں زندگی کی سرستیں، مسکرا اٹھیں اور چاند تارے
میں اپنی امید کا دیا تب جھاچکا ہوں
اور اب تو شاید میں زندگی کا دیا بھی اک دن بجھا کے رکھ دوں !!
ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۸۹ء

فلم لائن اور منشی پریم چند

(منشی پریم چند کے خطوط ہندی کے مشہور ناول نگار جنید رگسار کے نام)

کمری چٹیاں نکالیں پڑھیں دینا۔ میں پورے ایک سبھا لا اور چل
کھڑے ہوئے۔ میں نے تمہارے جواب میں ایک بڑا سا
(DETAILED) مفصل خط لکھا تھا وہ شاید مردہ
چٹھیوں کے دفتر میں پڑا ہو گا۔ (میں نے شاید تمہیں لکھا ہے کہ)
مجھے ممبئی کی کتنی ملال ہے۔ کیا صلاح ہے؟ مجھے تو کوئی ہرج
نہیں معلوم ہوتا اگر وہیں (خواہ) ۸۰۰ سو لے سال دوسال کرکے
چلاؤں گا مگر ابھی میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ ان کے دوتا یا چلے
ہیں۔ پیرسا دھجی کی صلاح ہے "آپ ممبئی نہ جائیں" تمہاری بھی اگر
یہی رائے ہے تو میں نہ جاؤں گا۔ جو بہتر جی کہتے ہیں مقررہ جائے
اور طویل نفسی بھی کہتی ہے کہ مقررہ جگہ۔ زندگی کا یہی ایک تجربہ ہے
آخر وہ فلم لائن میں گئے ہیں وہاں سے انہوں نے لکھا۔
میں جن ارادوں سے آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں
آتا۔ پیر و دوسرے جس دھنگ کی کہانیاں بنائے آئے ہیں اس
راہ سے جو بہتر نہیں ہو سکتے۔ ابتدائی کو یہ تفریحی قدروں سے تفریح
کرتے ہیں۔ سنسنی میں ان کا دوشوا اس ہے۔ راجہ رانی ان کی شہریت
کی سازش، نقلی لڑائی، بوسہ بازی، یہی ان کے خاص دھنگ ہیں۔
میں نے سماجک کہانیاں انہیں جنس تعلیم یافتہ سماج بھی دیکھا جاوے
لیکن ان کو نکالنے ان لوگوں کو شہر ہوتا ہے کہ بے پائے۔ یہ سال
تو پورے گزرا ہے ہی نہیں قرض دار ہو گیا تھا، قرض خدادادوں کا۔ مگر آؤ
کوئی فائدہ نہیں، گودان ناول کے آخری صفحہ پاتی ہیں۔ اور حیرن
ہی نہیں جاسا (جی جی جاسا) جہاں سے چھٹی اگر کہنے پڑا نے
آؤے پرجا جیوں۔ دہلی دھن نہیں مگر مسکون مرقہ ہے۔ یہاں

پیارے جنید ر
تمہارا خط عین اظہار کی حالت میں ملا۔ تم سے صلاح کرنے کی
مزدورت آ پڑی ہے۔ ابھی نہ تاؤں گا۔ جب آؤ گے تب
ہی اس کے متعلق باتیں ہوں گی۔ مگر تمہیں کیوں
محمد امجد کی حالت میں رکھوں؟
ممبئی کی ایک فلم کہتی مجھے ملال ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کرنا
(.....) بات ہے۔ ۸۰۰ زر روپیہ سال۔
میں اس دستخط (حالت) کو پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے
سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے
نادل کو بازار میں بیچوں۔ میں اس معاملے میں تمہاری رائے ضرور
سمجھتا ہوں۔ ممبئی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے ہیں
جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے لکھوں، ان کے لئے جار مارچ
سو سینور یو تیار کر دوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے
چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بجائے ایسا کنٹریکٹ
کروں گا کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں
اور چار پانچ ہزار روپیہ مل جا یا کریں۔ اس سے جاگیر اور پیش
دونوں کرنے میں جلیں گے اور مسکین کا سنگٹ کٹ جائے گا پھر
ہماری دونوں چیزیں دھڑلے سے نکلیں گی۔ لیکن تم یہاں
آ جاؤ گے تب کوئی رائے ہوگی۔ ابھی تو میں دھڑلہ ہوں۔
اس کے کچھ دن بعد ایک دوسرے خط میں پریم چند جی نے حنیف
کا ذکر لکھا:۔
بھلے آدمی مکان چھوڑا تھا تو ڈاکے سے اتنا تو کہہ دیا ہوتا

تو جان پڑتا ہے۔ زندگی برباد کر رہا ہوں۔
ان کا ایک علم نکلا تھا۔ مزدور۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے
ایک خط میں لکھا۔

مزدور نہیں پسند نہ آیا۔ یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے
اپنا کہہ سکتا ہوں۔ نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک
رواں جا رہا ہے۔ وہ بھی میرا نہیں ہے۔ میں اس میں بہت ٹھوڑا سا
ہوں۔ مزدور میں بھی نہیں اتنا دلچسپ آیا ہوں کہ نہیں کے برابر، فلم میں ڈاکٹر
سب کچھ ہے۔ لیکن فکر کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ڈاکٹر
کی عملداری ہے اور اس کے راج میں اس کی حکومت نہیں چلی سکتی
حکومت مانے تھی وہ وہ سکسا ہے وہ لیکن یہ کہنے کی جرأت نہیں
رکھتا کہ میں عوام کے رجحان کو جانتا ہوں۔ یہ نہیں جانتے اس
کے خلاف ڈاکٹر مزدور کے کہنے کے کہتا ہے میں جانتا ہوں۔

جنت آیا جا رہی ہے۔ اور میں اس کی صلاح کرتے نہیں آئے ہیں ہم نے ہمارا
کھولا ہے۔ دھن کما رہا ہے غرض ہے۔ جو کچھ جنتا مانے کی وہ ہم دیں گے
اس کا جواب یہی ہے۔ اچھا صاحب ہمارا سلام لیجئے ہم گھر جاتے ہیں۔

دہی میں کر رہا ہوں۔ مئی کے آخر میں کاشی میں بندو ناول
لکھ رہا ہوں گا اور مجھ میں کچھ نئی کلا سیکھنے کی بھی مصفت ہے۔
فلم میں میرے سن کو سکون نہیں ملا سکون ڈاکٹر لڑوں کو بھی نہیں
ملتا۔ لیکن وہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ جھک مار کر پڑے ہوئے ہیں
میں اور کچھ کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اس لئے
جلد آ رہا ہوں۔ میں جو بلاٹ سوچتا ہوں اس میں آؤشس داو
(ڈاکٹر ازم تصور پسندی) کس آتا ہے اور کہا جاتا ہے اس میں
تقریبی مصفت نہیں ہوتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے آدمی بھی
ایسے ہیں جو نہ ہندو کی جانیں نہ مارو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے
انھیں کہاں کا خلاصہ سمجھا نا پڑتا ہے اور کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے
لئے، بنی دہی پڑانی لائن منے کی ہے۔ جو جلا لکھا۔

میرا مومن یہاں بھی دیا ہے جیسا کاشی میں تھا یہی سے دوستی نہ
کسی سے ملاقات۔ ملائی دو سب بڑا مکمل اسٹیڈیو لگے گھر آئے بندہ کے دو چار
کچھ بھی آجاتے ہیں۔ بس۔ آخر میں فلمی دنیا کو استغنیٰ دے کر بریم
چند بج کر لوٹ آنا پڑا اور اس کے بعد کچھ زیادہ دن وہ اس دنیا میں نہیں رہا
(پنس سے اخذ)

جستِ غبار

باقتر رضوی

۵۶

فوج انسان کو تباہی سے بچا سکتے ہیں
وہ ہستی میں جو بے فیض ہیں مانندِ غبار
گلشنِ دہریں ہیں رنگ پریدہ لیکن
دور کرنے کے لئے پست و بلند ہستی
آج جو مصلحتاً منہ کو سیٹھے بیٹھے ہیں
جن کی نظروں میں ہے مستقبلِ روشن کا سرور
بغض و نفرت سے یہ دنیا ہے جہنمِ کنار
ہم زمانے کو رُہِ راست پہلا سکتے ہیں
ابرِ رحمت کی طرح جن پہ چھا سکتے ہیں
رُخِ کونین پہ سونا سا چڑھا سکتے ہیں
ہم نہ تیغ و سرور ابھی جا سکتے ہیں
کل وہ آفاق میں اک دھوم مچا سکتے ہیں
نقدِ جاں تک وہ مسرت سے لٹا سکتے ہیں
مہر و آفت اسے فردوس بنا سکتے ہیں

پوسٹ ماسٹر

ایگزیکٹو ڈپٹن (۹۹ء سے ۱۸۳۳ء تک)

روسی افانہ نگاری کے ارتقائی دور میں ڈپٹن کا ایک ٹکڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈپٹن بنیادی طور پر ایک شاعر تھا۔ اس کا شمار یورپ کے ممتاز ترین شعراء میں ہوتا ہے، لیکن وہ دراصل روسی اور افانہ نگاری میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سب سے پہلے چھپنے والے اپنے ملک کی افانہ نگاری کا ایک قسم کی پاکیزہ سا دگر-اگر کی جو بد میں دسی حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی، وہ اپنے افانوں میں عام آدمی سے بڑے پیار اور ہمدردی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا یہ طبع نہیں کہ ڈپٹن انسانی تخلیق تھا لیکن وہ پہلا روسی افانہ نگار تھا جس نے افانہ نگاری کی نظریاتی بنیاد کو قائم کیا اور اس کا نام دے دیا۔ لیکن افانہ نگاری کے بعد ڈپٹن کی یہاں نظریاتی بنیادوں کا سا بڑا حصہ لیا ہے۔ جو روایت کے خوبصورت نفاذ میں اس میں جھلکتا ہے اور پڑھنے والوں کے دل میں عام آدمی کے لئے ہمدردی اور مہربانی کو دیتا ہے۔

”پوسٹ ماسٹر“ چھپنے کا ایک بڑا مشہور نام ہے۔ اس نام نے ایک بگڑی ہوئی لڑکی کو دیکھا لیکن وہ اپنے پیش پیش کی خاطر اپنے غامض کے ساتھ جھانکتی ہے، اسے چھپو انہوں کو اس کے اصل نام سے اس کے بڑے میلے باپ۔ ایک عام آدمی۔ کی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہیں۔

عادل

۵۷

ڈپٹن کی اس کہانی سے روسی کہانیوں کے ترجمہ کا ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جو ترجمہ ”ڈپٹن“، ”اسٹوڈنسی“، ”گاترش“، ”چیترو“ اور ”گورڈو“ کی کہانیوں پر مشتمل ہو گا۔ چھپنے کے علاوہ روسی افانہ نگاروں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی ”دشومتر عادل“ ہی نے کیا ہے؛ جہاں تک ترجمہ کی خوبصورتی اور دلنشینی کا تعلق ہے۔ روسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کے تبادلے کے آتے کہانی کی تخلیق کشی میں قدرتی طور پر کسی آجائی چاہئے لیکن اس مجموعی کتاب کا وجود عادل نے ان کہانیوں کی روح کو نبھانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو ادب کے تخلیقی جذبہ کو صحت و استحکام کے سلسلے میں دھکیلنے کے لئے یہ نہایت مفید ہے کہ کم دوسری زبانوں کے ادب خاص کر روسی ادب کو زیادہ سے زیادہ اردو زبان میں منتقل کریں تاکہ ہمارے نو تخلیق ادب میں صحت مند عناصر پیدا ہو سکیں۔

”ادارہ“

صرف اس کا ترجمہ مکمل سے ہی نہیں لکھتا ہے۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں، میں اپنے ناظرین سے خبر یہ یہ پوچھتا ہوں کہ آخر اس ”ڈپٹن“ کے جس نام سے کہ شہزادہ دیار کی اُسے زندہ دلی سے ملاتا ہے، ”فرانسیس“ کیا ہے؟ یہ فرانسیسی کسی عید خانہ میں سترے قید کی ایک مسیحا کے مترادف نہیں ہیں؟ ان دن کو چین نے نہ کہ نہ کہ مسافر ایک ٹھکانہ ہے والے سفر کے دوران میں اپنی مادی جس شدت جھٹکا ہوا اور کوفت کا نانا پوسٹ ماسٹر کو بنا دیتا ہے۔ یہی موسم ناقابل برداشت ہے۔ شکر ہے خوف ناک ہے کہ کو جان کر ہے کی مانند صیبت ہیں؟۔ ہرگز کے لئے پوسٹ ماسٹر کو تصور دار بنایا جاتا ہے۔ جو ہی سفر کرنے والا ماسٹر پوسٹ ماسٹر کی نقلی رہائش گاہ میں قدم نہ رکھتا ہے وہ پوسٹ ماسٹر

کو کہ ہے جہاں جس نے ہمارے ناک کی سڑکوں کے پوسٹ ماسٹر کو کہیں نہ کو سا ہو، اور ان کے ساتھ تو تو میں میں نہ کو ہو؟ جس نے صفحہ کے یک لکے میں وہ محسوس کتاب نہ مانگی ہو تاکہ اس کے ”ادب“ برتاؤ، گستاخی اور لاپرواہی کی مہارت اپنی لاشٹریٹ کا درجہ چڑھنے کو کہ ہے جو انھیں نسل انسان کے اچھے بات پانچاؤ دلیل نہ سمجھا ہو۔ جتنے کراچ کل کی ہر دھڑکتی حکومت کے منشی یا کم از کم جھگڑا میسر کے لٹریچر ہے لیکن آؤ ذرا انصاف سے کام لیں۔ آؤ ذرا ہم خود ان کی جگہ کے کر دیکھیں شاید تب ہمارے ہاں میں زیادہ احتیاط سے رائے قائم کر سکیں گے۔ پوسٹ ماسٹر کیا ہے؟ چھپو میں درجے کے سرکاری ملازمین میں ایک شہید محض ہے

کو اس وقت سنا ناچا تھا ہوں۔

۱۸۱۶ء مئی کے مہینے میں مجھے۔ کی حکومت کے دفینا میں ایک ڈاکٹر کی طرح پیر سفر کرنے کا اتفاق ہوا جب اہل ناقابل سفر ہو چکی ہے سلاویہ بہت چھوٹا تھا۔ میں ڈاک گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور دھڑلے کا کرنا اور ڈاکڑ کا تھا۔ اسی لئے پوسٹ ماسٹر میرے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے تھے اور اب اوقات جس چیز پر میں پناہن سمجھتا تھا وہ مجھے جھکا کر کے حاصل کرنا پڑتی تھی جب کبھی پوسٹ ماسٹر میرے ٹھکانوں کو کسی بلند مرتبہ شریف زادے کی گاڑی میں جوت دیتا تو میں نوجوان اور بد مزاج ہونے کی وجہ سے اس کی کینگی لہر دوں پہی رفعضرب ناک ہوجاتا اسی طرح گورنر کے دسترخوان پر جب تیز فیم خدمت گزار مجھے نظر انداز کر دیتا تو اس کے روٹے سے مانوس ہونے کے لئے مجھے کافی دیر لگتی اب مجھے یہ بات زیادہ حشرات کے مطابق ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کچھ تو یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر تریب کے قدر ہونی چاہئے تھے مروجہ فائدہ کے بجائے کوئی دوسرا فائدہ مثلاً عقل کی قدر ہونی چاہئے راج کرنا چاہئے تو ہمارا کیا حشر ہو یہ کیسے کیسے ٹھکانے آئے کھڑے ہوں تو کوئی کوئی سے معلوم چکر پہلے کسی کی خدمت کر لینی چاہئے؟ لیکن پہلے میں ہی کہانی تو سناؤں۔

اس دن گرگرمی تھی۔ کی کو چوٹی سے تین وزسٹ کے فاصلے پر بارش کی فینڈ میں پڑنے لگیں اور ایک مٹھ بعد بارش کی گوجھار نے میری جلیزیک بھگدو دی۔ جب میں جڑی پر پہنچا تو میں نے پہلی احتیاط یہ کی کہ جلد از جلد اپنے کپڑے بدل لیئے۔ اور دوسری یہ کہ چائے لانے کا حکم دیا۔ پوسٹ ماسٹر چلایا۔ ”دو دنیا اساد اور دوسرے کو دے اور کچھ کریم لے آئیے۔“ الفاظ سن کر ایک چودہ برس کی لڑکی اوٹ (PARTITION) کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور بھاگ کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ میں اس کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔

دیکھا یہ تھا کہ بیٹی ہے؟ میں نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ تیری ہی بیٹی ہے جناب۔ اس نے غرور سے انداز سے جواب دیا۔ اور کتنی چالاک لڑکی ہے۔ کتنی تیز طرار جھوٹی سی چڑا اور ہوا میں غریب ماں جیسی۔ پھر وہ میرا ہوا زراہ دار کی منتقلی کرنے بیٹھ گیا اور میں اُن تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو اس کی حقیر لیکن بے داغ اکرشنگ سماں کی دہرائی کو آراستہ کر رہی تھیں۔ تصویریں ایک فغول خیرج بیٹے کی کہانی سن رہی تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک مسز بوڈھن آدمی، ایک شب خواب کی ٹوپی اور ڈرائنگ روم کا دینے اپنے بے قرار

کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ اگر پوسٹ ماسٹر اپنے بلاتے جہان کو جلدی بھیجے میں کامیاب ہوجاؤں تو وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ لیکن اگر سونے اتفاق سے گھوڑے نہ ہوں؟۔ شان خدا! ایسی کسی لختیں کیسی کیسی دھمکیاں میں سچا سے پر برساتی جاتی ہیں۔! بارش دیکھ کر میں نے معین بھاگ دوڑ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جیتے ہوئے لوٹنا اور کھاتے ہوئے پالے میں وہ باہر لوٹتی ہے (ENTRANCE) میں چلا جاتا ہے۔ تاکہ ایک لمحے کے لئے اپنے برعزم مزاج ملائی کی چیز کا راند گھس چھ سے بچ جائے۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک جرنیل آہنچی ہے۔ کا پتا ہوا پوسٹ ماسٹر ٹھکانوں کی آخری دھڑلیاں اس کے دل کو دیتا ہے۔ جن میں ہڈیاں بھی شامل ہیں جو سرکاری ہر کام کے لئے مخصوص تھیں۔ جرنیل شکر۔ ایک لفظ کہنے پر گاڑی میں بیٹھ کر چل دیتا ہے۔ بارش منٹ بوندی تھی گیندوں کی جھار سے لائی تھی چادر ہر کامہ نازہ گھوڑوں کے لئے اپنا حکم نامہ میرے بھٹک دیتا ہے۔ اگر وہ ان تمام باتوں پر غور کریں تو ہمارے دل جیسے سے نہیں بلکہ کچھ ہی ہمدردی سے بھر جائیں گے چنلیک لفظ اور۔ میں نے بیس سال سے زائد عرصہ تک دوسریل ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہے۔ میں خرب خرب کبھی ڈاک کی سڑکوں سے واقف ہوں۔ میں کو جوانوں کی کئی نسلوں سے بھی ملوچا ہوں۔ کوئی پوسٹ ماسٹر! انہیں نہیں میں سچا پتا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں غریب اپنے سفر ناموں کے عجیب غریب عجوبے کو بھپو ادوں گا۔ اس وقت میں صحت یہی کہوں گا کہ مجموعی طور پر پوسٹ ماسٹر علوم کی نظروں میں اس قدر نیچے ہیں نہایت جھوٹے لوگوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سرکاری ملازمین جن کی ہول کی جاتی ہے۔ عام طور پر سب سے بڑے لوگ ہیں جو فطرتاً باتروٹ، ملنا زار اور اپنی کار گزاروں کا عمدہ مانگنے میں معمولی ہل دوانے مذاق کی خاطر سے زیادہ جلائی ہیں۔ ان کی گفتگو سے، جن میں سفر کرنے والے شرفا نظر انداز نہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ بہت سی دیکھ لوٹنا کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک برائتوں ہے۔ مجھے انا پڑتا ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں میں اسے سرکاری کام پر جانے والے جیسے درجے کے سرکاری ملازم کی گواہی پر ترجیح دیتا ہوں۔

اس کا اندازہ تو آسانی سے ہو سکتا ہے کہ پوسٹ ماسٹر کی محرم مملکت میں میرا شمار دوستوں میں ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی یاد مجھے بڑی غریب ہے۔ ایک دفعہ حالانہ ہم دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور یہ آسمی کی کہانی ہے۔ جو میں اپنے قابل الفت ناظرین

بڑھ گیا۔ اور اس سے بوسے کفرِ ماشکی، ڈورِ ایمان گئی۔ میں بہت سے بوسے گن سکتا ہوں۔

”آس دن سے جب کہ میں پہلی بار اس شہرِ رات میں طاق
ہوا تھا لیکن اُن میں سے ایک بھی اتنی برپا اور اتنی خوش گواریا دیر سے
دل میں نہیں محسوس کر۔

کئی برس گزر گئے۔ اور حالات ایک بار پھر مجھے داکٹر کے
برائے مضامین مقامات پر لے گئے۔ مجھے پوسٹ ماسٹر کی میٹھی کا باڈی
اور اس سے دوبارہ ملاقات کرنے کے خیال نے مجھے خوشی بخوس
ہوتی۔ میں نے سوچا، لیکن شاید پوسٹ ماسٹر بل گیا ہو اور دنیا
غائب اب ایک شادی شدہ عورت تھی جس کی خیال بھی میرے ذہن
میں پیدا ہو چکا شاید ان میں سے ایک میرا چاہا ہو اور میں دل میں حکم لائے
لے ہوئے۔ چوکی کے قریب ہوتا گیا۔ گھوڑے ڈاک گھر کے پاس
اکڑ رہے تھے۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فوراً فضول خرچہ بیٹے
کی کہانی کی ترجمانی کرنے والی تصویریں دیکھیں۔ میزوار پر بستر
اسی پرانے کپڑوں پر پڑے تھے۔ لیکن اب کپڑوں میں بھول نہیں
تھے۔ اور آس پاس کی ہر چیز نرمل اور لبرو لال کی داستانِ نارہری
تھی۔ پوش مارشل کی جلیقہ کی کھال کا کوٹ اوڑھے ہوئے تھا۔
جب میں اندر داخل ہوا تو وہ جاگ بڑا اور اپنے بچے سے اٹھ
بیٹھا۔

دہ اسمیں را سترن ہی تھا۔ لیکن دہ کو بلا کر چھو گیا تھا۔
جب دہ میرا پر فائدہ راہ زار کی نقل کرنے میں مشغول تھا۔ تو میں نے
اس کے سفید بالوں، اس کے ایک عرصے سے بے حجامت چہرے کی
خبروں، اس کی جھکائی ہوئی پشت کو دیکھا۔ اور اس بات
پر حیران ہوئے نیز فہرہ سا کہ اس طرح تین چار برس کی سیلک طاقت و
انسان کو ایسا عرصہ سیدہ شکستہ بنا دے گا۔ لے کافی ہیں۔
کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ میں نے پوچھا۔ ہر بار نے شناسا ہیں۔ پورے
آؤں کے دیکھے پن سے جواب دیا۔ بے شک۔ یہ ایک حلقہ ہیں، ہونی فکر
سے یہاں سے لے شمار سا مقرر کرتے ہیں۔

”تھارسی بیٹی تو چھپی ہے؟“ میں نے سسلہ جاسری رکھی۔
 بوڑھے آدمی نے تھوڑی سی جھٹکائی۔ خدا جانے! اُس نے جواب دیا!
 ”شادی ہوگئی ہے میرے خیال میں؟“ بوڑھے آدمی نے پتلیا ہاتھ سر
 کیا گویا اس نے میرا سواں سنسنا ہی نہیں۔ اور منہ بھی منہ میرا

پردہ ازادادی پڑھتا گیا۔

میں نے اپنے سوالات بند کر دیئے اور کچھ جائے منگوائی۔
شوق تحقیق میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ مجھے امید تھی
کہ شراب کا ایک قطرہ میرے روست کی زبان گھول دے گا۔
بد نظمی پر نہیں تھا۔ جو گلاس میں نے اسے پیش کیا پورے
آدمی خائے لیے سے انکار نہ کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ روم نے
اس کے روکے من کو دوڑ کر دیا۔ دوسرے گلاس کے بعد وہ گھل
کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے پہچان لیا یا یہ کہا کہ اس نے پہچان
لی ہے۔ اور میں نے اس سے ایک سہانی سی۔ جو مجھے دیکھ بھلے معلوم
ہوئی۔ اور جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔

”اچھا تو آپ میری دُنیا کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ آہ!
دُنیا۔ دُنیا! ایسی لڑکی تھی وہ! جس کو ابھر سے گزرنے
کا اتفاق ہوتا وہ اس کی تشریف کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اور کوئی بھی
اس کے خلاف ایک سخت لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ خواتین اسے
تھے دیگر کی تھیں۔ کوئی اسے لال رومال دیتی۔ کوئی لالوں کی بالیا
ادھر سے گزرنے والے (GENTLEMEN) شریف زادے
اس ہانے سے کہ انھیں ڈرنا سہر چاہئے، جان بوجھ کر ٹھہر جاتے
لیکن دراصل صرف اس کے آسے سے ٹھہر کر دیر اور دیکھ لیں
مافوق الفطرتی نامی ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا اور بعد
سے نرمی سے بات کرتا۔ ”درا سوجئے تو جناب؟“ نامور درہنجام
لے جانے والے سوار تک اس سے آدھ آدھ گھنٹہ بات کرتے
سائے گھر کا بوجھ اس کے کاغذوں پر تھا۔

کیا صاف کرنا ہے؟ کیا تیار کرنا ہے؟ اسے ہر چیز کا خیال
رہتا۔ اور میں بڑھاپا مل جو تھا، اس کی کافی قدر نہ کر سکتا۔ اس
سے کافی مسرت حاصل نہ کر سکتا۔ کیا میں اپنی دُنیا سے پیار نہیں کرتا
تھا۔ کیا میں اپنی بیٹی کو دل سے نہیں چاہتا تھا؟ کیا وہ میرے
ساتھ خوش نہیں تھی؟ چراغ انان اپنی قسمت سے نہیں بھاگ سکتا
جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے۔

میں اپنی ہر کردہ چھٹی پائی بد قسمتی کی تفصیل منانے لگا۔ تین
برس پہلے سترہ ایک فام کو جب پوسٹ ماسٹر ایک نئے
روزنامے پر لکیریں بھجوا رہا تھا۔ اور اس کی بیٹی اوٹ کے
پہچھے اپنے لئے ایک نازک سی رہی تھی، ایک کاٹری آگڑ کی
ادھ ایک سرکاسٹین ٹوپی والا مسافر لیک بڑا فوجی کوٹ پہنے ادھ

گھلے گا مگر وہ ایک گلو بند لٹے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے
گھوڑوں کا مطالعہ کیا۔ تمام گھوڑے باہر شکر پر جا چکے تھے۔ یہ
سن کر مسافر اپنی آواز بلند بنا کر لڑائی انداز میں دینا چاہیے
واقعات کی عادی تھی۔ اوٹ کے پیچھے سے بھاگ باہر نکل آئی اور
اس نے بڑے متحلی سے پوچھا کہ اس سادو کی کھا پاندر نہیں کرے گا
دُنیا کی آمد کا جب میں مل اتر رہا۔ سادو خود اتر گیا وہ گھوڑوں کا انتظار
کرنے پر راضی ہو گیا اور اس نے کچھ شکر لیا جب میں غامبی بیلارڈ ٹوپی
آدمی اور گلو بند گھول دیا اور اپنا بٹ کاٹ چٹکا کرے کہ میں نے اگ کر لیا تو وہ
ایک چھری سے ہم اور چھوٹی چھوٹی ہونچوں والا کسی فوج رسالے کا نوجوان ثابت ہوا
وہ آلم سے ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پوسٹ ماسٹر.....

اور اس کی بیٹی نے ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا۔ سبب جن دیا گیا
اس انساں کو گھوڑے سے اُٹھ گئے تھے۔ اور پوسٹ ماسٹر نے حکم دیا
کہ انھیں کچھ کھائے۔ نیز وہ اسافر کی گاڑی میں حوت دیا جائے
لیکن جب وہ محسن سے واپس لوٹا تو اس نے فوجان آدمی کو بیہوش کی
حالت میں بیچ پر لیٹے ہوا پایا۔ وہ بار بڑ گیا تھا۔ اس کا سر پٹیا لپا ہوا
تھا۔ اس کے لئے سفر جابای رکھنا ممکن نہیں تھا..... کیا
کیا جاکست تھا؟ پوسٹ ماسٹر نے اپنا سبز سے دے دیا اور بے
بایا کر گریبا رادی کی حالت اگلی صبح تک بہتر نہ ہوئی تو ڈاکٹر کو لا
کے لے کر کسی کو شہر بھیجا جائے گا۔

اگلے دن سوار کی حالت بدتر ہو گئی۔ اس کا ڈاکٹر گھوڑے
پر سوار ہو کر ڈاکٹر کو لا کر شہر گیا۔ دُنیا نے میرے میں بھگول
ہوئی تھی اس کے سر پر بانڈی۔ اور اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر سکاٹی
کرنے لگی۔ جب تک پوسٹ ماسٹر وہاں رہا۔ بیمار آدمی کر ہتا رہا
اور اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ تاہم اس نے ہتھو
کے دو پیالے لیے۔ اور کر پاتے کر پاتے کچھ پیچ لائے تاکہ دیا۔
دُنیا اس کے پاس سے نہ اٹھی۔ وہ بار بار کچھ پیچے کو اگلتا
اور دُنیا اپنے ہاتھوں سے تیار رکھتے ہوئے لیوڈ کے دستان کی ایک
مراجی اس کے پاس لے جاتی۔ بیمار آدمی اپنے ہونٹوں کو تر کر رہا
اور جب بھی وہ مراح می واپس دیتا۔ وہ انہار لٹ کر کے لئے
دُنیا کا ہاتھ اپنی کمر ونگلیوں سے دبا دیتا۔ پیچ کے وقت
ڈاکٹر آگیا۔ اس نے مراح کی بھٹی دیکھی۔ جس میں زبان میں
اس سے باتیں کیں۔ اور مدھی نہ بان میں اعلان کیا کہ مراح
آدمی کو صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ اور وہ چند ایک

درخواست کی کہ جناب والا کو اطلاع دی جائے کہ ایک بوڑھا فری
ان سے ملنے کی خواہش کرتا ہے، سائیں نے، جو درخت پر ایک جوتا
رکھ کر سے پالش کر رہا تھا۔ جواب دیا کہ اس کا مالک سو رہا ہے
اور گیارہ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔ پوسٹ ماسٹر چلا گیا اور
مقررہ وقت پر واپس آگیا۔ منشی شب خالی کا ہادہ اور سر پر ایک
شرخ رنگ کی ٹوٹی ہوئی فرانس سے بنے کے لئے ہار بایا۔ کیوں بے
تجھے کیا جائے، بوڑھے آدمی کا دل کھول اٹھا۔ اس کی آنکھوں
میں آنسو آگئے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں عرض نہا کہ مسکا۔

جناب والا۔ خدا کے لئے۔ ہر بانی کر کے۔
منشی نے اس پر ایک سرسری نظر ڈال منشی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
پوسٹ ماسٹر کا ہاتھ پکڑا۔ اُسے اپنی مٹا دیگا۔ میں لے گیا اور گھر
سے دروازہ بند کر دیا۔ جناب والا، بوڑھے سے بات جاری رکھتے
ہوئے کہا۔ جو جھگڑے سے گریا وہ کھو گیا وہ گم ہو گیا۔ کم از کم سری
غریب دونوں کو تجھے داس دے دیکھئے، آپ اس لڑکی سے لطف
اندوز ہو چکے ہیں۔ اُسے بلا وجہ تباہ تو نہ کیجئے، اب جیتلے
کیا ہوت، جب جڑیاں چٹ نہیں کھیت، فوجی آدمی نے سرسہ
ہو کر کہا، میں نے تمھارے حق میں بڑا کیا ہے۔ اور مجھے تم سے سمانی
جزور مانگنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل میں لاؤ
کہ میں دنیا کو چھوڑ دوں گا۔

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رہے گی، وہ تمھارے
پاس واپس کیوں جائے؟ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے
گزشتہ حالات کو بھلا چکی ہے۔ جو کچھ ہو گیا ہے، اُسے وہ یا تم
کبھی نہیں بھلا سکو گے، پھر اس نے بوڑھے آدمی کی آستین میں چپکے
سے کچھ ڈال کر وہ ازہ کھولا پوسٹ ماسٹر نے جانے کھڑے پھرا پنے آپ کو
گلی میں پایا۔

بڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کی
نظر اپنی آستین میں ایک لمبے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ اس نے اُسے
باہر کھینچا اور پاس پاس رڈ بل کے چند
مروڑے ہوئے۔ نوٹ کھولے۔ ایک بار پھر آنسو۔ حزن و غم
کے آنسو۔ اُس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اس نے نوٹوں
کو توڑ کر ایک گیند بنایا۔ انھیں زمین پر بڑے مارا۔ انھیں تھپک
تھپک مارا۔ بار بار سے مارا۔ اور انھوں نے دور
جانے کے بعد وہ نکلا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور

اٹھ کھڑا واپس آیا۔۔۔ لیکن اب نوٹ وہاں نہیں تھے، ایک خوشی
پوش و ان آدمی اُسے قریب آئے دیکھ کر ایک گاڑی کی طرف لپکا
اچھل کر اندر چلا گیا۔ اور پچھلے یا مے چلو، پوسٹ پیچھے اُسے پکڑنے
کی کوشش نہ کی، اس نے تھکا اوردہ کر لیا کہ وہ والیج جا کر دوبارہ
نو کر سی کرے گا۔ لیکن اس نے جی اُٹی کہ ایک کمرے سے بیٹے اُسے اپنی
غریب و ذلیلہ آخری مرتبہ فرزدل لینا چاہئے، اس امید کو دل ہی
لے کر وہ دونوں کے بعد منشی کی جائے رہائش پر پہنچا لیکن سائیں نے
ٹینگ کر اس سے کہا کہ اس کا مالک کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُسے نکال
باہر کیا۔ اور اس کے پیچھے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ پوسٹ ماسٹر
تھوڑی دیر باں کھڑا رہا۔ اور پھر اُس نے اپنا راستہ لیا۔

اُسی دن شام کو وہ چرچ آف آلی آٹکسٹر
(SHUGH OF ALI ATUL) کے گھر جا کر جی پرنس میں شریک
ہونے کے بعد لٹیا سٹریٹ پر چل رہا تھا کہ ایک خوبصورت گاڑی اُس کے
قریب سے تیزی سے گزری۔ اور اُس نے اُس گاڑی میں منشی کو پہچان
لیا۔ گاڑی ایک سرسبز مکان کے انداز سے بڑی۔ اور فوجی وڈنگز
سٹریٹ میں پڑ چھا۔ پوسٹ ماسٹر کے ذہن میں ایک مسرت خیز خیال
دوڑ گیا۔ وہ واپس پڑا۔ اور گھوڑوں کے پاس جا کر اس نے پوچھا بھائی
یہ گھوڑا کس کا ہے؟ کیا یہ منشی کی گاڑی نہیں؟ تو منشی کہتا ہے۔ گھوڑوں
نے خواب دیا۔ لیکن مجھے اس سے کیا بات یہ ہے کہ تمھارے آقا نے مجھے
ایک رات اُس کی دنیا تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور میں دانا گیا لیکن
یہ بھول گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے؟

اور سے ٹھیک یہیں۔ دوسری منزل پر۔ لیکن بھائی تو رتھ لے
کر دیر سے پہنچا ہے، وہ اُس کے پاس خود پہنچ گیا ہے۔
دیکھ کر وہ انھیں، پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔ ہر بانی، جو تم نے یہ
بتا دیا لیکن مجھ سے بڑا کیا ہے۔ مجھے ضرور کرنا چاہئے۔ اور یہ کہ گزشتہ
مکان کے اندر داخل ہوا اور سیر ہوں پڑ چھا گیا۔

دروازہ بند تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ تک یہ اظہار
میں گھنٹے، قفل میں ایک کنبی نے رگڑ لگائی اور دروازہ کھل گیا۔ اُس نے
پوچھا کیا اور دنیا سیدو فونا، یہاں آتی ہے؟ ہاں میں آتی ہے؛
نیزین ڈوکر لائی نے جواب دیا؟ تمھیں اس سے کیا کام ہے؟ پوسٹ ماسٹر
جواب دیتے نیز اندر چل دیا۔ ٹیڈو، ٹیڈو، ٹیڈو، اس کے پیچھے سے چلاؤ
اور دنیا سیدو فونا کے پاس ملاقاتی ہیں۔

لیکن اس کی بات پر کوئی وجہ نیز پوسٹ ماسٹر اُٹھ بڑھ گیا۔ پہلے

کروں میں اندھیرا تھا۔ لیکن تیسرے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے تک پہنچا اور رنگ گیا۔ غصہ پوری سے سچانے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر سوچ میں گویا ہلکا ہلکا ہوتا تھا۔ دنیا جہیز ترین فیشن کے کپڑوں میں ملبوس، اس کی کرسی سے بازو پر اس طرح بیٹھی تھی گویا ایک نئی کلاسیکی کوئی خاتون۔ وہ اپنی چلتی ہوئی آنکھوں کے گرد اپنے بالوں کے کالے گھونچروں کو لپیٹی ہوئی بیٹھ کر بیٹھی نظر آتی تھی۔ دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی اس قدر حسین بھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے جہیز سے دیکھ کر بنا زورہ سکا۔

یوں ہے؟ اس نے سر اٹھا کر بغیر پوچھا۔ پوسٹ ماسٹرنے کچھ نہ کہا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا۔ اور ایک ڈیڑھ ایکڑ کا زمین پر دھڑام سے گر کر بیٹھ گیا۔ گھر کے آگے اس نے لے لے لے پھر پورے دوڑے آگے دو دروازے میں دیکھ کر اس نے دنیا کو کھنکھارایا اور غصے سے کانپتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔

”مجھے کیا پتا ہے؟“ اس نے اذیت میں کر کہا، تو ایک ڈاکو کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں دیکھتا ہے؟ کیا تو میرا گلا کاٹنا چاہتا ہے؟“

نکل جا، یہاں سے۔ اور اس نے پورے آدھے گھنٹے کے کوٹ کا کالر اپنی طاقت و رسمی میں پکڑ کر اسے دھکا دے کر بیٹھ بیٹھ گیا۔ پوسٹ ماسٹر کا دایاں ہاتھ دھکا دے کر کوٹ لایا۔ اس کے دوست نے اسے پٹ لکھوائے اسنو دیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر نے تھوڑی دیر سوچا مایوس ہو کر پناہ پتھر میں لپٹا لیا۔ اور کشمکش کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن بعد وہ پیسبرگ سے چلا آیا اور دوسرا ہائی چوکی کو روٹ آیا۔ جہاں اس نے اپنے ذرا لعل دو بارہ پہنچائی لے۔

اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا یہ تیسرا سال ہے جو میں دنیا کے بغیر گزار رہا ہوں۔ اور اس کی طرف سے یا اس کی بابت ایک لفظ نہیں سنا وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے، صرف خدا ہی جانتا ہے ہر قسم کی باتیں واضح ہوتی ہیں وہ سب سے پہلی لڑکی نہیں اور نہ ہی وہ صوب سے آخری لڑکی ہوگی، مجھے ایک حرام زادے سامنے اٹھایا گیا۔ تھوڑا عرصہ اپنے ساتھ رکھا اور پھر اسے ترک کر دیا۔ سینٹ پیٹریک میں اس قسم کی بے شمار روحانی برقوق لڑکیاں ہیں۔ آج ریشم و کھوپ میں بیویوں اور کلیم انہیں ملے کے (Taverns Lums) گندمی عورتوں کے ساتھ گھول کا کڑا کرکٹ صاف کرتے ہوئے پاؤں گھر گھر تھوڑی دیر مڑ کر سوچنے لگو گناہ دنیا کا انجام بھی دیا ہی ہوگا۔ تو تم گناہ کلمہ بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور تمہیں یہ خواہش بھی ہوگی کہ کاش وہ مرگئی ہوئی۔

یہ کہانی تھی جو میں نے اپنے دوست بوڑھے مارٹر کی زبانی سنی ایک ایسی کہانی جس کا سلسلہ کئی بار آنکھوں نے توڑ دیا جنہیں اس نے تیرہ فیصد کی دلاؤیز چار بہت کے دفا دار کردار تیرہ بیچ کی طرح اپنے کوٹ کے ہیکل سے دیکھ کر اذعانہ سے بوجھ دیا۔ یہ آنکھیں جد ایک شراب کی وجہ سے بھی نکل آتے تھے جس کے باوجود اس نے اسے کہانی سننے کے دوران میں جان سے بچنے انار لے لئے، لیکن کچھ بھی ہو مجھ پر ان کا گہرا اثر پڑا۔ اس سے رخصت ہونے کے بعد ہر ایک میں پوچھ میں بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو بھول نہ سکا۔ بڑی دیر تک میں بیچاری دنیا کی بات سوچتا رہا بہت عرصہ نہیں گزارا تھا کہ جب میں — کے قصبہ سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنا دوست یاد آگیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوکی میں اس کی گھڑائی میں تھی، اب ہوا کی تھی یہ کہیں جب میں نے پوچھا کہ ایک پوسٹ ماسٹر کا کھانا کھاتا ہے یا نہیں تو کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ بیچ اسے جانی بیچانی گلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ چند گھنٹے کے لئے پم، لے اور ان کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

خزاں کا موسم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سپر سپر۔ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جھنڈ دار کھیتوں کی جانب سے خشک جھول رہی تھی، درختوں سے ٹھنڈی ہوتی ان سے سرخ اور پیلے پتے چھینتی ہوئی — میں گاؤں میں اس وقت پہنچا جب سورج ڈوب رہا تھا اور میں ڈاک کی چوکی کے سامنے رُک گیا۔ اسی دروازے سے ... جہاں ایک بار دو تین تھے جو آتے آتے ایک بونی دہائی عورت نکلی جس نے میرے سوالوں کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے، اور اس کے گھر پیل ایک شراب کش کر کے دالا آگیا ہے اور وہ خود اس شراب کش کر کے دالے کی بیوی ہے۔ مجھے اپنے سفر پر اذیت ان سات دہائیوں پر جو میں نے بے کار خرچ کر دی تھیں تھے، انوس منے لگا۔

”وہ کس چیز سے مرا؟“ میں نے شراب کش کر کے دالے کی بیوی سے پوچھا۔

”شراب، جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ دنیا کہاں گیا ہے؟“

”گاؤں کا باہر، اپنی بیوی کے پاس،“

”کیا مجھے کوئی اس کی قبر تک لے جاسکتا ہے؟“

”ہاں۔ کیوں نہیں اور دنیا کا اپنی کوئی تنگ کر چکا ہے تو ان صاحب کو قبرستان لے جا اور انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر دکھائے،“

یہ الفاظ سن کر بیٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک کانادائی
مشرق باغیوں والا لڑکا بھاگ کر گھر سے نکلا۔ اور مجھے گھانڈس سے
باہر لے گیا۔

”کیا تم پوسٹ ماسٹر کو جانتے تھے؟ میں نے چلنے چلنے پوچھا
”بے شک میں جانتا تھا۔ خدا اس کا بھلا کرے! اس نے
مجھے سر کنڈوں کو کاٹنا سکھایا۔ وہ سرائے سے باہر نکلتا اور ہم
پچھلے سے اُسے دیکھتے تھے۔ دادا جان! دادا جان! ہمیں کچھ غمزد
دوڑا اور وہ ہمیں آخوٹ بھی دیتا۔ وہ سارا وقت ہم سے گفتگو
رہتا تھا۔“

”کیا سارا بھی تک اس کی بابت باتیں کرتے ہیں؟“
”نہیں، ان دنوں زیادہ ساز نہیں آتے۔ نالٹ کبھی
کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ لیکن اُس کے پاس تیرہ لوگوں کے لئے
وقت نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس بار گرسوں کے موسم میں ایک خاتون
اس طرف آئی تھی۔ اور اُس نے سچ بچہ پوسٹ ماسٹر کے
بالے میں پوچھا۔ اور وہ اس کی قبر پر بھی گئی۔“

”وہ کس قسم کی خاتون تھی؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ لڑکے کے جواب دیا
”وہ تین تھے جو بن اور ایک آیا اور ایک کالے رنگ کے
تھے جو ساتھ لئے جھگڑوں والی گاڑی میں آئی۔ اور جب اُسے
بتایا گیا کہ پوسٹ ماسٹر پر چکا ہے تو وہ ہموٹ ہموٹ کر
روتے لگی۔ اور بچوں سے کہنے لگی ”تم آرام سے بیٹھو۔ میں
قبرستان جاتی ہوں۔ میں اُسے لے جانے کے لئے اپنے آپ کو

۹۳

پیش کرنے لگا تھا، کہ وہ خاتون کہنے لگی۔ میں خود راستہ
جانتی ہوں۔ اور اُس نے مجھے جاندی کے پانچ ہوپک دیئے
— ایسی ہر بان خاتون تھی وہ؟“

”ہم قبرستان پہنچ گئے۔ محض زمین کا ایک ٹکڑا تھا
باڑوں سے خالی۔ جس پر ٹکڑی کی میٹروں نے نکتے ڈال دیے
تھے۔ اور جس پر اور کسی درخت کا سایہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا زندگی
میں ایسا اجڑا قبرستان بھی نہیں دیکھا تھا۔“

”یہ وہی پوسٹ ماسٹر کی قبر، لڑکے کے رب کے ایک
ڈھیر پر کوٹے ہوئے کہا۔ جس کے اوپر ایک پتیل کے نیچے والی
کالے رنگ کی سیب گھبرائی ہوئی تھی۔“

”کیا وہ خاتون یہیں آئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں جناب،“ دیکھ لے جواب دیا۔ میں نے دیکھ
رہا تھا۔ وہ وہاں لیٹ گئی اور بڑی بڑی کٹی ہوئی رہی۔ پھر وہ
واپس گاڑی چلی گئی، اس نے پادری کو بلوایا اور اُسے کچھ نقدی
دی۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دی۔ لیکن مجھے اُس نے چاندی
کے پانچ ہوپک دیئے۔ — وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔

”میں نے بھی اُس لڑکے کو پانچ ہوپک دیئے۔ اور مجھے
اپنے سفر یا ان سات روہلوں پر جو میں نے خرچ کر دیئے ذرا
بھی انخوس باقی نہ رہا۔“

دکٹ پبلشرز لٹلیٹل ایبلی کے شکرے کے ساتھ زیر طبع کتاب
”روس ادب کی ایک کہانی“

مولانا ابوالکلام آزاد

متواتر روایات

”انسان کو دنیا ہی ترقی کی وہ میں سب سے بڑی روک اُس کے عقیدہ کی
عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح مجبور نہیں کر سکتی ہے جس طرح
تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ
نہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انھیں زبور
کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ ہر مل، ہر نسل، ہر نسل، ہر نسل

خانہ دانی روایات اور تبدیلی تعلیم و بحث کے ماحول کی گیدے اس کے لئے ایک
مقدس دوش ہے۔ وہ اس دور کی مخالفت کرے گا۔ مگر اُسے سمجھنے کی جرأت
نہیں کرے گا۔ یہ اوقات موردنی عقائد کی بگڑاؤنی سمت ہوتی ہے کہ تعلیم
اور گورنیشن اس کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ تعلیم غائب ہوا ایک نیا
رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناؤں کے اندر نہیں اترے گی۔ بناؤں
کے اندر بیٹھنے والی خانہ اور عیدوں کی متواتر روایات ہی کا اقتدار کماؤں گا۔“

ماہنامہ اشیا فردی ۱۳۸۵

زاوے!

قمر ہاشمی

بھٹک رہے ہیں ابھی کارواں غریبی کے
لرز رہی ہے جیسے آسمان و انجم کی
ترس رہے ہیں خوشی کیلئے ہزاروں دل
ابھی لبوں..... کو اجازت نہیں تسمک کی

ابھی تو ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں گلشن پر
ابھی تو خار بھی پھولوں میں کھراتے ہیں
ابھی چمن ہیں خراب جہاں رنگ و بو
ابھی تو مہر کا ڈرے بھی نہ چڑاتے ہیں

ابھی نظام قتیل تبسم زر ہے
ابھی حکومتیں اخلاص پر نہیں قائم
ابھی ہوس کی نگاہوں میں ہے تنومندی
نصیب طبقہ عمال ہے برومندی

ابھی ہمارے شب و روز ہیں الم بردوش
ابھی تو راج دارے زمین کے بے گل ہیں
ابھی غریب کی گٹیا میں ہے اندھیرا ہی
ابھی عزیز ہے اُن کو یہ دکھ بسیرا ہی

ابھی ہمارے ارادے ہیں بے پائستگی
ابھی تو بھوک کی بستی میں یک لچل ہے
نہ آ سکے گی ہمیں راس ظلمتوں کی بہار
ابھی عوام کی دُنیا ہے درخور آزار

ابھی بہار اسیرِ خزاں رہے شاید
حیات اور جراحات نشان رہے شاید

فانی کے نظریہ حیات کا اثر ان کی شاعری پر

ایک برس فن کار کا درجہ ملے گا۔ جس نے زندگی کو پورے طور پر اپنے
ہر ممکن رُخ سے دیکھنے کی کوشش کی اور جس کی فنی تخلیق میں زندگی
کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے بے نقاب
کرنے کی کوشش ہوئی ہو۔ جس میں زندگی کا ہر سایہ، ہر حرکت اور ہر
رنگ نظر آئے اور جس میں ایک دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی مخلوق کے
دل کی دھڑکن کا پتہ چھوٹ سنا آئے۔

آرٹ کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر فانی کے کلام
کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنے نظریہ حیات کے اثر سے
جن موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ نہایت محدود تھے اور
زندگی کا کوئی زندہ اور وسیع پیمانہ پر سامنے نہیں کرتے
فانی کے موضوعات شاعری کے سلسلے میں ہمارا ذہن سب سے
پہلے ان کے محبوب ترین موضوعات غم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شاعری میں
رج و خم کا بیان ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ انسان ان نغموں میں حالات محسوس
کرتا ہے جن میں گماں، درد، کک ہو، مگر غم کے نغمے زندگی نہیں ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان ہنسنا کم اور رونا زیادہ ہے اگر
کوئی تہقیر اور آئندہ کی ایک ترزا میں نولے تو آئندہ کا کلر اٹھا کر
رہے گا۔ یہ جان زندگی کا صرف ایک رخ اور نظریہ پیش کرتا ہے بلکہ ناقص
بھی ہے۔ یہ بیان حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ

ملہ یہ وہ دھڑکن ہے جسے فانی نے محسوس کرنا نہیں سنا اگر بت کہا ہے
ملہ انگریزی کے مشہور شاعر شیلی کا کہنا ہے کہ۔
ہمارے نظریہ میں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمیں غم کی یاد
دلاتے ہیں۔

فانی اردو کے ایک باکمال مگر بد نصیب شاعر تھے انھیں فن کار کا
بچہ نہ سمجھا۔ ان کی شاعری میں وہ بیک دیک اور وہ خود گزاری و خود
ستباری تو نہیں مٹی جان کے بعض اہم عسروں کے یہاں نظر آتی ہے لیکن
اس میں فنی خوبوں کی کمی نہیں ہے ان کی طرزِ ادب پر کاری اور اسلوب
بیان میں خوش ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور کسی قدر گہرائی بھی
گہرائی اس لئے کہ انھوں نے فخر اور جبر کا استخراج پیدا کرنے کی کوشش
کی اور گہرائی اس لئے کہ وہ خالص شاعری کے قائل تھے ہمارا اس خارجی
آپ و رنگ یا شریعت کو ضروری خیال کرتے تھے، جو شریعت جتنی جبرتی
اور تخلیقی پیدا کرے، جس میں ایک تفسیری حسن ہو جو شریعت سے فائدہ
کر سکے۔ ان شاعروں کا حسن کے وجود فانی کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی
اور انھیں وہ قبولیت عام مسترد آئی جس کا وہ اپنے کو مستحق سمجھتے رہے
ہوں گے۔ فانی نے زندگی کو محض ایک دیوانہ کا خواب سمجھا اور اس سے
گریز کیا۔ زندگی نے ان سے انتقام لیا۔ مگر شاعری نے بھی ان سے
دفا نہ کی، جس کا کہ فانی نے زندگی میں سہارا لیا تھا۔ فانی کی اس کاٹنا
کارا زلیلہ ہے آپ اس سوال کو کسی عنوان سے اٹھائیے۔ جواب صرف
ایک ہے۔

فانی کی اس ناکامیابی کا راز ان کے نظریہ حیات میں مضمر ہے
فن کار کا زانو بے نگاہ اور نظریہ حیات اس کے فن کا اساس ہوتا ہے
اس نظریہ میں معنی ہر گیسری جتنی وسعت اور بند ہی ہوگی اسی
قدر اس کی عظمت زیادہ ہوگی۔ اور اس میں اگر قبولیت اور شہ
آفرینی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ آرٹ کی دنیا میں ہی فنکار

لے اک ستر ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کا ہے کہ ہے خواب ہے دیوانے کا

عالم ایجا داک مجموعہ افساد ہے
 اختلاف رنگ دیوے انجن آباد ہے
 ہم اسے رنج و غمش کی پمانے سے دنیا کے رنج اور غمش
 کو بابتے ہیں۔ فخریتہ فطرت بخش اس تبدلے آزاد ہے۔ الہانی زندگی
 میں غم اور غمش اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو کبھی جملہ پڑھیں میں کہہ کر
 تو لاپہیں جا سکتا۔ اس نوع کی تعلیم کا خیال ہمیشہ ان دعاخوان میں
 پیدا ہوتا ہے جو خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور عمل کی دنیا سے
 کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جس کے نزدیک تخیل سب کچھ ہے تجربہ کچھ
 نہیں جو زندگی کے جدلیات سے گزر کر رہتے ہیں۔

فانی کے فلسفہ غم سے مستحق نفادوں نے طرح طرح کی نکتہ
 آفرینیاں کی ہیں۔ کوئی انہیں غم زدہ آدمی قرار دیتا ہے، کسی نے اسے
 شخصی ناکامیوں کا نتیجہ بتایا ہے کوئی اسے موجودہ ماحول کی پیداوار
 بتاتا ہے جس میں احساس شکست اور غم بے عملی زیادہ ہے؟
 کسی کے خیال میں جب شاعر الذی ادیت زمانے کے آئین و
 قوانین کو سرمہ درون کو، احوال اور سماج کو اپنے سمجھے ہوئے تیروں
 کا نشانہ نہ بنا سکی تو وہ اپنی انفرادیت کے خلاف عقلمندانہ طور پر
 ہے اور اس کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے ہی گریبا
 پر زور دیتا ہے اور خواہش مرگ قوی تر ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک غیر جانب دار نقاد کے دل میں کچھ
 دوسرے پیدا ہوتے ہیں۔ فانی کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا
 ہے کہ ان کی زندگی کا وہ زور و جرات قبول کرنے کے لحاظ سے
 سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ نہایت خوش حالی اور فادہ الہائی
 کا اعتقاد انہیں حکمت و اندلس کی وہ تلخیاں نہیں جھیلنا پڑیں
 جن کی بدولت زندگی میں تلخی یا جھلکا ہٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں
 ایک معقول آبائی ورثہ ملا ہے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے
 لٹایا۔ بار بار ایش آدمی تھے، جہاں رہتے جہاں محفل بنے رہتے
 احباب کے جھگڑے رہتے یا شوخ شادی عری کی تھیں اس طرح گرم
 رہتیں کہ اکثر کاروبار بھی بھول جاتے، لکھنؤ اور گھوکے زمانہ
 تمام میں رنگین مکتوبوں کا بھی شوق رہا، اس کے بعد شاملا
 زندگی نہایت خوش گوار اور کامیاب گزری۔ مزاج میں عالم و غریب

لے آل احمد سرور صاحب
 لے دسکی، کا اشارہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی طرف ہے۔

کے ساتھ ساتھ خود غمانی اور غم و اداسی بہت تھی، طبیعت میں
 مختلف اس قدر تھا کہ غم کے کمرے میں بھی شرفانی پیچھے نہیں
 آتے تھے جس شخص کی زندگی میں یہ حالات بھی ہوتے ہوں اور جس
 کی سیرت میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں۔ اس کے منہ سے ہر جملہ
 غم کا بیان اور خواہش مرگ کی تکرار میں نہ سے حیرت ہوتی ہے
 یہ حیرت ہمیں تیر کے سلسلہ میں نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کے اشعار
 پڑھ کر ہم جس قسم کی شخصیت کا تصور کر سکتے ہیں وہی تیر کی شخصیت
 تھی، لیکن فانی کے سلسلے میں اس بیان میں ایک کم نہ دہی ہے۔ ہم
 ظاہری حالات سے بطور کلیاس کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں
 کہ یہ قیاس ہمیشہ درست ہو اور پھر انسان کی تھی ضروری نہیں۔ رما کا
 کا بیچ اندازہ تو کون لگا سکتا ہے۔ جو سکتا ہے کہ فانی کو ایسی ذہنی
 کشمکش اور تھکی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا جو جس کا درمیان
 کو صحیح علم نہ ہو اور جنہوں نے فانی کے مزاج میں ایک سو گرا نہ کیفیت پیدا
 کر دی ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر فانی کا غم
 ان کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا تو اس کا ایران کی شاعر
 کے آخری دور میں ملنا چاہیے۔ جبکہ وہ اس بات کا اذکارہ لگا سکتے
 تھے کہ ان کی زندگی میں ان سوئوں کا ایذا بجا رہی رہا تھا تو ان کا بیان

۶۷

فانی کے بیان غم کے بیان کا ارتقاء نہیں۔ شاعرانہ خیالات فانی کی جو کہ
 جبہ پروردہ قدیم کلام کے مکمل مجموعہ نہ منتقل ہے، پہلی سزل میں غم کا
 بیان جو ملتا ہے وہ قافیہ اور دلیف کی تہذیبی کے ساتھ اکثر و بیشتر
 غزلوں میں آخری غزل تک پایا جاتا ہے۔ ظاہر کی، سن ہوا کی اور
 یک رنگی کو دیکھ کر اذکم معنوی اعتبار سے تشبہ ہوتا ہے کہ شاعر ان
 کے قصوف کی طرح غم کا مضمون بھی عقل کا آفرینہ ہے اور غالباً یہی
 وجہ ہے کہ تیر کے اشعار ہاں دل پر جس طرح کچھ کے لگاتے ہیں
 اور جس طرح ان کے اچھے ہیں گرا زار و درد کی کسک ملتی ہے وہ
 فانی کے یہاں معقولہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی
 شادی تمام تر بے اثر ہے ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن
 میں گداز بھی ہے اور جھپی ہوئی انتشاریت اور اثر آفرینی بھی۔ غم
 ایسے اشعار کی تعداد کم ہے۔ ان کم تعداد اشعار کا نمونہ حسیل علی

لے یہ حالات ماہر نقاد دسکی، میکش اکبر آبادی، بیکم مختار احمد دہلوی
 تاجن دہلوی اور محمد سبطین بدایونی وغیرہ کے مضاف میں ہیں
 ملتے ہیں۔

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۳۹ء

میں نے فانیؒ کو جی دیکھی ہے منہ کائنات
جب جزایار کچھ برہم نظر آیا مجھے

عشق کی وہ لطافتیں، سخن کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جواب خواب و خیال ہو گئی

آج ہم کی سیکہ نہ آئے۔ ان کے آج جو بار بار آیا
اک فنا نہ سن گئے، اک کہہ نہ گئے۔ میں جو رہا سا سکر کڑھ گئے
اللہ سے سکون قلب اس کا جس نے دل لاکھوں توڑ دیے
جس زلف نے دنیا پر ہم کی وہ آب کبھی برہم نہ ہوئی
فانیؒ کے یہاں نہ تو سماج کا دکھ نہ ملتا ہے اور نہ اس کی
پڑیوں کے پیچھے ہی آواز سنانی دیتی ہے۔ ان کا علم انفرادی ہے
اور شاعری میں جہل رٹ کے وہ قائل تھے اس میں سماج کے
درو کے بیان کا زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ تنہا کب موت بنتی ہو
اور موت کب زندگی؟ یہ آپ کو مزدور کی زندگی میں بھلے ہی مل
جائے گرفت فانیؒ کی شاعری میں اس کی تلاش کی مثال ایسی ہے جیسے
کہ غالبؒ کی شاعری میں سیاسی بیداری کی۔ گنتی کے چند شاہ
اور کیشور برتینؒ کے راجپوتوں کے علاوہ ہم کو کہیں ہی فانیؒ کی شاعری
میں اسے ماحول کا عکس نہیں ملتا جس میں احساس شکست اور
علم بے حاصل زیادہ ہے، جس میں ابھی باقی تھی ہمارے دل میں پریشانی
رہتے ہیں؟ یہ واقعہ ہے کہ ایک ایسے شاعر نے جو شکر کا مقصد
سمجھا ہوا اور اسے ناجائز بننے پر کسی طرح تیار نہ ہو، ہم سماج کی شعوری
دکاسی کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور شعروادب میں سماج کی
شعوری دکاسی کے سلسلے میں ایک ہم نکتہ قائل خود ہے، دو توں
کی سردھری، فلک کی ستم رانی اور نہ ان کی قدر نہ انسانی سماجی اور شاعری
کے ایسے مضمون ہیں جن پر ہر اردو شاعر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن
ان موضوعات پر جس نوع کے اشعار ملتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا
ہے کہ یہ سب راجدیتی اشعار ہیں جنہیں محسوس کر کے نہیں کہا گیا
پھر اساتذہ قدیمؒ کے یہاں تو ایسے اشعار کے لئے ایک جواز بھی
ہے۔ لیکن دورِ جاہل میں اس قسم کے اشعار کی حیثیت محض روایتی
ہے۔ تیسرے مسودہ کا زمانہ نقیہ سریشانؒ کا ہے اور آشفٹ سامانی
کا تھا۔ وہ زمانہ مزدور ایسا تھا کہ انفرادی سکون اور راجتھا جمیں

۶۸

دونوں مفقود تھے۔ ایک پورا سماج شرقی اور سیاسی نظام
درہم برہم ہو رہا تھا، مگر نئے نظام کے جنم لینے کے آثار سرد
نہ ہوئے تھے۔ وہ دور احساس شکست اور غم بے حالی تھا
تھا۔ آج اگر کوئی شخص مسودہ کا اہلن روزگار اور موجودہ
زمانہ میں فرق نہیں محسوس کرتا تو وہ بھی تمدنوں سے عدم
آگاہی کا ثبوت دیتا ہے۔ آج زمانہ کے تیوریہ ہیں کہ مولے میں
شاہین سے ملنے کا عدم وجود ملتا ہے۔ اس دور کی
شاعری اپنے عہد کی ہنریت ناقص تر جانی کر لے گی اگر وہ
محض یہ بیان کرے کہ مزدور کی زندگی میں زندگی کی موت کب بنتی
ہے اور موت کب زندگی؟ اگر اس کی نگاہ صرف دوزخ میں نکلتی
ہوئی جنت تک نیچے اودھے دیکھنے سے قاصر ہے کہ انسانی عدم
وجود اور جبر و جبریت کی طرح اس دوزخ میں موتی ہوئی جنت کو
سر اجتنب بنانے کی فکر میں نہیں ہے۔ دورِ جاہل کا شاعر ادا
الکرامیؒ فنی تخلیق میں معصرت کی کچھ روح بھونکتا جاتا ہے تو اسے
محض دہشی، اداوی اور سیاسی کشش اور خلفائے میان پر رکتھانہ
کر کے ان زبردست قوتوں اور محرکات کا بھی جائزہ دینا چاہئے جو
سماج کی زیریں سطح میں لوری شدہ درد سے معذرت کا رہیں جن سے
ان کی دنیا کی تعمیر ہو رہی ہے اور جن کی بدولت زندگی کی نئی سماجی
قدریں اور نظریات پختہ اور مستحکم ہو رہے ہیں۔

فانیؒ کے کلام میں غم کا موضوع کس راہ سے آیا ہے ایک دلچسپ
سوال ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ فانیؒ کے غم کی
ذہنیت کیا ہے۔ غم کے مواقع پر غم گین ہونا یا غم میں آنسو بہانا ایک
فطری بات ہے۔ اسی طرح یہ بھی غیر فطری بات نہیں کہ انسان ضبط غم کا
حوصلہ پیدا کر لے۔ بڑے سے بڑے صدمے کو دل پر سہلے لیا اور
ذہان سے ان تک نہ کرے، لیکن غم کا دوا کرنے کے لئے کسی غم میں
گھلنا اور غم میں نشاط کے تمام پہلوؤں کو نظر سے غفلت نہ ہٹ
ہے جسے ہم ایک انسانی باری سے توقع کر سکتے ہیں۔ اسی صحت
کا اثر تھا کہ فانیؒ قوتی میں بھی غم کے پہلوؤں کو بیکر بیکر نکالتے تھے۔

پہلوؤں کی نظر انداز نہ کی گئی۔ مخلصوں کی دلگداز حالت دیکھی
قدت کا کرشمہ نظر آ کر کشمیر۔ دوزخ میں موتی ہوئی جنت دیکھی
تھے وہ دیگان کہ مجھے تاب رنج در زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جب دواں نہیں ملتا

ملے دیکھے یہ جیلے آل احمد سرور کے مضمون اور وہ شاعری میں فانی
کی قدردانیت سے اخذ ہیں۔

عنہیں لفظ اور تخلیقی نشاط :۔ علم تحت انبساط و تصدیق نشاط
 غم کا ہے قسم جسے کہتے ہیں جو :۔ ہنسی کو ہے غم کے دم کو توین
 یہ بارزہ ہیت جتنی خطرناک ہے اتنی ہی ناسدہ بدہ اور ناقابل
 قبول بھی۔ جس طرح زندہ رہنے کی خواہش ایک ناقابل تردید حقیقت
 ہے اسی طرح بھی ایک حقیقت ہے کہ کئی غم کو حاصل حیات تصور کرنا
 فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انسان غم کے لمحات کو
 جلد سے جلد فراموش کرنا چاہتا ہے اور خوشی کے لمحات کو غم کی یادیں
 غم گین بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اس سلسلہ حقیقت کے خلاف جو مثالیں ملتی
 ہیں ان کی حقیقت مستحیات لگا ہے۔

غم کی طرح :۔ یاس کی بھی فانی کی یہاں بے حد فردانی ہے۔
 یاس کا جذبہ اگر اسے جذبہ بکنار دست ہے (روح رواں کی طرح ان کے
 کلام میں جاری و ساری ہے۔ ان کو اپنی بیخوبی و محرومی پر یقین کامل تھا
 امید و حوصلہ کوئی لسن ان کے کلام میں نہیں ملتی۔ جذبات کا فقدان
 یاس کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو جذبہ غم سے زیادہ معزز رسا ہے۔
 خوشی کی طرح غم کا بھی ایک انتہائی پہلو ہے۔ مگر یاس کی بھی کیفیت
 ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں کوئی دلولہ، کوئی
 آئینہ، کوئی خواہش اور کوئی امید باقی نہ رہ جائے۔ زندگی میل یے
 لمحات آتے ہیں جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن یہ کیفیت
 زیادہ دیر تک قائم نہیں ہوتی وہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہ
 رہ جائے۔ دنیا کی رہی زندگی جیسا کہ عبادت ہے۔ جذبات کے
 فقدان سے یاس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے ان کا ملتی ہو جانا شخصی اور
 اجتماعی زندگی کے لئے یکساں طور پر ہلاکت آفریں ہے۔

فانی میں یاس کی یہ شدت کچھ تو ان کی فنی طبیعت کا
 اثر ہے اور کچھ بھی تصوف کا عمل اور جدوجہد میں ناکامی کی صورت میں
 یاس اور ناسدہ ہمت کا احساس فطری ہے مگر یہ ناکامی ایک صاحبِ عمل
 اور مہذب و صمد انسان کے حق میں مزید کوشش کے لئے ایک تازیانہ
 ہے۔ اقبال نے اسی لئے زندگی کو جو پرسنل کہا ہے۔ اس جذبہ میں جو
 لوگ کھپ جاتے ہیں وہ دوسروں کے لئے راستہ ہموار کر جاتے ہیں۔
 فانی کے یہاں عمل اور جدوجہد کی مثالیں نہیں ملتیں۔

ان کے کلام میں شدت یاس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنی محرومی
 و نامرادی پر اس درجہ یقین راسخ تھا کہ ان میں کبھی حوصلہ عمل پیدا ہی
 نہ ہوا اور یاس کی کیفیت دل و دماغ کے ساتھ ساتھ ان کی ساری شاعری
 پر مستولی ہو گئی اندر اثر بھی تصوف کے ہے۔ جمعی تصوف کا اثر بزرگانی
 کو بے حد رس آیا بھی تصوف نے فانی کو زندگیاں تباہ کی ہیں انہیں
 سرد اور بے عمل بنایا ہے۔ زندگی سے فراہم راہ دکھائی ہے۔ پہلوں
 تصوف کا فانی کے کلام کو بے ذوقی اور سردہ بنا دیا تو ایک معمولی سی
 بات تھی۔ جیسا کہ اوپر کی جگہ ذکر آیا ہے۔ فانی کے یہاں ایسے اشعار
 ہیں جن کا گوارا نہ ملے دل میں کبک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری
 کی عام فضا اور انتہائی سرد اور حوصلہ شکن ہے اس میں اس ہمت عالی کی وہ
 تعلیق نہیں ملتی جو دریا بھی قبول نہ کرے وہ عمل افزہ و دجیات افزہ
 جذبہ نہیں ملتا جس کا زمانہ متفق ہے جس میں کہ کچھ ہم اقبال کے
 یہاں پائے ہیں۔

غم و یاس کی طرح موت بھی فانی کی شاعری کا ایک مستقل راو
 محبوب و مومنور ہے۔ اردو کے کسی شاعر نے موت کو اتنی شاعری میں متکلی
 مومنور کی حقیقت نہیں دی لیکن اس کے یہی نہیں کہ اردو شاعر
 نے اس مومنور پر کچھ نہیں لکھا۔ موت کو کچھ ایک مخصوص حقیقت ہے
 اس لئے ہر شاعر نے اس کے متعلق اشعار کہے ہیں لیکن غالب کی کیفیت
 افسردہ اور اقبال کو چھوڑ کر دیگر شاعر کے یہاں بالعموم شکرانہ انداز
 نظر موقوف ہے۔ موت کا بیان ہمارے یہاں زیادہ تر دو طرح سے
 ملتا ہے۔ ایک تو شاعر اور جبر یا میں روز مرے تھے۔ دوسرے موت
 کے بیان سے دوسروں کو عبرت دلانا موقوف ہوتا تھا مگر فانی نے اس
 سلسلہ میں ایک انفرادی حقیقت حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے اس موضوع
 پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ اظہار خیال متفرق اشعار میں کیا گیا ہے
 اس لئے ان کے یہاں وہ بلند فکری کارکردہ تسلسل خیال جو اسی موضوع
 پر انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں تسلسل کا انداز
 فزور ملتا ہے۔ فانی نے موت کو حسین بننے کی کوشش کی تھی اسے
 نامرادی کی قمر اور علاج روز ریت کہا ہے۔ فانی کے حق میں ممکن
 ہے یہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ ان کی غم نصیب و تسخیر ہادی زندگی ممکن ہے

۶۹

CHRONIC سے تجربہ و اختیارات اسلامی علم کلام کی اصلاحات ہیں اگر اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جبر بھی میں عدل خداوندی ہے۔ مگر فانی کی
 نظراس مسئلہ کے تاریک پہلو پر بھی اس نے ان کے یہاں جبر کا مفہیم ان کی مجبوری محض ہے۔ صحیح اسلامی عقیدہ، مابین جبر و اختیار ہے۔
 سے شاعر کی نامردانہ و افسردہ و بے ذوقی انکار میں اس مرتبہ خوابیدہ و بیدار۔

ماہنامہ اشیا فردی ۱۹۴۰ء

موت کی آغوش میں سکون کی تلاش میں ہمارے زندگی کا محنت
سنہ نظر کی کمی نہیں کہہ سکتے۔ حیات اپنی تمام غزلیوں اور مجاہدوں کے
باوجود نہایت عزیز شے ہے۔ آدمیت ایک خوف ناک حقیقت ہے۔ ہم
زیادہ سے زیادہ موت کی طرف سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں۔
ہمارا یہ انداز نہ ہو سکتا ہے کہ جب تک جیتے ہیں۔ جیتے ہیں جیتے
آجائے گا تو جیل میں گئے۔ مگر انسان کے پہلو میں جب تک ایک ٹوکڑ
ہو ادل ہے جو اسے سولہ زبان کا احساس دلاتا ہے۔ اور جس کی بدولت
دنیا نے آب و گل سے اس کی دالیں بکھی ہے۔ وہ موت کو حسین نہیں
سمجھ سکتا۔ اور اس کی کتاب میں مر نہیں سکتا۔ فانی کے رابع مر موت کا
خیال ایک COMPLETE کی طرح مسلط تھا۔ وہ زندگی کے ہر لحظہ
کو موت سمجھتے تھے۔ اور پھر گہری آنکھیں موت کا انتظار تھا۔
ہر شخص عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمے کے جتنے جاتے گا
مجھتی ہی نہیں شمع جل جاتی ہے
کشتی ہی نہیں رات ڈھل جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی

۶۰

سینے میں بھری ہے کہ جلے جاتی ہے
اب سوال ہے کہ کیا فانی دائرہ موت کو، تنہا ہی جینے اور عزیز
سمجھتے تھے۔ جتنا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ میگزین سے
فانی مریض مہر القادری صاحب کا ایک مضمون ہے اس میں فانی کی
شخصیت اور سیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کا بیان
ہے: "بیادری کے زمانہ میں یک دیں اور نواب شہر یار جنگ بہا
مزاج (بشنہ کلکٹر) فانی کے یہاں آگئے۔ مزاج پرسی کے بعد فانی سے
نواب صاحب نے کہا۔ فانی تم نہیں سکتے، تمھاری اہرجی
(توت) صالح نہیں ہوئی۔ وہی فانی جو ہمیشہ مرگ ناگماں کی تنہا کرتا
تھا ان لفظوں کو سن کر اس کا چہرہ خوشی سے قلم اٹھا۔ زندگی کتنی

عزیز شے ہے! اگر اس بیان میں صداقت ہے اور کوئی دوسرے
نہیں کرے سمجھ جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی خواہش
مرگ میں صداقت کا وہ درجہ تھا۔ جس کے باقی میں انھوں نے صفحہ
کے صفحہ رنگ ڈھلے ہیں۔

فانی کی خواہش مرگ میں کتنی صداقت تھی وہ موت کو کتنا حسین سمجھتے
تھے ان بحثوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ فانی نے جملہ نظریات
اس موضوع کو پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہے۔ موت کے معنوں
کی گفت سے ان کی شاعری کو اس درجہ ہو گیا کہ وہ رنگ دے دیا ہے
کہ وہ کبھی بقول ادیب پسند یہ نہیں ہو سکتا۔ حیات و ممات کے مسئلہ
ایسے مسائل میں جنہوں نے فلسفہ، مابین اور مذہب کو یکساں طور
پر اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ شوائف میں ان مسائل کی طرف توجہ کی ہے
مگر ان مسائل کی حیثیت کبھی نہ حل ہونے والے مسئلہ کی ہے۔ ان مسائل
پر جن مختلف مذاہبوں نے بحثیں ہوتی ہیں۔ ان کی انفعیلات میں پرنا
نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش ہے۔ ہمارے
مقصد کے لئے موت اتنا دلچسپ نہیں کہ فانی کو اس کا زندگی کی زندگی
نوعیت چاہے ایک مکمل حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کے بعد ایسا ہی ترغیب بخود
چاہا۔ شاہد ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خوشی اور رنج، یاس و
اسید، نور و ظلمت، صلح و جنگ، اور ایسی طرح مہین کے شمار
جوئے آپس میں ٹکرائے زندگی کے دھات کو آگے بھاٹے لئے
جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب
تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تذکرہ تو اس ڈرامہ کا ہے جو ہم اپنی دنیا
میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے دنیا سے باہر کائنات کی مہبط اور لا انتہا
فضاؤں میں کیا ڈرامے ہو رہے ہیں۔ ان کا اندازہ کمزور نہ لگائے؟
زندگی کے اس ڈرامے میں ہم ایک لمحہ کے لئے پردہ ہٹاتے ہیں
اس نعمت میسر کو کسی طرح برتنا جاتے۔ ہم اس ڈرامے (جس میں
طربہ اور ایسا کا ناقابل تعین امتزاج ہے) کا خوش نمائش فانی تو بن

لے جو جس نے اسی چیز پر سخت چوٹ کی ہے وہ دامن کو ہمیشہ نہیں کیا کرتا ہے۔ دریا تیری آنکھوں سے بہا کر نہا ہے
یک نیت اجل کو جان لینا بہتر مرنے کا قیاس یہ کیا کرنا ہے

موت کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کی جو شدت فانی کے یہاں نظر آتی ہے اس کے قیاس سے تو فانی کو یہ سنسکا اور بھی غم نہیں
ہو جانا چاہئے تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتے۔ نفعیات کے ماہر گنبد فراموشی نے ایک جیسی پھولی بات کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکثر ہم اس
جزیرے اپنی سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے دل میں ایک ہی ہوتی خواہش ہوتی ہے۔

نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ تو اپنی فطرت کے خلاف ہے ہم جتنے
لینے پر مجبور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لئے نہ صرف کوئی سلاخ
یا دھات پر آئندہ یہاں نہ صرف کر دیں کہ پردہ پر کیوں لائے گئے
پانسی خوشی اس میں شریک ہو کر اسے اپنی بساط بھر خویہ سے
خوب تر بنانے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ انسان مجبور نہیں ہے اور قدرت کی اندھی شین
اسے سینے پر تکی ہوئی ہے علمی تعقوت کا اثر ہے۔ جس کی بنیاد حقائق -
زندگی سے گریز پر قائم ہے یہ خیال شکست خوردہ ذہنیت سے پیدا
ہوئے ہے اور دوسروں کو شکستہ بنا دیتا ہے۔ اسی گھمبے نے فانی
کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے یہ نے زندگی کو صرف بے رنگ ہی
نہیں بنائی بلکہ انسان سے زندگی کا سارا حوصلہ چھین لیتی ہے
ان اشعار کو پڑھئے اور دیکھئے کہ ان کے افروز کئے حوصلہ شکن ہیں

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ

ہر نفس ہے اک جاذبہ آہ بے تاثر کا

ہے موت ہی اب زندگی دل کا سہارا

جیسے کی جواں ہی تنہا ہے تو سرجا

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی

وجود در دستم علاج نامعلوم

زندگی جب ہے اور جس کے آثار نہیں

ہم سے اس قدر کہ نہ خبر بھی درکار نہیں

میں کہاں اور کہاں عمر دور و زہ فانی

زندگی اب یہ نفٹ فٹلے گراں جانی ہے

پھر اگر یہ خیال یا نظریہ تعقوت کے دیگر مسائل کی طرح

محض برائے شرف گفتن خوب است تنگ محدود رہے تو

ہرج نہیں۔ لیکن شاعر کی اس ذہنیت یا نظریہ کا قومی اور

اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا انتہائی ہلاکت آفریں ہے۔

اقبال اس گھمبے کی نہ ہر آگس سے آگاہ تھے وہ اس رمز سے

واقف تھے کہ موتی، فقید اور شاعر نے مل کر کتنے سیٹھ ڈالے

ہیں۔ اقبال کا یہ سادہ نامہ ہے کہ انھوں نے قومی زندگی کو

اس نہ ہر آگس سے جاننے کی کوشش کی اور اس پر ایک نئی

روح ایک نئی تڑپ اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔

فانی کا ایک شعر ہے

اب بنے سر سے چھڑ برودہ ساز: میں ہی تھا اک شکست کی آواز
معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان ساز
نہ تو وقت کا ساز ہے اور نہ ساز ہے جسے کا روان حیات
کے لئے بانگ درا کہہ سکیں، زمانہ کو جس ساز کی ضرورت تھی
وہ ساز اقبال کے پاس تھا۔ اب اقبال کے بعد دلے دور میں
اس ساز کی لئے کیا ہوگی اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے
باہر ہے۔

غم و یاس، خواہش مرگ اور انسان کی مجبوری یہ محسوس
فانی کی شاعری، اند شاعری کیا ان کی زندگی کے سنگ
بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جس زندگی کی تعمیر ہوگی ظاہر ہے
کہ وہ مدعاے حیات سے محروم ہوگی۔ مدعاے حیات سے
محرومی اور بھرسر بہد وقت اس کا احساس ہلکے پھلکے حیات کو
کتنا تنگ، کتنا محدود اور دکھنا بے رنگ دے آہنگ بنا دیتا ہے
یہ کاروان حیات کس منزل کی طرف رواں دواں

ہے اور کہاں جا کر دم لے گا؟ ان سوالوں کا جواب دینا تو
آسان کام نہیں، ہاں آسان و دیکھو جس ہوتا ہے کہ انسان
اپنی تاح کو تاحیوں، تمام کمزوریوں اور تمام محرومیوں کے
باوجود آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ زندگی خواہشیں
بلکہ ایک عینی حقیقت ہے۔ لیکن فانی کے نظر یہ حیات کا نقطہ
عروج و دسری انتہا پر جا کر کا۔ جہاں زندگی محض خواب ہے
اور بے مدعا ہے مقصد۔ اگر فانی کا یہ خیال صحیح ہے تو پھر
اقبال کا یہ شعر کیا معنی رکھتا ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سمیے جاتے ہیں

کہ یہ تو ہمارا نامہ کامل نہ بن جائے
زندگی کو بے مدعا اور بے مقصد قرار دینے والی شاعر کا
اور اس عمل افروز اور حیات انفر شاعری میں جو آدم خاکی میں
مہ کامل ہے بھی روشن ترین آجائے کا حوصلہ سدا کرے انتخاب کرنا
زمانہ کے لئے دشوار نہ ہوگا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ زمانے کا
تناظر جیسے جیسے دور ہوتا جائے گا۔ موخر الذکر شاعری کی تعلیم
اور اہمیت جس رفتار سے بڑھے گی۔ اڈل الذکر شاعری اسی رفتار

سہمہ مرکا حیات ہے محروم مدعاے حیات

وہ وہ گذر رہوں گے کوئی نقش پانہ لا

سہمہ جہ نہیں کہہ سکتے ڈوب چکی گئے

فقیر معنی و شاعر کا خوش اندیشی

لہ بہ رنگا ہے کہ راجش نظر می آید

خوش نگاہ ہے مت دے خوش ترانہ کی باید

سے پس پشت پڑتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ حیات مرنے والی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے روحانی بیٹا اور فلاسفہ گزرے ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو غم کدہ تصور کیا ہے اور اس میں تنگ تار کی غم کدہ سے فسرار کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن ان کے خیالات کا اثر ہمیشہ محدود اور وقتی رہا ہے۔ دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیاں وہی شمار کی جاتی ہیں در انہیں کے بیانات کو عالم گیر اثر اور قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے انسان کو روحانی آؤ

مادی خوشیوں میں مٹا نہ کیا ہے اور ان کی ترقی کے لئے نئی راہیں سمجھائی ہیں۔ زندگی کو بے مقصد اور بے مٹھا سمجھ کر اور دنیا کو غم کدہ تصور کر کے اس کے ہنگاموں اور محشر سامانیوں سے گزر کر انسانی فطرت کے منافی ہے۔ جس دن انسان انسان نہ رہ جائے گا اور اس کا دھڑکنے والا دل خاموش ہو جائے گا اس دن شاید دنیا محض غم کدہ بن جائے اور اس کی زندگی بے مقصد رہے مٹھا۔

زیر طبع

نمائندہ ایڈیشن

رنگ محل

ساعر دور جدید کا پیامی ہے، اس کی بہار آفریں شاعری ایک صبح نو کی مہند ہے۔ اس کے نغمے میں ماضی کی خنایت نہیں ہے بلکہ اس رنگ محل کا انکاس ہے۔ جس کے سند رکس اور رُوح اور شہرِ مستقبل کی زریں دھوپ میں چمکنے نظر آتے ہیں۔ جب ساعر شہاب کی ناز اور سرخ شراب زندگی کے جام میں آمیزت ہے۔ تو خوشاعری "ساقی جلوہ روشن وایمان دا گہی" بن کر محفلِ نشاط میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس رقصِ جاوداں کی دلہنوں کیوں کہ اس کی بلائیوں کو "رنگ محل" کے ایوان خاص میں دیکھئے۔

جب ساعر بہارِ جوانی اور ابدیت کے گیت گاتا ہے تو اس کی شاعر سہمی کی ترنم نغمہ بے تہوڑوں کے بہاریہ نغمے کی یاد تازہ کر دیتی ہے، وہ جب "جن، سندرتا اور کنوار یوں کی موہنی کو اپنے نغموں پر سمودیتا ہے تو کیوں بلکہ ترکش سے اندھے ترے اختیار چپسل کر باہر نکلنے نظر آتے ہیں۔ وہ جب اشتراکیت کے رخسندہ رنگ محل کی جلوہ آفرینوں کو اپنے مخصوص رجائی انداز میں دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن میں ساند کے مستقبل کی ایک ایسی واضح روشنی اور خوبصورت تصویر کھینچ جاتی ہے کہ ساری لالینیات پر اک عجیب کیف، اک عجیب سرستی مچانے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸) (۵۳۹) (۵۴۰) (۵۴۱) (۵۴۲) (۵۴۳) (۵۴۴) (۵۴۵) (۵۴۶) (۵۴۷) (۵۴۸) (۵۴۹) (۵۵۰) (۵۵۱) (۵۵۲) (۵۵۳) (۵۵۴) (۵۵۵) (۵۵۶) (۵۵۷) (۵۵۸) (۵۵۹) (۵۶۰) (۵۶۱) (۵۶۲) (۵۶۳) (۵۶۴) (۵۶۵) (۵۶۶) (۵۶۷) (۵۶۸) (۵۶۹) (۵۷۰) (۵۷۱) (۵۷۲) (۵۷۳) (۵۷۴) (۵۷۵) (۵۷۶) (۵۷۷) (۵۷۸) (۵۷۹) (۵۸۰) (۵۸۱) (۵۸۲) (۵۸۳) (۵۸۴) (۵۸۵) (۵۸۶) (۵۸۷) (۵۸۸) (۵۸۹) (۵۹۰) (۵۹۱) (۵۹۲) (۵۹۳) (۵۹۴) (۵۹۵) (۵۹۶) (۵۹۷) (۵۹۸) (۵۹۹) (۶۰۰) (۶۰۱) (۶۰۲) (۶۰۳) (۶۰۴) (۶۰۵) (۶۰۶) (۶۰۷) (۶۰۸) (۶۰۹) (۶۱۰) (۶۱۱) (۶۱۲) (۶۱۳) (۶۱۴) (۶۱۵) (۶۱۶) (۶۱۷) (۶۱۸) (۶۱۹) (۶۲۰) (۶۲۱) (۶۲۲) (۶۲۳) (۶۲۴) (۶۲۵) (۶۲۶) (۶۲۷) (۶۲۸) (۶۲۹) (۶۳۰) (۶۳۱) (۶۳۲) (۶۳۳) (۶۳۴) (۶۳۵) (۶۳۶) (۶۳۷) (۶۳۸) (۶۳۹) (۶۴۰) (۶۴۱) (۶۴۲) (۶۴۳) (۶۴۴) (۶۴۵) (۶۴۶) (۶۴۷) (۶۴۸) (۶۴۹) (۶۵۰) (۶۵۱) (۶۵۲) (۶۵۳) (۶۵۴) (۶۵۵) (۶۵۶) (۶۵۷) (۶۵۸) (۶۵۹) (۶۶۰) (۶۶۱) (۶۶۲) (۶۶۳) (۶۶۴) (۶۶۵) (۶۶۶) (۶۶۷) (۶۶۸) (۶۶۹) (۶۷۰) (۶۷۱) (۶۷۲) (۶۷۳) (۶۷۴) (۶۷۵) (۶۷۶) (۶۷۷) (۶۷۸) (۶۷۹) (۶۸۰) (۶۸۱) (۶۸۲) (۶۸۳) (۶۸۴) (۶۸۵) (۶۸۶) (۶۸۷) (۶۸۸) (۶۸۹) (۶۹۰) (۶۹۱) (۶۹۲) (۶۹۳) (۶۹۴) (۶۹۵) (۶۹۶) (۶۹۷) (۶۹۸) (۶۹۹) (۷۰۰) (۷۰۱) (۷۰۲) (۷۰۳) (۷۰۴) (۷۰۵) (۷۰۶) (۷۰۷) (۷۰۸) (۷۰۹) (۷۱۰) (۷۱۱) (۷۱۲) (۷۱۳) (۷۱۴) (۷۱۵) (۷۱۶) (۷۱۷) (۷۱۸) (۷۱۹) (۷۲۰) (۷۲۱) (۷۲۲) (۷۲۳) (۷۲۴) (۷۲۵) (۷۲۶) (۷۲۷) (۷۲۸) (۷۲۹) (۷۳۰) (۷۳۱) (۷۳۲) (۷۳۳) (۷۳۴) (۷۳۵) (۷۳۶) (۷۳۷) (۷۳۸) (۷۳۹) (۷۴۰) (۷۴۱) (۷۴۲) (۷۴۳) (۷۴۴) (۷۴۵) (۷۴۶) (۷۴۷) (۷۴۸) (۷۴۹) (۷۵۰) (۷۵۱) (۷۵۲) (۷۵۳) (۷۵۴) (۷۵۵) (۷۵۶) (۷۵۷) (۷۵۸) (۷۵۹) (۷۶۰) (۷۶۱) (۷۶۲) (۷۶۳) (۷۶۴) (۷۶۵) (۷۶۶) (۷۶۷) (۷۶۸) (۷۶۹) (۷۷۰) (۷۷۱) (۷۷۲) (۷۷۳) (۷۷۴) (۷۷۵) (۷۷۶) (۷۷۷) (۷۷۸) (۷۷۹) (۷۸۰) (۷۸۱) (۷۸۲) (۷۸۳) (۷۸۴) (۷۸۵) (۷۸۶) (۷۸۷) (۷۸۸) (۷۸۹) (۷۹۰) (۷۹۱) (۷۹۲) (۷۹۳) (۷۹۴) (۷۹۵) (۷۹۶) (۷۹۷) (۷۹۸) (۷۹۹) (۸۰۰) (۸۰۱) (۸۰۲) (۸۰۳) (۸۰۴) (۸۰۵) (۸۰۶) (۸۰۷) (۸۰۸) (۸۰۹) (۸۱۰) (۸۱۱) (۸۱۲) (۸۱۳) (۸۱۴) (۸۱۵) (۸۱۶) (۸۱۷) (۸۱۸) (۸۱۹) (۸۲۰) (۸۲۱) (۸۲۲) (۸۲۳) (۸۲۴) (۸۲۵) (۸۲۶) (۸۲۷) (۸۲۸) (۸۲۹) (۸۳۰) (۸۳۱) (۸۳۲) (۸۳۳) (۸۳۴) (۸۳۵) (۸۳۶) (۸۳۷) (۸۳۸) (۸۳۹) (۸۴۰) (۸۴۱) (۸۴۲) (۸۴۳) (۸۴۴) (۸۴۵) (۸۴۶) (۸۴۷) (۸۴۸) (۸۴۹) (۸۵۰) (۸۵۱) (۸۵۲) (۸۵۳) (۸۵۴) (۸۵۵) (۸۵۶) (۸۵۷) (۸۵۸) (۸۵۹) (۸۶۰) (۸۶۱) (۸۶۲) (۸۶۳) (۸۶۴) (۸۶۵) (۸۶۶) (۸۶۷) (۸۶۸) (۸۶۹) (۸۷۰) (۸۷۱) (۸۷۲) (۸۷۳) (۸۷۴) (۸۷۵) (۸۷۶) (۸۷۷) (۸۷۸) (۸۷۹) (۸۸۰) (۸۸۱) (۸۸۲) (۸۸۳) (۸۸۴) (۸۸۵) (۸۸۶) (۸۸۷) (۸۸۸) (۸۸۹) (۸۹۰) (۸۹۱) (۸۹۲) (۸۹۳) (۸۹۴) (۸۹۵) (۸۹۶) (۸۹۷) (۸۹۸) (۸۹۹) (۹۰۰) (۹۰۱) (۹۰۲) (۹۰۳) (۹۰۴) (۹۰۵) (۹۰۶) (۹۰۷) (۹۰۸) (۹۰۹) (۹۱۰) (۹۱۱) (۹۱۲) (۹۱۳) (۹۱۴) (۹۱۵) (۹۱۶) (۹۱۷) (۹۱۸) (۹۱۹) (۹۲۰) (۹۲۱) (۹۲۲) (۹۲۳) (۹۲۴) (۹۲۵) (۹۲۶) (۹۲۷) (۹۲۸) (۹۲۹) (۹۳۰) (۹۳۱) (۹۳۲) (۹۳۳) (۹۳۴) (۹۳۵) (۹۳۶) (۹۳۷) (۹۳۸) (۹۳۹) (۹۴۰) (۹۴۱) (۹۴۲) (۹۴۳) (۹۴۴) (۹۴۵) (۹۴۶) (۹۴۷) (۹۴۸) (۹۴۹) (۹۵۰) (۹۵۱) (۹۵۲) (۹۵۳) (۹۵۴) (۹۵۵) (۹۵۶) (۹۵۷) (۹۵۸) (۹۵۹) (۹۶۰) (۹۶۱) (۹۶۲) (۹۶۳) (۹۶۴) (۹۶۵) (۹۶۶) (۹۶۷) (۹۶۸) (۹۶۹) (۹۷۰) (۹۷۱) (۹۷۲) (۹۷۳) (۹۷۴) (۹۷۵) (۹۷۶) (۹۷۷) (۹۷۸) (۹۷۹) (۹۸۰) (۹۸۱) (۹۸۲) (۹۸۳) (۹۸۴) (۹۸۵) (۹۸۶) (۹۸۷) (۹۸۸) (۹۸۹) (۹۹۰) (۹۹۱) (۹۹۲) (۹۹۳) (۹۹۴) (۹۹۵) (۹۹۶) (۹۹۷) (۹۹۸) (۹۹۹) (۱۰۰۰)

کرشن چندر

ملے کا پتہ۔

ادبی مرکز ہند پبلشرز کرالسٹ چرچ روڈ، بامیکھ بیٹی

انسان کی لاش!

بولتی تھیں۔

میں ہندوؤں کے گھر میں گئی ہوں اور مسلمانوں کے گھر میں بھی، ہندو بچوں کو اس گودی میں پالا ہے، اُن کو ان چھاپوں سے دودھ پلایا ہے، ان بچوں سے انھیں پہلایا ہے، کھلایا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے بچوں کو پالا ہے، پوسا ہے، میں سب کے ماں ہوں؛ ایک کھانے آئے بڑھ کے اس کا بازو اس زور سے مروڑا کہ دایہ کے منہ سے اشر کا کلنے لگی گئی، اگھر وہ کانام لے کر سکھ کی گریبان اسدا یہ کے پیٹ میں پٹی۔ اور دایہ لڑکھرائی ہوئی زمین پر گر پڑی اور دوبارہ زمین سے نہ اٹھ سکی۔

آج ہندوؤں اور مسلمانوں کی ماںیں ہر جگہ تھیں، دونوں کے بچے خون کی ہوئی کھیل رہے تھے، اسکول کی مسلمانستانی یہ سوچ رہی تھی کہ کھنٹی بھی، اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوں۔ آج کوئی میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی، سامنے بوڑھے ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا۔ آستانی نے جیٹر سے لڑکیوں کا نام پکارا۔ سب کی غصہ لایا، مادر پھر نقشے کی طرف دیکھنے لگی، اندر کھنٹی، یہ ہے ہندوستان یہ ہے چارائیس، یہ ہیں اس کے بھائی، یہ ہے مونٹ الوریٹ، دنیا کی سب سے بڑی چوٹی، یہ ہے کشمیر، ہندوستان کی جنت، اور یہ جنگل، دریا، سمندر، یہ ہے پنجاب، راوی کے اس بار مسلمان بستے ہیں، اور اصر ہندو، میں تھیں ہر روز یہ سبق پڑھاتی ہوں، اس نقشے کی طرف دیکھو، اس کی حدیں بھول نہ جانا (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) بلکہ اہاں دیکھ رہی ہو، آستانی نے کرخت پہنچیں یہ انفا لکھ۔

بتلانے آستانی کی طرف دیکھا اور کچھ گھر لاسی گئی، وہ کچھ سوچ رہی تھی، اس کا دھواں نقشے کی طرف نہ تھا۔ بلکہ اس عمر ہوئی، آٹھ نو برس، اس کی تھی بھی سی آنکھیں حیران آدہ ریشتر

شرمار تھیں کے لئے کیسے کھل گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے مینٹ میں اسکول کھولا گیا تھا۔ اس اسکول میں صرف ہندوؤں کی لڑکیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں زیادہ تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں، جو پاکستان سے پنج کر آئی تھیں، ان میں کسی کی ماںیں مر چکی تھیں کسی کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی لڑکیوں کی ماںیں بھی مل پاکستان میں تھیں۔ اور کئی کا سارا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور کئی لڑکیوں کو یہ بھی علم نہ تھا کہ ان کے والدین زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ لڑکیاں ہندوؤں کی تھیں، لیکن اسکول کی آستانی مسلمان تھی۔ جب دینی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں پر دھم ڈھائے، جس کی نظیر ہندوستان کا تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں سے بد لایا تھا لیکن مسلمانوں، مسلمان عورتوں سے کہن مسلمان بچوں سے و شاید، ان لوگوں نے یہ سوچا، کہ وہ جیسے مسلمانوں کو تیغ کر رہے ہیں، ان کا مغربی پنجاب بڑھل دھلانے میں کوئی ہاتھ نہ تھا، بربریت کے اس لمحے میں کسی نے کچھ نہ سوچا کہ یہ عورت جس کو وہ نکال کر کے باز رہیں سے جا رہے ہیں، یہی ان کی دادی اماں تھی، اسی سے وہ بلی کی نگہوں میں وہ بلی باسل بکے تھے، ماسی دادی اماں نے ان کے کمرے پر شفقت کا ہاتھ پھیلا تھا۔ راز رازی کھر دھا کی تھی۔ ان کی آستانی چوکی تھی، ان کے سیاہ میں دھوک بکائی تھی، گیت گائے تھے، لیکن اپنی مسئلہ خانی تھیں وہ دادی اماں کا لکھنوت دیا۔ اس کی کھول کو نیزہ پر چڑھا کر لاسی اندھی جو انیت کا ثبوت دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہندو فسادوں کے ہاتھ میں ایک دایہ لگی تو آنکھوں نے اس سے پوچھا۔

تمہارا نام؟ ہندو جو یا مسلمان؟
دایہ! دایہ!

ہو کر وہ گئی تھی، کبھی نہ آستانی کی طرف دیکھتی، کبھی بوڑھی کی طرف
 اور کبھی مٹی کی بوڑھی کی طرف، جو اس کی طرف بار بار دیکھ رہی
 تھیں، جب کبھی آستانی بھلا سے کوئی سوال پوچھتی، بھلا ادا
 لیا، جواب دیتی، آستانی جواب میں کرسمیہ آ سے جھڑکتی، آج جب
 بھلا سے پھر اس کے سوالوں کا ٹھیک جواب نہ دیا۔ تو آستانی آپ سے
 باہر ہو گئی۔ اور حج کر لولی۔

ہندوستان کی تعمیر کس نے کی؟ جو اب ہندو۔
 ہندوستان میں کس قوم کے باشندے رہتے ہیں، بھلا خاں کو
 پاکستان میں کون کی قوم کہتی ہے، بھلا خاں سوشلسٹ
 چاندھریاں ہے، بھلا آستانی نے کڑا کر پوچھا۔
 دہلی ہے، بھلا نے فقیر کی طرف دیکھ کر کہا۔
 دہلی کہاں۔ ہندوستان میں پاکستان میں،
 پاکستان میں، بھلا نے حیران کن نگاہوں سے دیکھ کر،
 یہ جواب میں کرب لولیاں ہنس پڑیں،

آستانی کو اور غصہ آیا، اس نے بھلا کی طرف تہہ لڑکھایا
 سے دیکھا اور کہا: تم کیا کرتی ہو، تمہارا دھیان کس طرف ہے، کھڑی
 ہو جاؤ، پیر، دیکھا انگلی گرو میں نہ ڈال۔ سیدھی کھڑی رہ،
 تمہیں یہی ہندو ہی کہہ کر جانہ دھریاں ہے، اتنی سی بات، کیا کرتی
 ہو دن رات، پڑھتی کیوں نہیں ہو، ماخوڑ کو اور نکلے کا سستی
 رہتی ہو، اگر تم اس طرح پڑھتی رہیں، تو کبھی استخوان پاس نہ کر کوئی
 بھلا جب جاہ کھڑی رہی، اور پریشان کن نگاہوں سے
 آستانی کی طرف دیکھتی رہی۔

تو یہ ہے ہندوستان کا نقشہ۔ اور پاکستان ہے، یہاں
 مسلمان رہتے ہیں، مسلمان جناحی ٹوپی پہنتے ہیں، وہ ہندو اور
 سکھوں سے نفرت کرتے ہیں، پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے، بڑے
 آرام دار میرا سے بہتے تھے، اگر کمر میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ تو
 خود ہی ٹیٹ لیتے تھے، اب کے جھگڑا ہوا۔ تو انھوں نے انگڑے کو بلایا۔
 اور انگڑے نے دونوں کو اپنا حقد دے دیا۔ — اور ہندوستان
 ہے، یہاں زیادہ تر ہندو رہتے ہیں، ہندو دھرمی ہندو ہے، کافر
 پر تلک لگاتا ہے۔ اور اکثر تیرتہ یا تڑکرتا ہے، ہندو کمان
 سے نفرت کرتا ہے۔ تو یہ بچہ ہمارا ملک، اور ہم ہیں اس کے باشندے
 اگر پاکستان جانا ہو تو پاکستان کے کمرچاؤ اور ہندوستان
 آنا ہو، تو کبھی پاکستان کے کمرچاؤ۔ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے

یہاں کارخانے ہیں، یلیں ہیں۔ ہوائی جہاز ہیں، ٹیکسٹائل ہیں
 چینی نوٹریں ہیں اور پیداوار کا کافی ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے رہتے
 ہیں۔ پٹرولینم بہت ہے، لیکن لوگوں کو نہ لگا رہے کا خوف ہے
 اس ملک میں سو لے کی کاٹیں ہیں، چاندی کی کاٹیں ہیں، کوئلے کی
 کاٹیں ہیں، ہندوستان میں تاج محل ہے، قطب صاحب کی مینار
 ہے، لال قلعہ ہے اور اب اس کی آبادی چالیس کروڑ سے چھتیس کروڑ
 رہ گئی ہے، سمجھ گھٹیں بھلا کیا کہا میں نے،

شانتی۔ دنیا میں سچے آدمی کی عزت ہوتی ہے یا جھوٹے کی!
 سچے آدمی کی آستانی جی، شانتی نے خود آجواب دیا،
 "شاہاش" آستانی نے خوش ہو کر کہا
 لڑکھو! یہ تارا کو پڑھو، پڑھا ہے یا مسلمان؟
 "ہندو" سب لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔
 "شاہاش" آستانی نے سچ کر کہا
 "تم تارا۔ بھلا۔ لڑکیوں کا خوش ہو۔ ہندو پڑھا ہے یا مسلمان!"
 بھلا خاں ہنس پڑی۔

لڑکیوں کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی، نقشے کی طرف
 گھور گھور کیوں دیکھ رہی ہو۔ انگلیوں سے نہ کیلو، گردن ادبھی
 کر دو۔ سچے دیکھو، سیدھی کھڑی رہ،
 آج آستانی کو ضرورت سے زیادہ غصہ آ رہا تھا وہ غصہ
 میں بھری ہوئی بھلا کے قریب گئی۔

تارا۔ ہندو پڑھا ہے یا مسلمان۔ آستانی نے چیخ کر کہا۔
 بھلا خاں سوشلسٹ۔ —

نکل جا یہاں سے، اسی وقت چلی جا، نہیں تارا مارا کر جان
 نکال لوں گی۔

"بھلا جانے لگی،
 "مخیر جا،
 باقی سب لڑکیوں کو آستانی نے جھتی دیدی۔ لڑکیاں
 چلی گئیں اور کمرے میں بھلا اور آستانی رہ گئیں۔

بھلا دھڑکتی تھی۔
 اسے مددنا دیکھ کر آستانی کو گرم لگیا۔

"کیوں رورہی ہو میری سچی!
 "آستانی جی، بھلا نے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں

میں — رات بھر سو سکی۔

کہیں میری جی، آواز میں شفقت اور پیار تھا۔
 "رات بھراتی جاگتی رہی، اور روتی رہی؟
 "وہ کیوں؟

ماتا جی نے مجھے بتایا کہ میرے تباہی کو کل گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں پھریے ہوئے تھے کہ باقی لوگوں کو علم ہو گیا۔ انھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے تباہی کو، یہ کہہ کر ہلا روئے گی، میں رات بھر جاگتی رہی، مجھے بالکل نیند نہ آئی، میرے چٹا جی مسکوم نہیں، اب کہاں، وہ سا گھر ماتا جی کہتی ہیں کہ وہ دس برس نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر آستانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے غصہ کا زور ہو گیا اس نے اپنی ساڑھی کے تلوے ہلا کے آنسو پونچھے، اور کہنے لگی دو موت میری جی، میں بھی رات بھر نہ سوئی، میں بہت پریشان تھی۔ ایک پل بھر نہ سو سکی۔
 "وہ کیوں، بھانے دے دے ہوئے کہا

"میرا بھائی جالندھر میں تھا، ہندوؤں کے قبضہ میں آگیا اور بجا لار گیا۔ ایک جی بھائی تھا میرا۔ خاندان کی آخری نسلانی تھی وہ بھی بجا رافٹل کر دیا گیا۔

نقشے نے مارا، آستانی جی؟
 "ہندو نے"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سامنے نقشہ لٹک رہا تھا۔ ہندوستان کا نقشہ!

ایک طرف ہندو۔ دوسری طرف مسلمان، ایک دلی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک ہی وطن، جی تقیم میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، نہ ہندو ہوا تھا۔ نہ مسلمان، دونوں دہن تھے۔ دونوں جیوان تھے۔

دونوں نے گھور کر نقشے کی طرف دیکھا۔

ایک طرف ہندو بکھرا تھا، دوسری طرف مسلمان کھڑا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان انسان کی لاش تھی۔ دونوں کرے سے باہر نکلی گئیں!

ترقی پسند تحریکوں کا ترجمان

پندرہ روزہ

نیا پرچم

جو فروری ۱۹۴۵ء سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

ترتیب دینے والے
 دشوا متر عا دل
 نظر جعفری
 محمد حیدر اسد

پہلے نمبر کے چند فنکار :- کرشن چندر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سردار حفیظ، کیفی اعظمی، ساغر نظامی، ہندو ناٹک ظ انصاری، مجروح سلطان پوری، ممتاز حسین، حبیب تنویر، ریش مکھی، جیون،

"نیا پرچم" حسن چیمبرز، پارسی بازار اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی۔

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۵ء

لرزشیں

میراجی

سکوں کا سایہ ابھی اس طرف سے گذرا تھا ،
 یہ کون ؟ آج بھی تم دوریوں کو طے کر کے
 اسی طرح میرے خوابوں کو گدگداتے ہو ؟
 زمانہ سر پہ کھڑا قہقہے لگاتا ہے
 ہجوم — سرد ، خموش
 کبھی تو دور سے ملتا ہے ، مسکراتا ہے ،
 کبھی قریب جو آئے تو جیسے ایک خیال
 اندھیری رات کی تنہائی میں ڈراتا ہے
 وہ آگے بڑھتے ہی جلدی سے لوٹ جاتا ہے ،
 ہجوم کب ہے ؟ جھجھکتا ہوا خیال ... جھجھکتا ہوا خیال تو ہے !
 تمہیں بھی میرے ستارے میں لطف آتا ہے —
 تمہیں بھی شوق یہ رازِ دروں بتاتا ہے —
 کہ اک تڑپ کو دوامِ حیات کہتے ہیں ؟
 ہجوم جل کی بکھری ہوئی نمائش ہے
 ہجوم قتل کی جبرأت نہ ہو تو دور سے ہی
 ہزاروں پارہ سنب
 اٹکھا کے پھینکتا ہے ، اور بھول جاتا ہے
 کہ ایسے اپنی جمالت کے نقشِ محکم کو
 سوارِ وقت کا وہ ہمغاں بناتا ہے ،
 شکارِ خونِ رگِ دل کے پھوٹ پڑنے پر
 سکوں کے سایہ خاکی میں ڈوب جاتا ہے
 سکوں کا سایہ نہ تھا ، تم نہ تھے ، وہ میں بھی نہ تھا ،
 یہ چند لمحے تھے جو وقت سے جدا ہو کر
 ہمارے دورِ مکاں میں گداز لائے تھے
 اور اب ہمیشہ کو اک کا ہیش بقا ہو کر
 ادھر ہی لوٹ گئے جس طرف سے آئے تھے

خوبصورت حقایق

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں

سمجھ بوجھ کر پریش حال کیجے
کہیں کوئی عرضِ تنانہ کروے

پہلے وہ جو پریشیاں تھے
ادرا ب لطف پریشیاں ہیں

وہ نقاب آپ اٹھ جائے تو کچھ دُور نہیں
خاطر اہل نظرِ حسن کو منظور نہیں
جراتِ عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن
دل و دھڑک ٹھٹھا ہو خود اپنی ہی ہر آہٹ پر
ہائے وہ وقت کہ جب بچے مدہوشی تھی
دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہر تجار

اہل عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

مارشل پلان

بنیاد دینے والے پر رکھیں اور اس امداد کو وسائل چلنا ضروری کرنے میں استعمال کریں اس کے ساتھ یہ امداد دیتے وقت ان ممالک کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور انھیں اس کی پوری آزادی دی جائے کہ وہ اپنی معاشی زندگی کو جو طرح چاہیں تشکیل دیں۔

برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں نے اس نقطہ نظر کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ بیرونی امداد ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اور اس کی پوری طرح کی تیسرے کا دار و مدار ہے۔ برطانیہ اور فرانس امریکہ کی طرف سے یورپ میں اس منصوبہ کو عملی شکل دیں گے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو امداد حاصل کرنے والے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی۔

سوئٹ یونین اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا اس لئے کہ معنی صاف طور پر یہ تھے کہ امریکہ کی سرپرستی میں ایک ایسا ادارہ قائم ہو جاتا جو یورپ کے ہر ملک کی معاشی زندگی میں اخت کرنا اور اس کا تصفیہ کرنا کہ کون سا ملک کس قسم کی شہت قائم کرے گا اور اس طرح امریکہ سارے یورپ کو اپنا معاشی غلام بنالینا اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں نے اسے کیوں رد کر دیا اور مشرقی یورپ کے ملکوں نے قرضہ کی تھوڑی سی رقم کی خاطر اپنی آزادی کا سودا کیوں کر لیا۔

اس کا جواب بہت آسان ہے گزشتہ جنگ میں تقریباً سارا یورپ تباہ ہو گیا جنگ کے بعد پیداوار گر گئی۔ لوگوں کا افلاس بڑھ گیا۔ بے روزگاری عام ہو گئی اور معاشی بحران بڑھنے لگا۔ مشرقی یورپ کے ملکوں نے اس بحران پر قابو پانے کے لئے اپنے ممالک جاگیر داری مٹا دی۔ ٹری سنٹروں کو قومی ملکیت بنا دیا اور سارے ملک کے لئے ایک معاشی منصوبہ بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ ممالک

مارشل پلان گزشتہ سال بھر سے ساری دنیا کا موضوع بنا ہوا ہے اور کوئی دن نہیں چلتا کہ اخباروں اور رسالوں میں اس کی موانعت اور مخالفت میں مضامین نہیں جھپٹتے۔ خود ہندوستان میں لوگوں کو اس سے کافی دلچسپی ہو گئی ہے اس لئے کہ آئندہ لبرلس کا چرچا کرے ہیں کہ اسی منصوبہ کے تحت ہندوستان بھی امداد حاصل کرے۔ امریکہ کے سابق بیئر مشر گرڈی کی جب یہاں تھے تو انھوں نے بھی اس کا بہت پروپیگنڈہ کیا اور سنا دیا کہ ہندوستان بھی ایک بہرو پلان بنائے اور امریکہ ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہے۔

اس منصوبہ کو شروع ہونے کا ایک سال ہوتا ہے اس لئے اسے سمجھنے کے لئے اصولی بحث کی ضرورت نہیں رہی ہے بلکہ ایک سال کے تجربات سے ہم کافی نتیجہ خارج کر سکتے ہیں۔

اس منصوبہ کا اعلان سب سے پہلے امریکہ کے وزیر خارجہ مارشل نے بارہ دہیں کیا تھا۔ جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یورپ جنگ کی دہ سے بڑا تباہ ہو گیا ہے۔ وہاں معاشی بحران بڑھ رہا ہے امریکہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ یورپ کی مدد کرے تاکہ وہاں کی زراعت اور صنعتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اور یہ ملک بحران سے نکل سکیں اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خود یورپ کے ملکوں کو اس کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ انھیں کس قسم کی امداد کی اور کتنی ضرورت ہے اور اس کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک کانفرنس کی جائے اور سب ملک مل کر ایک مشترکہ پروگرام پیش کریں۔

اسی کے مطابق جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں سوئٹ یونین برطانیہ اور فرانس کے وزیر اعظموں کی ایک کانفرنس میں میں ہوئی سوئٹ یونین کے نمائندوں نے امریکہ کی امداد کا غیر مقدم کیا اور کہا یہ بات بڑی قابل قدر ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ یہ امداد یورپ کی تیسرے کے لئے اسی وقت مفید ہوگی جس کے تمام ممالک اپنی تیسری بنیادیں مراد پر نہ رکھیں بلکہ ملکی

بڑی تیزی کے ساتھ بحران سے نکل رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی یورپ میں بھی ایک ایسی طرح سرمایہ داری نظام جاری ہے۔ پیداوار منصوبہ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار سرمایہ داروں کے منافع پر ہے اور اس لئے بحران گھٹنے کے بجائے اور بڑھتا جا رہا ہے۔ مالدار سرمایہ دار دولت کوٹ کر دے رہے ہوتے جاتے ہیں اور غریب اور عریب ہو رہے ہیں اس کا دوسرے افراد زراور جوہر بازار کی کے ساتھ ساتھ بے روزگاری اور ناقص کشتی بڑھتی جاتی ہے۔

مغربی یورپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو موجودہ سرمایہ داری نظام ختم کر کے منصوبہ کو تو کوئی ملکیت بنا کر منصوبہ بندی کریں یا بحران بڑھتا چلا جائے۔ وہاں کے حکمران سرمایہ دار سرمایہ داری بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی بحران کو بھی رد کرنا چاہتے ہیں چنانچہ جب امریکہ نے انداکا شاہ کیا تو وہ اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اپنی آزادی کی بجائے پریتا رہ گئے۔

اب دوسرے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ جو خود سرمایہ دار ملک ہے اس کا قدم رد کر کیسے بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ یورپ سے سرمایہ داری ختم ہو جائے اور بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں امریکہ کا نقصان نہیں ہوا ایک پیداوار تقریباً ڈھائی گنا بڑھ گئی۔ اور اس کے لئے اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور اس لئے وہ یورپ اور دیگر ملکوں کو معاشی طور پر غلام بنانا چاہتا ہے تاکہ انھیں اپنی منڈی بن سکے۔

۱۹۲۹-۳۹ء کی امریکہ کی اوسط برآمد سالانہ ۲۴ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۳۰ فی صد تھی۔ ۱۹۳۶ء میں یہ ۱۰ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۲۹ فی صدی اور ۱۹۳۸ء میں ۱۱ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۲۶ فی صدی ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں درآمد گرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال میں امریکہ اپنا مال بہت زیادہ قیمت پر بیچتا ہے اور وہاں کا مال سستے داموں خریدتا ہے یا یورپ کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول بڑھاتا ہے اسے سخاوت اور رحم کا نام دیتا رہا۔

مارشل کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے جب مغربی یورپ کے ۱۷ ملکوں کی کانفرنس ہوئی تو پہلے ہی دن سے اس کی اصل تصویر سامنے آنے لگی پہلے تو کانفرنس میں ہی میں میں خوب جوتہ چلا بڑی بحث کے بعد سب نے ملکر ایک مشترکہ فہرست پیش کی اور چار

سال کے لئے ۶۰ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا۔

امریکہ اپنی بڑی رقم اور چیزوں کی فہرست دیکھ کر ناراض ہو گیا۔ نائب وزیر خارجہ کیٹین انڈر ہرس نے اعلان کیا کہ ۶۰ کروڑ ڈالر دیا جائے۔ جب یہ تجویز امریکی حکومت کے سامنے لی گئی تو اسے اور گھٹا کر ۵۰ کروڑ ڈالر کر دیا۔ اور اس کے بعد یہ تجویز کانگریس میں پیش ہوئی تو ادھر کی گئی اور صرف ایک سال کے لئے عارضی ملا منظور کی گئی۔

اس کو عملی شکل دینے کے لئے امریکہ نے یورپ میں اپنے سابق وزیر تجارت ہیری ٹرومن کو مقرر کیا اور امریکہ میں ایک کمیٹی بنادی جس کے صدر امریکہ کی سوشل و کی کمیٹی کے ایک سابق صدر ہاف مین مقرر کئے گئے۔

یہ کمیٹی اتنی طاقت ور ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک جلسے اس کے متعلق کہا تھا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے جو نائے مرد کو عورت بنانے کے۔

ہاف مین ان ۱۷ ملکوں میں سے ہر ایک کی معاشی زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ امداد دے سکتا ہے۔ اور انھیں اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ صرف انہیں ملکوں سے تجارت کریں جن کی دہ اجازت دے۔

۴۹

دن شہر میں ہاف مین نے ان ملکوں میں سے ہر ایک کے سامنے مساجد کا ایک مسودہ پیش کیا اور کہا کہ وہ عین جولوہی ممکن اس پر دستخط کر دیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہر ملک کو جو امداد ملے گی اس کا نصف ہر سال کانگریس کرے گی۔ امریکہ ان میں سے ہر ملک کو اپنے مسئلہ کی قیمت کرنے پر مجبور کر کے گا اور وہ ملک کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکے گا۔ یہ مانگ درآمد برآمد کا محصول گٹھا دینگے۔ یعنی اس طرح امریکہ نے نہ صرف یورپ کے ان ملکوں کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول قائم کر دیا بلکہ انھیں اس پر بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی آزادیات میں تجارت کے لئے بھی راستے کھول دیں۔

جب یہ منصوبہ غلام پر آیا تھا تو اسی وقت سوئٹ یونین نے کہا تھا کہ یہ یورپ کو غلام بنانے کا منصوبہ ہے لیکن اس وقت یورپ اور امریکہ کے سامنے پریس نے سوئٹ یونین پر حملہ کئے لیکن اب ایک سال بعد وہاں کے سرمایہ داروں میں بھی یہ دم ختم نہیں رہا کہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ سکیں۔

گزشتہ جنوری میں برطانیہ کی قدامت پسند جماعت کے

اخبار اور لوگوں کو بوز نہ کھا تھا۔

”امریکہ میں دینا تو خشک انڈوں کا سفوف ہے کیسے اس کے معاونین باورسی آزادی چھین رہا ہے؟“
ہرجون کو ایک اور رجعت پرست اخبار سنڈے ڈائمر نے بالکل اسی طرح کی شکایت کی تھی۔

اسی تاریخ رائٹر نے فرانس سے خبر دی تھی کہ وہاں کے ذمہ دار حلقے یہ محسوس کرتے ہیں امریکی ٹرسے سرمایہ دار فرانس کی معاشی زندگی کا کھلا گھونٹ دیں گے۔

آخر کیا بات ہے کہ امریکہ کے قصیدہ خواں آج اس کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت کر رہے ہیں؟ آج اصل حقیقت آنکھوں کے سامنے آگئی ہے اور امریکہ بھی سود خور یہودی کی طرح پیش آ رہا ہے وہ بات جہاں نہیں کرتا بلکہ صاف صاف منہ پر کھتا ہے۔ مارشل پلان کو چلانے والے سب سے بڑے انصراف میں نے ۳۳ مئی ۱۹۴۷ کو سینٹ میں تقریر کر کے ہوئے کہا۔

”ہم بے فکر ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک پیسہ نہیں دیں گے جب تک باورسی شرطیں پوری نہ ہوں۔“

ادبیہ شرطیں کیا ہیں؟ برطانیہ کے سخت احتجاج کے باوجود فرانس کے مسک فونک کی قیمت کو کم کر دیا گیا۔ گرین لینڈ میں امریکہ کو قومی اڈے دیئے گئے۔ جرمنی کے ٹیٹل کر دیئے گئے۔ برطانیہ کا اسٹریٹنگ پلان ختم کر دیا۔ ترکی کو بے شمار امریکی مشینیں کھلے پڑتے ہیں اور ان کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں۔

ان میں نے مذہبی اسل کے مائینروں کو کسی میں بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ اب امریکہ برطانیہ کی ایک تہائی درآمد کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ برطانیہ کو اس پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کا پروگرام مختصر کر دے۔

جب مارشل پلان آیا تو ویب کے ان سولہ ملکوں نے یہ سوچا تھا کہ اصل مدد سے وہ معین خریدیں گے اور اپنے یہاں کی صنعتوں کو ترقی دے کر اس کو ان سے نکلنے کا راستہ پیدا کر لیں گے اور اسی لئے انھوں نے امریکہ کے سامنے جبر پرستی پیش کی تھی اس میں سب سے زیادہ جگہ مشینوں کو دی گئی تھی۔ لیکن ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

مارشل امداد حاصل کرنے والے ملکوں میں ایک بلجیم بھی ہے یہ صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں یہ زیادہ

۸۰

تباہ بھی نہیں ہوا لیکن یہ آج معاشی بحران کا سخت شکار ہے۔ غذائی صنعت کے لئے کچا مال نہیں ملتا ہے۔ فولاد کے کارخانے بند پڑے ہیں۔ یہاں کے فولاد کے کارخانوں کے وائس پریذیڈنٹ نے حال ہی میں اخباروں سے کہا تھا کہ چند دن سے ہم ایک عجیب و غریب صورت حال کا شکار ہیں مارشل امداد سے ہمارا حال بہتر بننے کی بجائے بگڑ رہی ہے۔

یہی حال ناموس سوئیڈن اور ڈنمارک کا ہے۔ ایک سال ہوتا ہے کہ مارشل پلان کے پرستاروں نے یقین دلایا تھا کہ اس امداد سے وہاں کی معاشی میڈیا میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان تین ملکوں نے پانچ سال کے لئے کروڑوں امریکی ڈالروں کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس قیمت کا انھیں ٹرسڈ، لوہا اور فولاد دیا جائے مگر وہ اپنے کارخانے چلا سکیں۔

انھیں نہ صرف اتنی امداد نہیں ملی بلکہ لوہا اور کوئلہ بھی نہیں ملا اور امریکہ نے انھیں مجبور کیا کہ وہ لوہے اور فولاد کی بجائی ہوئی چیزیں خریدیں یعنی اپنے کارخانے بند کر دیں۔

سوئیڈن سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی لوہے کی پیداوار بڑھائے۔ لیکن یہ کچے دھات اپنی صنعتوں کے لئے استعمال نہ کرے بلکہ جرمنی بھیج دے اور اس کے معاون میں، اگر دوسرے مگرٹ دیئے جائیں گے اور ڈنمارک کو پینڈہ مہینوں میں امریکہ کی ہوائی فوٹر گاڑ لیاں دی جائیں گی جو وہ شاید پانچ سال میں بھی نہیں بیچ سکے گا۔

ناموس جہان کی اور ایونیٹی کی صنعتیں تباہ کرنا چاہتا تھا یہ تجربہ نہیں رو کر دی کیس اب اسے امریکہ کے پرانے جہاز خریدنے ہوں گے اور امریکہ کا ناہوا ایونیٹی کا سامان وہاں بھیجا جائے گا۔

اسی طرح انگلستان نے زرعی مشینری، لوہے، فولاد اور فولاد کے سامان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اسے مل گیا ہے شکر، کافی، چھلی، اخبار کا کاغذ اور جڑا۔ جن میں سے اس نے کوئی بھی چیز نہیں مانگی تھی۔ لیکن چونکہ یہ امریکہ کے پاس فاضل ہیں اس لئے کسی کے سر کو منہ صافا ہی ہے۔

برطانیہ نے ۱۹۴۷ میں جنیوی میٹروپل امریکہ سے منگوائی تھیں اس سال اس سے ۳۳ فیصد زیادہ منگوائی ہوئی گی اس لئے کہ بانی من صاحب جو مارشل پلان کے گزرا دھڑاچے ہوؤں کے بہت بڑے کارخانہ دار ہیں۔

یعنی یہ امداد اس لئے نہیں ہے کہ یہ ممالک اپنی ضرورت

کی چیزیں حاصل کر سکیں بلکہ اس لئے ہے کہ امریکہ کا مال بیکے
 ان ملکوں کو اس طرح جو مال ملتا ہے اس کے بیکے کے
 بعد اس کی قیمت تک الگ فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے اور اس پر
 امریکہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی میں مل امریکی مشین کے اخراجات
 اسی فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔
 جرمنی اور آرمی کو جو امداد دی گئی ہے اس سے بے حساب
 فائدہ اٹھا لیا گیا۔ اور یوں روپیہ امریکی بینکوں میں منتقل کر دیا
 گیا ہے۔ کبھی بڑے بڑے ناہر کارخانے امریکہ منتقل کر دیئے
 گئے ہیں۔ جرمن صنعتوں کے بیڈ پر قبضہ کر لیا گیا۔

مغربی جرمنی کی تجارت پر پوری طرح امریکہ کا قبضہ ہو چکا ہے
 امریکہ یہاں کا بنا ہوا مال مثلاً سوئیرس، کیمیا کی اشیاء اور ذوقی کالیا
 نہایت سستے داموں خریدتا ہے اور اس سے ہر سوزنا مانتا ہے۔
 ترکی جیسے ملک کو جو جرمنوں کے ساتھ پوری طرح ملا بھی
 نہیں تھا، نہیں بنایا گئے جو قرضہ دیا گیا تو اس کے ہاتھ چار آدھ رو
 کشتیاں بیچ دی گئیں۔ جن کی قیمت پورے قرضے سے ۷ کروڑ ڈالر
 زیادہ ہے۔ ترکی میں امریکہ کے جو مشین اور مشین ہیں ان پر ترکی حکومت
 کے ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔

حال ہی میں اس سلسلہ میں فرانس اور امریکہ میں جو معاہدہ
 ہوا ہے اس کی رو سے فرانس کسی ملک سے ایسے تجارتی تعلقات پیدا
 نہیں کر سکتا جس سے امریکہ کے تجارتی مفاد پر تڑا تر پڑے۔
 فرانس جو چیز بھی درآمد کرے گا اس کا استعمال امریکہ کے مشورہ
 سے کرے گا۔ فرانس کو باکسٹ کروسیہ اور دوسری کچھ دھاتیں
 امریکہ کو پیش کرنی پڑیں گی یعنی فرانس کو اپنے کارخانے بند کر کے
 فرانس جے۔ فرانس میں امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کو وہی
 حقوق حاصل رہیں گے جو فرانسیسیوں کو حاصل ہیں۔ فرانس بھی
 معاشی زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات امریکہ کو دیتا رہے گا۔
 معاشی تعلقات کے سلسلہ میں فرانس جس قسم کی توفیق امریکہ کو دے گا
 اسی طرح کی مغربی جرمنی، جاپان اور سوئیا کو بھی دے گا۔ یعنی
 فرانس امریکہ کا محکوم بن جائے گا۔ صنعتیں ختم ہوں جائیں گی۔ اور
 ایک نئی ملک بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ مارشل پلان کے ذریعہ نہ صرف یورپ کو غلام
 اور زرعی مالک بنانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اب ان کی نوکلبا
 سے بھی ناہن کمال رہا ہے۔ چنانچہ اس نے امداد دینے کے لئے نہیں

اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ نوکلبا دیاع کے دروازے امریکہ
 کے لئے کھول دیں۔ اس کی سب سے بڑی زور برطانیہ پر
 پڑ رہی ہے اس لئے کہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ
 نہیں تھیں۔

مثلاً ہندوستان ہی کو لیجئے۔ ۱۹۴۶ء میں امریکی درآمد
 ۱۹۴۹ء کے مقابلہ میں ۹ گنا بڑھ چکی تھی۔

اس کے علاوہ انڈونیشیا، انڈونیشیا اور بحیرہ کانگوس
 امریکی سرمایہ تیزی کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ ان نوکلبا دیات
 پر اپنا اثر قائم کر کے امریکہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے کچھ مال
 اور مشینوں کو اپنے قبضہ میں کر لے۔ تمام دنیا کے صنعتی ملکوں کی
 صنعتیں ختم کر کے انہیں زرعی ملک بنادے۔ تاکہ یہ سب کچھ مال
 امریکہ ہی میں اور امریکہ اپنا صنعتی مال دیاں بھیجے۔ جس طرح کھانا
 ایک زمانہ میں ہندوستان میں کیا کرتا تھا۔

اس سلسلہ کی یہ بڑی دیکھ چاہئے کہ مغرب کے سامراجی مثلاً
 برطانیہ، بالٹک اور فرانس وغیرہ مغرب کے حکوم ملکوں (درا
 ملا یا، انڈونیشیا وغیرہ) کی ابھرتی ہوئی عوامی تحریکوں کو کچلنے

کے لئے کروڑوں ادبیہ مرت کر رہے ہیں اور اس کا سامنا فائدہ
 امریکہ اٹھا رہا ہے وہ صرف کچھ مشورے دیتا ہے کہ کیا مال اور
 روپیہ دے دیتا ہے۔ اس سے یہ جفا برہوتی ہے کہ امریکہ کی
 دنیا کے خلاف ایک زبردست معاشی لڑائی چھڑے ہوئے ہے
 اور پوری دنیا کو غلام بنانے کے منصوبوں کو کچلنے چاہتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلا قدم یہی اٹھایا
 کہ مارشل پلان کے ذریعہ یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور
 مغربی یورپ کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مشرقی یورپ کے کوئی
 تجارتی تعلق امریکہ کی مرضی کے بغیر نہ کرے۔

اس سے خود مغربی یورپ کو زبردست معاشی دھکا
 لگا۔ اس جنگ سے پہلے مشرقی یورپ مغربی یورپ کی زبردست
 منڈی تھی۔ مغربی یورپ کا صنعتی مال مشرقی یورپ جاتا اور
 وہاں کا غلہ اور کھانے پینے کی ضروریات مشرقی یورپ سے ہوتی
 ہوتیں۔ اور یہ سلسلہ منقطع ہو جانے سے مغربی یورپ اپنی
 غذائی ضرورتوں کے لئے امریکہ کا محتاج ہو گیا اور امریکہ
 اسے استعمال کر کے اپنا معاشی غلام بنائے جا رہا ہے۔

یعنی مارشل پلان سے مغربی یورپ خوش حال ہونے

جاپان، اسٹریا، مغربی جرمنی، ایران، مصر، شمالی افریقہ اور سعودی عرب میں قائم کر دیے ہیں اور انہیں مضبوط بنایا جا رہا ہے۔

مغرب میں جرمنی اور مشرق میں جاپان میں فوجی صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ پرانے فاسٹنیو کو پھر سے منظم کیا جا رہا ہے۔ تمام ملکوں میں زمینداروں کی رجعت پرست حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں (مثلاً اٹلی، یونان، کوریا وغیرہ) یہی ہو چکا ہے (لاریڈا کی عوامی تحریکوں کو کچلنے میں پورے مدد دی جا رہی ہے۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عوامی قوتیں برہنگہ اس کی مزاحمت کر رہی ہیں۔ خود امریکہ میں ہنری وٹس اور ان کے

ساتھ اس کی سخت مزاحمت کر رہے ہیں۔ مغربی یورپ میں مزدور تحریکیں بڑا برہنگہ کر رہی ہیں اور مقابلہ کر رہی ہیں۔ یونین اور مشرقی یورپ کی جمہوریتیں تیزی کے ساتھ سماجی اور سیاسی ترقی کر رہی ہیں اور مضبوط ہو رہی ہیں۔ چین میں جیت پرست چائنگ کا شیئنگ کی حکومت آخری سانس لے رہی ہے اور برما، ملایا، انڈونیشیا اور دوسرے محکوم ملکوں میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔

امریکہ آج بالکل اسی راہ پر چل رہا ہے جو راہ ہٹلر نے اختیار کی تھی لیکن آج عوامی طاقتیں بہت زیادہ مضبوط ہیں اور امریکہ کا بھی وہی حشر ہو گا۔ جو ہٹلر کا ہوا تھا۔

کے بجائے تباہ حال ہو رہا ہے۔ اس انداز سے بڑے انداز طبقہ اور حکمران طبقہ کی جبین توجہ مازاری سے بھر جاتی ہیں۔ لیکن عوام میں بے روزگاری اور افلاس بڑھ رہا ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود امریکہ کے سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے سوئٹل یونین اور جمہوری محاذ کو کمزور نہیں کر سکے اور نہ مغربی یورپ اور خاص طور سے فرانس اور اٹلی میں درافشاں جمہوریتیں کھربک کو کچلنے میں کامیاب ہو سکیں۔ بلکہ یہ دن بدن بڑھتی ہی جاتی رہا وہ جانتے ہیں کہ جب تک انہیں کھلا نہ جائے تب تک ساری دنیا پر تسلط نہیں قائم ہو سکتا۔ اس لیے وہ اپنی کوشش بڑھا رہا ہے۔

امریکہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف معاشی اور سیاسی لڑائی سے جمہوری طاقتوں کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے فوجی لڑائی ضروری ہے۔

اور آج امریکہ یورپی یونین کے ساتھ اس طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی سرپرستی میں مغربی یورپ کا متحدہ فوجی محاذ قائم کیا جا رہا ہے۔ کانفرنس ہو رہی ہیں اور کئی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ مغربی یورپ کی حکومتوں کے فوجی بجٹ تیزی کے ساتھ بڑھائے جا رہے ہیں۔ فوجوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ساری دنیا میں جنگ کا بخار پیدا کیا جا رہا ہے۔

امریکہ نے فوجی اگے آگے، اٹلی، یونان، ترکی

۸۷

مگر یہ دل کہ مجھے جیسے اختیار نہیں
کہ جیسے مجھ کو کسی شے کا انتظار نہیں
کہ جس بہار کو سوچا تھا وہ بہار نہیں
یہ صبح نو کا آجالا ہے کچھ غبار نہیں

عالی جعفری

نہیں کہ تیسری محبت کا اعتبار نہیں
گزر رہے ہیں کچھ اس طرح رات دن میرے
یہ کیسے مان لوں گلشن میں لب نہیں صبا
نیا زمانہ جنم لے رہا ہے خوف نہ کھا

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۶۹ء

دیوالی

وقار روح کے تاروں کو کیوں چھوڑا تم نے
تیسری نظم "دیوالی" بہت ہی اچھی ہے
مگر — یہ رات کی گردن میں دیپ الالیں
سیاہیوں میں اُجالے کے بد نما ڈھبے
غریب حبشی کو جیسے زکام ہو جائے
یہ ٹٹھکتے دئے —
یہ ٹٹھکتے دئے صبح کا بدل تو نہیں؟

میں سوچتا ہوں کہ اس رات چین و برما میں
کسی مجاذبہ کتنے دئے جلتے ہوئے
جوان خون کی ہر بوند اک کرن بنکر
ایک ایسی صبح کی تشکیل کر رہی ہوگی
ہزار صدیوں کی تاریک سرد راتوں میں
بہی رہی ہے جو انسان کے خواب کا محدود
وہ صبح دور نہیں
اندھیری رات کے سینہ سے نور کا چشتہ
اُبلنے والا ہے

یہ ٹٹھکتے دئے — لکشمی کے چروڑوں میں
تیسری نے حسن عقیدت کے پھول ڈالے ہیں
وہ جن کو لکشمی دیوی سے قرب خاص نہیں
مکروں میں اپنے بھی دیکھ جلائے بیٹھے ہیں
شکستہ جھوپڑیوں کو سجاائے بیٹھے ہیں
کہ اس طرف بھی غایت کی اک نظر ہو جائے
مگر وہ بھوکتے ہیں
شکستہ جھوپڑیوں — ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں
کبھی بھی لکشمی دیوی نہ مسکرائے گی
کبھی بہار نہ اُن کے چمن میں آئے گی
اگر وہ خود ہی نظام چمن نہ بدلیں گے

سیاہیوں کے نمایندے — رات کے بیٹے
ہمارے فکر و تخیل کو باندھنے کے لئے
نو تہات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی کبھی شبِ برات آتی ہے

کے اذہ دھکے ان کی بلونے باپ کو اتنا بھی شوچے کا موجب نہ دیا۔۔۔

پہل دینے کے اندر وہ دہر کہاں سے پہنچا کر گیا۔۔۔۔۔

صحت خوش و خوش رادم دن ایک لال سارڈی اور پیلا چیمبرائی
ہٹنے کے لئے یکسر شام کو اپنے کانوں کو جھلایا۔۔۔۔۔ جیسے جیسے اس
کا گھر قریب آتا جانا۔ اس کے پر اور خوشی سے اٹھتے جا رہے۔ وہ بار بار
ہنس چلا۔ اتنا ہی سوچا کہ وہ صوفی دیکھ کر رہا تا چ اٹھے گی۔۔۔۔۔
اور وہ ابھی اچھی۔۔۔۔۔ رو پائے وہ کھڑے لبنت کے تیار کے
لئے رکھ دیئے جس کے بھی تین چیتے تھے۔۔۔۔۔

کائنات نے اپنا چو کا بدلا۔ دنگڑوں نے نئے بنائے بیٹے۔
کھیتوں نے رنگ برنگی چادریں اور ٹھیس۔ گھر گھر میں بھولے کے کیسے
دھوکھوں پر گونج اٹھے۔ جھگ میں منجھے جس جھیں کرنے لگے۔ اور پڑ
نے نئے راگ کا شروع کیا۔ لبنت رت آگئی۔۔۔۔۔ نوجوان
دلوں میں نئی انگلیں جاگ اٹھیں۔۔۔۔۔ اود۔۔۔۔۔ اور
۔۔۔۔۔ رو پائے نہا کر اپنی وہ لال دھوٹی اور پیلا چیمبرائی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ کٹوڑے کے پانی میں جو منہ دیکھا۔ تو خود بخود اس کی آنکھیں
تھوڑی دیر کے لئے بند ہو گئیں۔۔۔۔۔ اپنی شارب سے خود ہی ہوس
ہو گئی۔۔۔۔۔ جتنا کی آنکھیں بھی اپنی بیٹی کی طرف اٹھ گئیں
اس کے ہونٹ خوشی سے تھر تھار رہے تھے۔ کہ کیا ایک اسکا منہ پیلا
پڑ گیا۔۔۔۔۔ اس کا دل کا تب گیا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ گھر کی مایا۔ وقت اور بدن
سب کچھ ان دودھ والوں کے کھیل کا سامان ہوتا ہے۔۔۔۔۔

وہ بھی ایک دن رو پاکی طرح جوان تھی۔ سندر تھی۔۔۔۔۔ اس نے
اُس کے کانوں کے زیندار نے ایک دن کھیت پر کام کرتے ہوئے
اس کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ گر کر ڈالی تھی۔ پڑوں پر
رہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ظالم کی لاتیں بھی پیس۔۔۔۔۔ اس کی
عزت کے جالے میں کسوی کی بارہ گئی تھی۔ اگر کچھ آبی ادھر سے نہ گئے
ہوتے۔۔۔۔۔ اُسے اُس جھوکے جانور کے ہاتھ دھیسے ہوئے ہی ہو
کس طرح جان بیکر جھلی گئی۔۔۔۔۔ وہ یہ سوچ رہی تھی
بھی کہ وہ لیل اٹھی۔۔۔۔۔ "ماں۔۔۔۔۔ یہ ساری کتنی اچھی
گئی ہے۔۔۔۔۔" اور وہاں۔۔۔۔۔ اکھڑا دھڑل
گئی۔۔۔۔۔ گھر سے تھوڑی دور پر ردام دین نے دو پاکے لئے آکر
کے پڑوں میں جھولا ڈال دیا تھا۔۔۔۔۔ رو پواؤں
دھڑکی۔۔۔۔۔ ؟

زیندار کا شو تھیں اکھڑا دھڑکیں جو لکھنؤ یونیورسٹی کا سر
گڑبھوٹ تھا۔۔۔۔۔ اپنے اردلی کے ساتھ اپنی کم ٹم پر لبنت موسم
اداؤں کا لطف لینے گھر سے نکل پڑا۔ اردلی جوان لکھ کی عادت
سے واقف تھا۔۔۔۔۔ اور اسی لئے اس نے کم ٹم کا طرح کانوں کی طرف
کر دیا۔۔۔۔۔ ؟

اس شہر کے کہنے والے۔ جیاتی میں پائے ہوئے اکھڑے نے بھی
کھجوانی دیکھی تھی۔۔۔۔۔ لیکن رنگا اتری ہوئی۔۔۔۔۔ پاؤں
اور لپٹا شک میں بھی ہوئی۔ سارڈیوں اور چوڑوں میں دھکی ہوئی۔
۔۔۔۔۔ لیکن آج اس نے قدرت کی خوبصورتی دیکھی جس پر نہا
رنگ تھا۔۔۔۔۔ جس میں عجیب الہیوں کا کھنسی تھی معصومیت تھی
اور جو برہنہ تھی۔۔۔۔۔ آج اس نے وہ حسن دیکھا جو خود اپنے سے
بے خبر تھا۔۔۔۔۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔۔۔۔۔ کیسے اچھے
اچھے پھول۔۔۔۔۔ اور دھول میں کھیل رہے ہیں۔۔۔۔۔

اودہ ان سے تو زندگی کی بہت سی باتیں سجاتی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔
کتنے لطف ہوں گے اُس زندگی میں۔۔۔۔۔ کون روک سکتا ہے۔ ۸۵

۔۔۔۔۔ یہ سب ہمارا ہی تو کھاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم ہی فائدہ نہ
اٹھائیں گے تو۔۔۔۔۔ ایک شربتی گلے کی الاپ نے اس کے
ہوائی قلعوں کی عمارت کو اودہ بنی حالت ہی میں ڈھایا۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ دودھ کا گارڈینیں بڑھارہی تھی۔۔۔۔۔
سارڈی اس سے ڈھنگ لگاتی تھی۔۔۔۔۔ جھولے کے پچھے پچھے ساپ کی
طرح لہر لکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ زرخیز نے دیکھا اور۔۔۔۔۔
رنگتار ہی رہ گیا جس غضب کی جاتی تھی۔۔۔۔۔ کیا جس کی
پارش تھی۔ معصومیت نے جس کو چار سپاہیوں لگا دیئے تھے۔۔۔۔۔
اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اپنی یونیورسٹی میں بھی اس سے زیادہ
خوبصورت لڑکی دیکھی ہو۔۔۔۔۔ کم ٹم زرخیز۔ اردلی نے مالک
کی طرف دیکھا جیسے وہ مالک کے دل کا حال سمجھتا ہو۔۔۔۔۔
زرخیز کھوڑا رہا۔ جیسے شکاری گھات لگاتا ہے۔ کہ مہر سے شکار
پر وار کرے۔۔۔۔۔ اردلی اور مالک میں اٹھائے ہوئے
۔۔۔۔۔ اور دونوں اتر پڑے۔۔۔۔۔ ؟

"لے لڑکی۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ سنٹی ہو بانٹیں۔ ذرا
جھولا دو کو۔۔۔۔۔" اردلی نے آواز دیکر کہا۔۔۔۔۔ بیچ ایک بیت لے
صاحب کو جو رو پائے دیکھا۔ وہ گئی اور جھولا روک دیا۔

"تمہارا کیا نام ہے"

«روپا»

”کس کی لڑکی ہو،“

”سام دین کی“

ادھر - جو مالے یہاں نوکر ہے۔۔۔۔۔ تب کو کوئی بات نہیں ہے، ”نرخیں نہ قہقہہ لگائے ہوئے کہا بعد ازاں بھی اس نے کوئی خطا ہوئی تھی لیکن اس بات سے کہ اس کی معافی مل گئی ہے۔ اُسے تسلی ہو اور کہے ہوئے چہرے پر بخوشی کی جھلک دکھائی۔۔۔۔۔ نرخن کچھ اور بھی سمجھا۔۔۔۔۔ سوچا کہ بیڑیا بیچنے کی کو ذرا اٹھا کر وہ کم کم کے گھوڑے کے اگلے ڈال آ۔۔۔۔۔ اردو نے منہ پھینوں پر تادیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ؟

ملک کا کام بھلا کیسے نکالتی ... اردنی وہیں رہ گیا بعد زخم اس کے ساتھ چلے آیا۔

مکڑا ہوا ہاتھ لگا کر گھومی ہوئے کو فیکٹری میں لے جانے کی۔

کمرکش کر رہا تھا۔ رویانے ایک کاجڑہ دیکھا
اس کی وہ زہریلی آنکھیں دیکھیں۔ اس کی گرم سانس سے اپنے کو

جلتے پایا۔ اس نے اپنے بدن کو برہنہ کرتے پایا۔ وہ
ڈرتے کاتب گئی اور رنج اس کے منہ سے نکلی۔ کیا کرتے

ہوا الگ مجھے چھوڑ دو،..... میں تم کے اندر نہ جاؤں گی۔
 نہیں۔ مجھے یہ بہانہ چاہیئیں۔..... میری ماں مجھے دعوں نہ رہی
 مجھ کو..... ناخدا محمد حسن۔

ہوئی۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ عجب میں جیسی چڑیا کو
 باز اس کے آنسو کی حیرت نہیں دیتا۔۔۔۔۔ رو پائے زور سے
 اسے بالکل آزاد رہے۔۔۔۔۔ زخمی رہنے اس کا بڑا مسامحہ

وہ مصیبت کے درد میں ڈوبی ہوئی پکار جھلکیں گویا گھٹیا۔۔۔
اور امداد دین کے کاغذوں میں بکری۔۔۔

..... لاشیٰ سبغا لٹا ہوا ہوا کے مانند وہ ادھر لیک گیا۔
..... لام دین ٹریڈ کر لیک مگر زمین سے اچھل

پڑا۔ جیسے کلی اس پر گری ہو جیسے کسی نے اس کے سینہ
میں چھرا گھونپ دیا ہو جیسے دو پہاڑوں کے بیچ رکھ کر

اس کا دل کسل دیا ہو۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غریب
 نے اس کی بھول سی بیٹی کے لات ماری۔۔۔۔۔ وام دین کی

آکھیں خون سے رنگ گئیں۔ اتنی زور کا بھر پور ہاتھ مارا کہ نرغین

زمین چاٹنے لگا۔ اتنی ہی میں فقہہ کم ہوا، اس کے سر پر اور تیر پر
معلوم کتنی لائیں لگائیں۔ وہ تو اتنے ماری ذات اگر
روائے اپنے ساتھ نہ بیچنے لیتی۔۔۔۔۔ روپا بھی تک سسک
میری تھی ادا دم دین زخمی سانپ کی طرح چھکارے مار رہا تھا۔۔۔
روپا کا بدن ڈرے کانپ رہا تھا ادا دم دین کا فتنے اور انتقام کی
آگ سے۔۔۔۔۔ چندانے جب یہ حال سنا۔ اس کا تعلق
سرد ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے صرف یہی نکلا۔
”کیا دین آدمیوں کا بھی بھائی ہے تو یہی میرا مشورہ“

نظروں پر دیر بعد ادنیٰ ٹوٹا۔ مالک کو چپٹے پرٹے دیکھا.....
جان باقی تھی۔ گھر اٹھا کر لے گیا..... زمییدار کو سب بات

معلوم ہوئی۔ اپنے بیٹے کی اس درگت پر خون کھول گیا۔ لیکن اس وقت چپ رہا۔ یہ اس کے ایک دو دن میں اس کے کمرے کو اس کا منہ چھو

سب اچھا راستہ اپنی عزت کی بچت کا ان غریبوں کی یہی

سمجھا کہ وہ پائی شادی نوراً تین چار دن کے اندر ہی کر دینی چاہیے۔
..... کرشن داس کے گانوں کا انھیں غریبوں میں
..... کے لئے بھلا کر دے۔ آج کل کے گانے بڑے براہ راست

ایک کاٹھ کاٹھا جو اس صنعت کے اچھولوں میں ابھلا کر جو بیٹ محلہ
..... اس نے رد پا کو ایک دن اسی کے گھر پر دکھا تھا.....
..... شادی طے ہو گئی.....

..... وہ راسی تھا شادی سے ہوئی
..... اس واقعہ کے تیسرے دن کی

غریبوں کے گھر کی شادی ہی کیا۔ دوسرے گناہوں کا
اور اس کے تیا۔ چاہا چلے آئے۔ گناہوں کے برہمنے شادی کی رسم

اداکردی..... بڑاکی تیار ی ہونے لگی..... اپنے بچہ کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنے والی۔ باپ انھیں لے کر گھر سے نکلے

دیکھا تو دوا یک لال کپڑی والے سپاہی اور
کچھ زمیندار کے نوکر رام دین کا انتظار کر رہے تھے۔

بغیر کچھ کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالیں..... بی بی
بلکہ بیروں میں لوہے کی بیڑیاں بھی..... جس سے وہ بھاگ

نہ جائے مجھے آخری بار اپنی بیٹی کو گلے لونا لگائے دو۔
 سیکرٹری رام دین اپنی بیٹی کی طرف بڑھا۔ لیکن حاکم صاحب کے

بید کی ایک بوٹے رام دین کا منہ پھردیا۔۔۔۔۔ بید
اس کی آنکھوں پر پڑا اور لڑکھڑکھڑا کر گر پڑا۔ چند اسے سنبھالنے کے

بزدل ہیں، چپیں، کر کے اڑ گئے واپس دینے دیو کا
بلا کر دیا ان سب جھٹکا ہٹوں کے درمیان یہ تھا دوسرا
کی شادی کا مقصد باج اس کی زندگی کے سب سے زیادہ
خوشی کے وقت کا باج ؟

لے آگے ہر جی۔ ایک ڈنڈا اس کے ہاتھوں پر بھی پڑا
ادھر وہ لوہے کی بیڑیاں جھٹکا رہائیں۔ اور ادھر چنپا کی ہما کی
چوڑیاں چھن چھن کر کے زمین پر پکھڑیں بروئے سہ
ڈھکنے نہ سے ایک چمچ رکھی چھپڑ پڑ پڑ پڑ پڑ پڑ پڑ

افلاس

ضمیر کی ملامت و ندامت، احساس و قار کی پامالی،
نفرت، حقارت، انفرادی، انسانیت کے حقوق میں ناقابل
بسیان تلخی!

۸۷ کس طرح ایک مجلس اس تلخی کو نکلتا ہے اور
کس طرح اکثر اذات ہی غذا بن گئے اور پیٹ بھرے کے
لئے دستیاب ہوتی ہے۔ افلاس ان حقائق کا معلم ہے۔
افلاس کچھ اور حقائق کا کثاں بھی ہو سکتا ہے
اگر انسان اس سے بے نیاز ہو کر اپنی روحانی دولت کا
احساس کرے۔ اگر قدرت اور سماج کی نا انصافی کا سہرا
تیری جستجو کے ہاتھ پڑ جائے تو تیرے ٹوٹے ہوئے اعضاء
میں آہن کی سی صلابت اور شعلے کی سی حرارت دور کرنے
لگے۔

کبھی یہ سوچ قدرت اندھی کیوں ہے؟ اور کبھی یہ
غور کہ سماج کی آنکھیں چھوٹی اور دانت بڑے کیوں ہیں؟
کیا تو اس کی طویل انگلیوں میں دو دو کر کے ناخن نہیں بکھتا؟

زندگی کا ایک ناقابل برداشت دور جس کے دن
بغیر روٹی کے، ضعیف بغیر تازگی کے، مشا میں بغیر روشنی
کے اور آتیں بے خواب ہوتی ہیں۔

بے آگ کے چوٹے، بغیر روشنی کے ہفتے اور امید
سے تہی مستقبل، کلیپا تا ہوا احساس، لرزے ہوئے ارادے
تھر تھراتے ہوئے پاؤں اور شکست خوردگی کے کہر میں لپٹے
ہوئے تصورات آنکھوں میں احساس کمتری کا سہ در پونہ لکڑی
پھیلانے، ثابت و سالم لباس میں سے نکلی ہوئی کنہیاں اک
گہمی گزری ٹوپی پر زندگی کا بار گراں، چہرہ پر آفات کی گرد،
لبوں پر نفسِ گرم کے جھکڑ، بغیر تلویں کی جوتیاں تپتے ہوئے
راہچوں کی پیش سے محفوظ برسات کے پانی کی پناہ بھاہیں
اور پھر تاریک و خاموش گھر میں واپسی اور پھر لرزے ہاتھوں
سے دروازے کا ہند کرنا، وہ ہسپاں کی طعنے زنی اور گرجتی
ہوئی قرض خواہی سے محفوظ ہونا، وہ مکانات کی گرج دار آواز
سے بچنے کی کوشش ناکام۔ سچ ہے افلاس زندہ موت ہے۔

سنا

غزل

بے سوز تپشِ نغمہ، بے ذوقِ خلشِ محفل
 کچھ اور ابھی تر سے زخمہ کو ربابِ دل
 ناقہ کا نشان پیدا، غائبِ زلفِ محفل
 منزلِ جے ہم سمجھے تھی گردِ مہِ منزل
 غافل نہ رہے دل کے سرمایہ سے اہلِ دل
 کھو نا ہے اسے آساں پا نا ہو اُسے مشکل
 پیانا نہ وساغرِ بھر پیانا نہ وساغرِ ہیں
 دریا سے نہیں بھتی لبِ تشنگی سے حاصل
 اُس راہ کو طے کرتے گزرے مہِ سال اپنے
 جس راہ میں تھا اپنا ہر نقشِ قدمِ منزل
 عجبی کے مناظر تو آنکھوں سے نہاں تھے
 دنیا کی طرف دل کی وحشت نہیں کیوں کیا
 واعظ! ترے دوزخ کی یہ آگ معاذ اللہ!
 جینا تو کٹھن تھا ہی مرنا بھی ہوا مشکل!

اور انسان دوستی کی قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار انسانی اور ترقي پند لب میں کیا جاتا ہے۔

کبھی منٹو ایسے ادبی تجربے کی کتاب ہے جو اکثر پڑھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس کی چوت بصری کہانی "موتری" جس میں اس نے آج سے چار سال پہلے آکاہ کر دیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کئی غلاظت اچھالی جائے گی، اس افسانے اور بے ڈھب دماغ نے (جو خادات کی ہولناکی) سے پوری حد تک متاثر ہوا تھا جس کا نظارہ اس کی کہانی "کھول دو" اور "اعوذہ عموقل" کے پائے میں اس کے مضامین میں ہوتا ہے۔ خادات کا ایک دوسرا پہلو بھی دکھا کہ قتل اور لوٹ کر لے کر لوٹنے میں مشاق اور عادی مجرم ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر محکمہ خزانہ کے سیدھے اور بے وقوف قسم کے سولہ انسان تھے جن سے وقتی جنون کے زیراثر شرمناک اندھا لمانہ حرکتیں صادر ہوتی تھیں۔ مظالم کے میدان میں ان قاتلوں کا "انا ٹری پن" یا "بھولا پن" خادات کی ہولناکی کو کم نہیں زیادہ کرتا ہے۔ اگر ایک پیشہ و عادی مجرم قتل کرنا چاہا یا جائے۔ تو کوئی خاص تعجب کی بات نہیں مگر جب سیدھے سادے انسان انسانیت کا راستہ چھوڑ کر قتل و خون کرتے ہوئے پائے جائیں تو کچھ عجیبے کہانے تمدنی اور ہندوب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

صحافت کا بڑا نا اعمل ہے کہ اگر ایک نکتے نے آدمی کو کاٹ لیا ہے تو یہ کوئی قابلِ غور بات نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کے کو کاٹ کھائے تو ضرور ایک سنگینی خیز تجربہ ہے۔ یہ خیال ہے کہ "سیاہ حاشیہ" والے لطیفوں کو شائع کر کے منٹو اپنے افسانے اور بے ڈھب انداز میں خادات کے اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا تھا کہ کتاب کا نام ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ ان حرکتوں کے بیان سے لطف اندوز ہونا یا کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقت کے شیشے میں انسانیت کو اس کا نیا اور مضحکہ انگیز حسیں کی صورت میں چہرہ دکھانا

چاہتا تھا۔ تاکہ ہم پہچان لیں کہ خادات میں کون اور لوٹ مار کرنے والے صرف ننگے عادی مجرم اور غنڈے ہی نہیں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمی بھی تھے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ سیاہ حاشیہ لکھنے اور شائع کرنے میں منٹو کی نیت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان واقعات کے انتخاب میں وہ کسی فریبہ و لالچ نہ جذبے سے متاثر نہیں ہوا ہے اور اس نے ان "انا ٹری پن" قاتلوں اور لطیفوں کی فہرست میں ہندو، مسلمان، اور سب کو شامل کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ باوجود اپنی نیک نیتی کے منٹو یہ کتاب لکھ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری وچ توجہ شرمناک دیا جا چکی ہے جس میں منٹو کی تعریف کے کہانے نہ صرف انسان دوست ترقی پسندوں پر چلے گئے ہیں بلکہ منٹو کے مقاصد اور اس کی ادبی قدروں کو مسخ کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن عسکری کو اپنی رحمت پسندانہ نہایت پروردہ والے کے لئے منٹو کی آڑ لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ نجیب اور انیس تو یہ کہ منٹو جیسے ادیب کو اپنی ایک ادبی تخلیق کے لئے عسکری جیسے آدمی کی ستھار ضرر اور تعارف کی ضرورت پڑی۔

عسکری کے دیا جے سے قطع نظر بھی منٹو سیاہ حاشیہ نے لکھنا تو اچھا ہوتا۔ جس نظر سے منٹو نے خادات کے اس مضحکہ المیہ کو دیکھا ہے۔ بہت کم پڑھنے والے وہ نظر یا سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو ان ہولناکیوں کو مزالے کر دی پڑ چکے، غلط اور حواہیت کے بعض مناظر صرف خون کے آنسو روکنے کے لئے ہوتے ہیں۔ دماغ منٹو کا نہ خند بھی سکتا نہیں ہوتا۔ منٹو کا تیز فترت ساج کے پھوٹوں اور ان سوعد میں سے پیپ نکالنے کے لئے اکثر موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر اس نشر سے اس نے چالیس کروڑوں کے پچھلوں کو بھڑکا ہوا تو بہتر تھا۔

بامن آمیزش اوصورت موج است و کنار
دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

ماہنامہ ادبیات فروری ۱۹۷۶ء

گورگی اور ٹاسٹاے

اس کو خواہ اتفاق کیجئے خواہ قدرت کا طریقہ کار خیال کیجئے کرہ بشر مشاہیر کی زندگی دنیاوی اعتبار سے معائب و آلام کا شکار ہی رہی۔ اول تو بہت کم ایسے ہیں جو آسودہ گھروں میں پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی انہوں نے بھی عمرت کی زندگی اختیار کر لی۔ شاید عمرت اور معائب کی زندگی ہی انسان میں وہ خاص اور دل اور نفسی بستی پیدا کرتی ہے جو اس کو دنیا کا امام بنا دیتے ہیں جنابانی اور نفسانی اعتبار سے بھی شاید انسان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جبکہ وہ آسودگی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر دواوی اقدار کو اپنے لیے شعل راہ بنا لیتا ہے۔

گورگی بھی مثل دیگر مشاہیر کے ایک نادار گھر میں پیدا ہوا اور ابھی بچہ ہی تھا کہ یتیم ہو گیا۔ گورگی کے نانا نانی اس حادثہ سے بڑے پریشان ہوئے۔ کچھ دن تو وہ خاموش رہے پھر انہوں نے اپنی بیٹی (گورگی کی ماں) کا نکاح ایک گھڑی ساز سے کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ گھڑی ساز اتفاق سے اتنا بدصورت تھا کہ گورگی کی ماں اس سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ گورگی اپنے بچپن کے حالات قلب بند کرتے ہوئے لکھتا ہے، "اس زمانے میں تیری ماں بڑی افسردہ رہتی تھی، اس کی زندگی اڑنے لگی تھی، مزاج چوڑھا ہوا گیا تھا۔ ان بچپن کے زمانے میں مجھے یوں ہی سا خیال تھا کہ کتنا میری ماں سے زبردستی چھڑ کرنا چاہتے ہیں جس کو میری ماں پسند نہیں کرتی اس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک روز نانا نے دروازہ سے سرنکلنا اور میری ماں سے کہا، "وہ آگیا ہے دروازہ کھولتے ہیں کہ آجائو میری ماں نے یہ سن کر خنجریں تک نہ کی اور گردن نیچے پکچے ہوئے دریافت کیا، کہاں آجائو؟" نانا بولے، "خدا کے لیے

آجائو۔ وہ اچھا آدمی ہے اپنے گھڑی سازی کے کام میں ہوشیار ہے اور ایکسی (گورگی) کے ساتھ باپ کا سا سلوک کرے گا۔ ماں نے تیزی سے جواب دیا، "میں کہہ رہی ہوں میں نہیں کروں گی، اس جواب پر نانا لال پلے ہو گئے اور چلائے، چلتی ہے تو چل ور نہ میں تیری بیٹی اکڑ کر گھٹینا ہوالے جاؤں گا۔" اس پر میری ماں جلائی، "بھم گھسٹو گئے، وہ غصہ میں گھڑی ہو گئی اور اس نے سوائے ایک کپڑے کے باقی تمام کپڑے اتار ڈالے اور کہا، "ہاں اب تجھے لکھٹو، اور وہ خود دروازہ کھول کر کسی حالت میں باہر جانے لگی۔ میرے نانا اب بہت تلخ لائے انہوں نے بہت دانت سے اور کہا، "میری عزت خاک میں ملائی ہے تو ہمیں شباہ کر دے گی، نانا ان پلے ہی سے دروازہ روک کر گھڑی تھیں اور میری ماں کو پرست اس طرح ڈھکیل دی ہی تھیں جیسے مریضوں کو ڈرے میں ڈھکیلے ہیں میری ماں نے نانی سے کہا کہ ان کھول کر سن لوں اس کے پاس نہیں جانے کی، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گورگی کس طبقہ کا آدمی تھا اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی تھی۔

اگر معائب صرف یہیں ختم ہو جاتے تب بھی غنیمت تھا لیکن گورگی کی قسمت میں جلد ہی ایسے روئے بھی لکھا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد گورگی کی ماں فطری جذبات سے متاثر ہو کر ایک شریف زادے کے ساتھ اسکو بھاگ گئی۔ وہ میاں ابھی کالج ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ جب تک روپیہ رہا اسکو تیس خوب دیکھ کر رہے جب روپیہ ختم ہو گیا تو رو مانت بھی ختم ہو گئی اور دولہا صاحب بھی اس پر مجبور ہوئے کہ ساس و سسر کے پاس پناہ لیں۔ گورگی کی زندگی کا یہ زمانہ بہت تاریک گزرا ہے،

کیونکہ اس کا سوتیلہ باپ نہ صرف گور کی کے ساتھ بلکہ اس کی ماں کے ساتھ بھی برا سلوک کرتا تھا۔ اب اس نوجوان کا دل محبت سے سر ہو چکا تھا۔ گور کی کی ماں جب ماسکو سے واپس آئی تو حالت امید میں تھی اور کچھ اس وجہ سے اور کچھ مالی مشکلات اور شوہر کی بے رحمی کے سبب اپنی روح پر کھو رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی صورت کا مذاق اڑاتا اور چٹانے کے لئے اپنی نئی عیاشیوں کے افسانے اس کے سامنے خریہ بیان کرتا۔ درود اس کی ان باتوں سے اس قدر کڑھی کہ اس کو دفن ہو گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے گور کی دیوار کے پاس کھڑا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو نوجوان سے یہ درخواست کرتے سنا کہ وہ بھی اس صورت کو دیکھنا چاہتی ہے جو نوجوان کی محبت کی مالک ہو گئی ہے۔ گور کی اسی سوچ میں کھنسا ہے۔ بس یہی وہاں تھا کہ دیوار کے پیچھے سے گونے کی آواز آئی۔ میں خود آ لپکا۔ دیکھنا کیا ہوں کہ میری ماں ٹھٹھوں کے بل گری پڑی ہے۔ اس کی بری حالت ہے اور میرا سوتیلہ باپ چمکدار پوشاک پہنے پاس کھڑا ہے اور اس کے سینے پر ٹھوکریں مار رہا ہے۔ گور کی کو یہ منظر دیکھ کر تباہ نہ رہی اور اس نے میز سے چھری اٹھا کر لڑنے سوتیلے باپ کے سر سے جس سے کڑے تو پیچھے۔ لیکن پوٹ نہ آئی۔ گور کی آگے چل کر لکھتا ہے کہ اسی روز شام کو آباں جان میرے پاس آئیں۔ مبارکباد اور رو کر کہنے لگیں، میں خود کو نہ محسوس کرتی ہوں مجھے صاف کڑوہ ہے۔ اس زلمے کے واقعہ ہیں جب گور کی چھ سال کا تھا۔ جب ۶ برس کا ہوا اس وقت لکھتا ہے۔ چالیس برس گزر گئے لیکن آج بھی اس کمینہ پر کو ایک عورت کی چھائی پر غریب لگا ہے رکھتا ہوں۔ اس چھری کے واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد گور کی کا سوتیلہ چھائی پیدا ہوا۔ ماں تو بچی کے زمانے ہی میں رحمت ہو گئی اور ماں کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ بچہ بھی چل گیا۔

ماں کے بعد گور کی کا زمانہ نانی کے سوا کون تھا چنانچہ وہ وہیں رہنے لگا۔ یہاں کا ماحول بڑا خراب تھا۔ گور کی کے ماموں خرابی، کبابی اور عیاش تھے۔ ہر وقت باتو آپس میں با اپنے ماں باپ سے ہر سر پر سیکار رہتے تھے ایک دن ایسی لڑائی ہوئی کہ گور کی کی نانی کی باخند ٹوٹ گئی۔ گور کی کا ابتدائی بچپن ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گزرا۔ جب دراصل ہوا تو نانی نے اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن اسکول کے وقت کے علاوہ گور کی ایک بوری سے سڑکوں پر رندی۔ دھچیاں اور کیلس وغیرہ چننا

۹۲

پھر تارا اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا نانی ماں کو لاکر دیدیتا۔ لڑکپن شروع ہوا تو تین ختم ہو گئی نانی نے ایک جوتے والے کی دکان پر نوکر کر لیا۔ اس دکان پر پہلا سبق یہ ملا۔ بے ایمانی کے بغیر کمال نہیں ہوتی۔ گور کی اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ دکان کے نوکر بے ایمان تھے دکان کی چیزیں اڑا لیتے تھے۔ ایک دن غریب کے گریے کا درد بان میرے پاس آیا اور مجھے بھلائے لگا کہ اس کے سر کا ایک جوتا چرا کر اس کو دیدوں۔ میں نے کہا اچھا تم بڑے آدمی ہو تمہارے سفید بالوں کی خاطر مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔ یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربان بولا اگر میں تمہاری چوری کا ذکر مالک سے کر دوں تو کیا ہو؟ دربان کی اس دھمکی سے میں بہت ڈرا۔ میرا خوف دیکھ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور چوری کے ارادہ پر مجھے بڑا عجیب لگا بھڑکنا۔ میں اس لڑکے کی یہ خیالی کرتے ہو کر انسان انسان کے ساتھ بُرائی نہیں کر سکتا۔ ابا ہا تم جیسے بے یقوت ہو۔ گور کی ملازمت چھوڑ کر نانا نانی پر رہ گیا۔ اب نانی اور بڑا سے مشکل میں جاتے اور وہاں سے ریس بھری اور خشک پیسے منجن لاتے اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا وہ نانی کا لاکر دیدیتیں۔ اس پر بھی نانا انھیں لگا لے، غراتے اور کہتے تم تو کھانا جانتے ہو کما نا نہیں جانتے۔ کچھ دن بعد نانی نے نانی بہن کے لڑکے کے دفتر میں گور کی کو بلا دیا۔ وہ بل سالانہ پر کھلوا دیا۔ وہاں دفتر کی نانی نے گور کی کو اتار پریشان کیا کہ ایک روز جب اس نے میز کا شے لانے کے لئے گور کی کو پیسے دئے تو بجائے ناشتے کے کو دفتر جانے کے وہ دیا ہے وہاں کے کنارے سے نکل گیا اور ایک جہاز پر ملازمت کر لی۔ خدائی قدرت کہ اس جہاز کے بڑے باورچی کو کتنا جس سنے کا شوق تھا اس نے گور کی کو یہ خدمت سپرد کی۔ اس طرح گور کی کو افسانے بڑھتے کا خوب موقع ملا اور شوق بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ یہ ملازمت ایک خاص سہاویہ کی تھی اس لئے جب وقت پورا ہو گیا تو ملازمت بھی ختم ہو گئی اور گور کی کے سامنے پھر بڑا کامسلا آ گیا وہ تلاش محاش میں کشمیر، شہر، شہر پھر پھر پھر تا اٹلس پہنچا جہاں حسن اتفاق سے اس کا ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ہمدردی نے گور کی کی زندگی بنادی۔ یہ شخص کلی آرتھی نامی ایک انقلابی تھا جو سا بر بار میں چھ سال کی قید، اشتیاق کاٹ چکا تھا اس کا ایک بہت اچھا ذاتی کتب خانہ بھی تھا یہ شخص گور کی کا شائق ہو گیا اور اس نے آوارہ گرد گور کی کو اپنے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی۔ جب دوستی بڑھی تو ایک دن کلی آرتھی نے گور کی

گوکرے میں جنکرو یا اور کہا کہ جب تک اپنی زندگی کے حالات ایک معنوں کی شکل میں قائم نہ کر دو گے دروازہ نہ کھلے گا نہ پتہ گوکرے کی حکمرانی کی اور وہ معنوں مقامی سرکاری اخبار میں ۲۴ دسمبر ۱۸۹۶ء کے پرچہ میں طبع ہوا۔ گوکرے نے جب اپنی خود نشہ سوانح حیات سرکاری اخبار میں تو بھی تو بہت سرور ہوا اب وہ کہانیاں لکھنے لگا اور رسائل میں بھیجے تاکہ جس سے اس کی کچھ کچھ شہرت بھی ہونے لگی۔ لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی اس زمانہ میں ایک وکیل کی محوری کر لی۔ بخیر خواہی تو عشق کی سوچھی ایک پولیڈ کی عودت سے شادی کر بیٹھے ایک مکان دو روہل جیت کر رہے رہا وہاں عصرت میں بسر کی نتیجہ یہ نکلا کہ بھیمپوں کی دق ہو گئی۔ بھلا دماغی انسان اور بے دماغ عودت کی کتب نہہ سکتی ہے ایک دن گوکرے اور اس کی بیوی کہ ہم اغوش تھے تو گوکرے نے اس کو محبت کے متعلق اپنا نظریہ سمجھا ناشر دیا کہ گوکرے کا لکھنا ہے۔ وہ میری باتیں سن کر سمجھو گی اس کی ہو گئی اور کہنے لگی کیا واقعی تمھارا یہ خیال ہے۔ کیا واقعی تم یہ خیال کرتے ہو؟ وہ گوکرے کی ہم خیال نہ تھی۔ اس کا نظریہ محبت بعض نفرتی تھا۔ وہ گوکرے کے دوستوں نے بے تکلف بھی جس سے اس کو حسد ہوتا تھا۔ گوکرے اپنی اس کمزوری کو فلسفہ کے رنگ میں دھال کر یوں بیان کرتا ہے۔ "مرد کی زندگی میں چند لمحے ایسے آتے ہیں جب وہ اپنا دل عودت کے سامنے اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے جس طرح کہ خدا کا پرستار خدا کے سامنے اپنے ظاہر و باطن کو بے نقاب کرتا ہے۔ جب عودت کے درپردہ مرد کا باطن بے نقاب ہو جاتا ہے تو مرد خود اپنے آپ سے اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید مرد میں خدا اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی شریک حیات دوسرے مرد سے اتنی اناؤں نہ ہو جائے کہ وہ شوہر کی لڑائی باتیں دوسرے سے کہہ دے" "وقتہ کوتاہ کچھ عجیب ہو گوکرے اور اس کی بیوی میں ملحدگی ہو گئی اور گوکرے کی اندر سے آوارہ گردی کرتا رہا سارا پہنچ گیا جہاں اس نے اخبار کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

اخباری دنیا میں داخل ہوجانے سے زیادہ میل جول اور شہرت ہو ہی جاتی ہے چنانچہ گوکرے کی بھی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔ اگر ایک طرف شہرت برہمنی تو دوسری طرف اسکو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ گوکرے کی ۱۸۹۶ء میں بہت سخت بیمار ہو گیا بھیمپوں کی دق تو دق کر رہی تھی لیکن جب کمزوری برہمنی تو ایک اور کھ عود کر آیا۔ اخلاص و مصائب کے زمانہ میں گوکرے نے خود کشی کی نیت سے اپنے گون مار لی تھی جو کہ جس ہی رہ گئی تھی اب اس گولی نے بھی تکلیف دہی شروع کر دی۔ حرارت ۱۰۳ درجہ رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن تو علاج کیا پھر زندگی سے ناامیدی ظاہر کی لیکن گوکرے کی کامیابی اتنی مضبوط تھی کہ وہ بیمار ہی کو سنبھال لے گیا۔ صحت ہو گئی تو دوستوں نے زور دیا کہ اناؤں کا مجموعہ طبع کر دیا جائے۔ شاید اس سے گزارے کے لئے کچھ رقم وصول ہوجائے بڑی مشکل سے اناؤں نے طبع ہونے اور اس سے زیادہ دشواری سے دوکانداران کو یہ فیصلہ دینا پسند لے کر فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ لیکن کتب فروختوں کی توقع کے خلاف ایک سال ہی میں ساری کامیاں فروخت ہو گئیں۔ جب اناؤں نے دوسری مرتبہ شائع ہونے اور ناشرین سے گوکرے کو ایک ہزار روہل دنانہ کیے تو اس غیر متوقع خوش قسمتی پر گوکرے کی بہت خوش ہوا۔ اس کے پڑوسی کا بیان ہے کہ جب گوکرے کو ایک ہزار روہل ملے تو اس کو خوشی کی بہت ۳۳ حیرت ہوئی وہ میری ماں کے پاس آئے اور ٹانگیں جوڑی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "دیکھو! دیکھو! انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روہل بھیجے ہیں۔ شیطان ان کو سمجھے انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روہل بھیجے ہیں۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا۔ اسی دن سے گوکرے کی فغول خریاں شروع ہو گئیں۔ سارا میں گوکرے کے ساتھ ایک اور دھپ دھت پیش کیا جس کو اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک روز دریا نے آگ کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ آواز آئی مدد کرنا! ارے بھائیو مدد کرنا! بات اندھیرا تھی کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا کہ کئی دریا میں ہاتھ پیرا رہا ہے۔ میں فوراً دریا میں کود پڑا تیرتا ہوا ڈوبنے والے کے پاس پہنچا اتفاق سے اس کے بال میرے ہاتھ میں آئے۔ میں بال پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا لے آیا جب کنارے پر آئے تو اس آدمی نے اچانک میرا گلہ پکڑ لیا اور کہنے لگا اے! تجھے کیا حق تھا کہ میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچا، میں نے

جواب دیا، ارے بھائی تم ڈوب رہے تھے۔ مدد کے لیے چلا ہے
تھے وہ بولا، ارے احمق پانی تو میرے کندھوں تک تھا۔ رستی
میں نے بیکڑھ کر کھٹی تھی پھر میں کیسے دو تباہ کیا تو اندھا ہے، میں
نے جواب دیا۔ لیکن تم مدد کے لیے تو چلا رہے تھے کیا نہیں چلائے
اس نے کہا پھر کیا تھا اگر میں مدد کے لیے چلا یا۔ فرض کرو کہ میں
چلاؤں تو احمق ہے۔ تو احمق ہے تو کیا تو اس کا یقین کر لے گا۔
اچھا اب یا تو مجھے ایک روپل دے دو نہ تھانے جل، میں نے کچھ
دیر تو اس سے محبت کی پھر احساس ہوا کہ اپنے نقطہ نگاہ سے
یہ بھی درست کہتا ہے میرے پاس تانے کے کچھ سکتے تھے وہ اس
کو دے کر جان چھڑائی اور گھر ہو گیا۔ اس تجربہ کی بنا پر دنیا
کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھنے لگا۔

گورگی کی شہرت ہوئی تو اے۔ درست چیخوت..... نے
گورگی کو غیر معروف وطن ترک کرنے اور ماسکو کی رہائش اختیار
کرنے کا مشورہ دیا لیکن گورگی نہ مانا۔ آخر کار چیخوت کو ایک
ترکیب سوچی اس نے گورگی کو لکھا۔

”کل میں ناٹشائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انھوں
نے تمہاری بڑی تعریف کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ تم
قابل قدر مصنف ہو۔ انھیں تمہارے دو خانے،
گو لٹریچر، اور ادب۔ دی رافٹ، بہت پسند ہیں لیکن
ماہرین نہیں آیا۔ وہ فرماتے تھے کہ جو کچھ تمہارا دل چاہے تم ایجاد
کر لو لیکن نفسیاتی کیفیات ایسا وہ نہیں ہو سکتیں تم ایسی کیفیات ایسا
کرتے ہو جو کم از کم ناٹشائے کے تجربے میں نہیں آتے میں نے ان کی
خاصیت میں مبالغہ کر دیا ہے کہ جب بھی تم ماسکو آؤ گے تو تم
اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

ماہرین کے تمہارے متعلق مدت سے دریافت کر رہے
تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہاری بابت بہت
اچھا خیال رکھتے ہیں۔“

یہ معلوم ہونا ناٹشائے کے دل چاہنے پر کسی کو خیر مصنف
کے لیے باعث فخر تھا۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملنے ہی گورگی
نے ماسکو جانے کی ضمانت لی لیکن اس زمانہ میں اخباری زندگی
کے انقلابی مقابلے رنگ لارہے تھے اندر پولیس بھی بڑی ہولناکی
تھی ایک مدت بعد جب پولیس سے رہائی ملی تو جنوری ۱۹۱۷ء
میں گورگی ناٹشائے سے ملنے گیا ناٹشائے اس ملاقات کے

مستقل اپنی ڈائری میں اندراج کرتے ہیں۔

”گورگی ملنے آئے ان کے ساتھ باتوں میں اچھا وقت گزرا
مجھے گورگی کی پسند آئے۔ ایک عام روسی کی نفسیاتی کیفیت
کے پورے ترجمان ہیں۔ اور خود بھی انھیں میں سے ایک ہیں
گورگی اس پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”ملاقات مجھے کتب خانے میں لے گئے مجھے بٹھایا اور خود
میرے سامنے بکرے کریمے افانڈ“ دارنکا کی تحلیل
کرنے لگے کہنے لگے۔ تمہارے افسانے کی وہ لڑکی دارنکا
صحت کی، اچھی اور کبھی پندرہ سال لیکن وہ تخلیقیت
سے بے پروا اور وہ نوجوان پر وہیر سے ہم آغوش تک
نہیں ہوئی یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نفسیاتی طور پر غلط ہے
پندرہ سال کی نوجوان لڑکی یہ چاہی ہے کہ کوئی اس
کو چھوئے اور اس سے ہم آغوش ہو۔ ٹاٹا نے اسے دوڑا
گفتگو میں اس نے عجابی برتی کہ میں پریشان سا ہو گیا۔
کبھی کبھی ان کی گفتگو صرف نامناسب ہی نہیں بلکہ گندی

تک پہنچاتی تھی۔“

ٹاٹا شائے کی ایسی ہیئت و طرز گفتگو پر پہلے پہلے تو گورگی کو یہ گمان
ہوا کہ شاید ٹاٹا شائے اس کی سطح پر آ کر اس سے گفتگو کرتے ہیں
خاید یہ روسی ادب کے جنرل اس کو دیہاتی خیال کر کے اس سے
گھاؤں والوں کی سختی گولی کرتے ہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے
بعد گورگی پر یہ انداز ظاہر ہوا کہ ٹاٹا شائے اصولاً دیہاتی زبان
بولتا لیکن کرتے ہیں کہونکہ اس میں تشعب اور بناوٹ نہیں ہوتی
وہ زبان دلی اور شہری زبان کے تنکلفات کو اچھا نہیں سمجھتے
جب دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو پچھلے دن جانے ہیں گورگی
کا بیان ہے۔ ”بعض مرتبہ ٹاٹا شائے ایسی عریاں گفتگو کرتے تھے
کہ ہمارے چہرے پر غم سے سرخ ہو جاتے تھے۔“

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ٹاٹا شائے، گورگی اور چیخوت ٹبل
رہے تھے کہ وقتاً فوقتاً شائے نے چیخوت سے اس کے نوانی
تجربات بیان کرنے کی فرمائش کر دی۔ چیخوت بہت پریشان
ہوا۔ جب شائے نے چیخوت کی گھبراہٹ دیکھی تو خود
انے نوانی تجربات ایک خاص لطف اور رنگینی کے ساتھ
بیان کرنے شروع کر دیے گورگی لکھتا ہے۔ ”اس وقت گندے
سنگند الفاظ بھی جوں بالوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے

نکلنا تھا وہ اپنی غلطی کو دیکھتا تھا اور سادہ قدرتی معلوم دیتا تھا کہ کیا کام ایک اور واقعہ گور کی کا ایک دوست گور کی کی زبانی اس طرح بیان کرتا ہے۔

”ایک دن میں اور اس کا دوست سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر اٹھائے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک سمند کی شے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ ہم نے اوپر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کبوتر کا جو تاج سبز پر خلیجی کجبت میں مشغول ہے اور چہرہ دیدہ لطف آستانہ کی طرف آنکھ مار رہا ہے کہ کیا ہے وہاں پر گور کی اور اٹھائے میں خط و کتابت شروع ہو گئی، چند خطوط نوشتا پیش ہیں۔

گور کی کا خط اٹھائے کے نام۔

”تیرے بھائی گور کی اس جن اخلاق کا جو آپ نے مجھے سے روکا تھا شکریہ مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور آپ سے نیاز حاصل ہو جانے پر بخیر کرتا ہوں۔ اگر مجھے پیل سے اس کا ملے تھا کہ آپ ہر زمان سے سادہ اور پر غور طریقہ پر ملتے ہیں لیکن جو کجبت آپ نے میرے ساتھ دوا رکھی ہے کی مجھے امید تھی۔ اگرنا مناسب خیال نہ فرمائیں تو ابھی ایک تصویر بد نہ فرمائیں۔ میں بتاتی ہوں کہ تصویر سے محروم نہ فرمائیں۔“

اے۔ پیٹون (گور کی کا نام)

”اٹھائے کا خط گور کی کے نام
”معاذ کرنا کہ میں ایک عرصہ کے بعد جواب دے رہا ہوں اور ہنوز تصویر بھی دوا نہ کر سکا مجھے تم سے مل کر ادا تم کو زیادہ قریب سے جان کر بہت خوشی ہوئی اور میرے دل میں جو تھا وہی کجبت ہے وہ مجھے مسرور کرتی ہے۔ اگ کوئی کہا کرتا تھا کہ یہ نصف اپنی نصفیت سے بہتر ہوتے ہیں یا تو چند خراب۔ میں تمہاری تعائین کا متراج ہوں لیکن ان سے زیادہ تھا اور متراج ہوں میرے اس جملہ سے سمجھ جاؤ کہ میں تمہارا کس درجہ متراج ہو گیا ہوں۔ تمہاری نسبت میری تعریف اگر قابل قدر ہے تو صرف اس لئے کہ یہ بے لوث ہے۔ اچھا رخصت میں غلوں سے اپنا ہاتھ تمہارے معاقد کے لئے پیش کرتا ہوں۔“

یوٹا اٹھائے

گور کی کا خط اٹھائے کے نام

”آپ کی تصویر دلاؤ کجبت بھرے الفاظ کا بہت بہت شکریہ۔ لیونیکو پوج۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ذات میری تعائیف سے بہتر ہے لیکن سیریل خیالی مژدہ ہے کہ یہ نصف اپنی نصفیت سے بہتر ہوتا ہے، آخر کتاب ہو گیا؟ ایک مرکز آرا کرنا ابھی مردہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو صرف حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برطان اس کے انسان کی زندہ ذات خدا کی صفات کی حامل ہوتی ہے میرا خدا کا مفہوم حد بہ ہے جو انسان کی حقیقت شناسی، انصاف اور ہے آپ کو کل بنانے پر ابھارتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک بلوان کی ایک ابھی کتاب سے بہتر ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ میرا یہ راسخ یقین ہے کہ اس زمین پر انسان اشرف المخلوقات ہے اور مجھے دیکھ کر کہیں کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ صرف انسان کا وجود حقیقت ہے باقی سب زاید بیکار ہے۔ میں انسان کا پرستار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ ہاں میں اس جذبہ کو پوری طاقت سے دہاؤں کہیں کر سکتا۔ میں تجدید ملاقات کے لئے مضطرب ہوں اور بدھ انوس ہے کہ فوراً ہی اپنی آندہ پوری نہیں کر سکتا مجھے کھانسی ہے اور دودھان مرکی شکایت ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تیری سے کام کر رہا ہوں۔ آج کل مزدت سے زلیو۔

عقلان لوگوں کے متعلق افسانہ لکھ رہا ہوں میرے خیال میں ایسے افراد بنائے آپ کو عقلان تصور کر رہے ہیں اور ذل المخلوقات ہوتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ مزید تحریر کہیں آپ کو اکتا نہ دے۔ اچھا رخصت میں عودا اب سے معاقد کرتا ہوں۔ میری طرف سے گھر والوں کو ڈاؤب۔

میں ہوں آپ کی محبت کا دعا گو

اے۔ پیٹون

”کچھ عرصے بعد گور کی پھر روسی قلند کے پاس آگئے اور اس کی ہلکا کا بنو رہا انوکھنے گئے دو دنوں ساتھ بیٹھے جاتے تو اٹھائے گور کی کے افسانوں کے کرداروں کا برملا مذاق آراتے اور کہتے۔ گور کی تم اپنے کردار ایجاد کرتے ہو۔ کبھی کہتے تمہاری تعائیف سے تمہاری

..... باتیں زیادہ دلچسپ ہیں، ایک فیکٹ ہے کہ گورنر کی تمردا نہایت پسند ہو، مترجم ہو، اس قسم کے لوگ اشتراکی نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کی پسند ہوتے ہیں۔ ہیروگو۔ ہیروگو بالکل فضول، بکواس، باب بتا رہا، اضافہ ساز، مجھے پسند ہے کہ لوگ اس میں تم نے ایجاد سے کام نہیں لیا ہے اور وہ تمہارا دوست چون شکیپر سے بھی خراب ڈراے لکھتا ہے، ایک دن ٹالسٹائے لکھنے کے ہم سب ادیب نے نئے ٹیبلر ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھو جب میں اضافہ لکھتا ہوں تو کسی کردار پر مجھے رحم آنے لگتا ہے اور اس میں چند اچھی خصوصیات پیدا کر دیتا ہوں اور کبھی کسی کردار کو اچھی خصوصیات سے محروم کر دیتا ہوں تاکہ سب کردار ایک دوسرے سے گرنے نہ پائیں اور پھر خریدہ لکچریں فرمایا، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ادب مجھوت ہے، ایک دھوکا ہے اور اس وجہ سے مذکورہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر گورنر کی اپنے ہی گھر کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ جب ٹالسٹائے کو گورنر کی کے گھر سے اس حادثہ کی خبر دی تو ٹالسٹائے نے فوراً ہی ڈارووس کے بہنوئی اور وزیر خارجہ کو خطوط لکھے جو حسب ذیل ہیں۔

ٹالسٹائے کا خط ڈارووس کے بہنوئی کے نام

جناب ذیاب صاحب!

وہی مصنف گورنر کی جس کی بابت گزشتہ سال سیری اور آپ کی باتیں ہوئیں تھیں جس کی تصانیف کی آپ نے تعریف فرمائی تھی۔ اس بڑے حادثہ کے بعد وہ اپنے اہل و عیال سے چھین لیا گیا ہے اور بلا کسی عدالتی سماعت کے گورنر کی جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی ساری حالت افسوسناک ہے۔ جیل کے سخت شکن ماحول کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک دن کے مریض کے لئے کہتا: شہنشاہت ہو سکتا ہے۔ گورنر کی سیری وہ اس کے دوستوں کو جو کچھ اس کا علم ہے کہ شہنشاہت ایک انسان اور مصنف کے میں گورنر کی کوئلہ کرتا ہوں اس لئے انھوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ اس مصیبت میں جو کچھ ممکن کی ہو کر سکتا ہوں کروں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مجھے افسوس ہے کہ گورنر کی کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں آپ کی بیخبری میں مجھے اور سب کی سب کا جو یہ موقع ملا ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، آکا اعلیٰ

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۲۹ء

ٹالسٹائے کا خط وزیر خارجہ کے نام

جناب مالی۔ گورنر کی جو ی اور اس کے دوستوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ پیشتر اس کے کہ گورنر کی جیل میں بلا سماعت مقدمہ گورنر کی کو قتل کر دیا جائے میں اس کی روایت کی کو قتل کروں اس خاص جیل کے موت شکن حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں اُن کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ایک دن کا مریض ان حالات میں نہ جانے دن تک زندہ نہیں رہ سکتا جس کو سب کو کورن، اسی حیثیت سے نہیں جانتا کہ وہ پورے ایک مہینہ ادیب ہے بلکہ اس کو ایک معمول اور دلچسپ انسان چھٹی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ اگر یہ معمولی طور پر یہ بیان کیا جائے تو یقین مجھے تیسرے گورنر کی اور اس کے اہل و عیال سے آپ ہمدردی فرمائیں گے اور جو کچھ آپ کے عزیز و قدرت میں ہے اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ افسوس ہے کہ مجھے نا اُمید نہ فرمائیں گے.....

لیونا ٹالسٹائے

ان خطوط کا یہ اثر ہو کہ گورنر کی کو جیل سے نکال کر مرصن حراست میں رکھا گیا اس حراست کے دوران میں گورنر کی ٹالسٹائے کو قتل کئے ہیں۔

لیونیکو یوج۔ میرے معاملے میں آپ نے جو سبھی فرمائی اس کا بہت شکریہ۔ میں جیل سے رہ کر گزارا کیا ہوں لیکن حراست میں ہوں۔ میری جو ی حالت افسوسناک ہے اس لئے حراست بھی رحمت ہے شاید ایک ماہ جیل میں رہا ہوں گا۔ اس عرصے میں میری صحت پر برکوتی خاص پڑا فر نہیں پڑا اور نہ میری جو ی کی صحت پر عدالتی تحقیقات جاری ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس تحقیقات کا نتیجہ نکالے گا کہ وہ مجھے وطن سے دور کہیں بھیج دے گا اور پولیس کی نگرانی میں رکھیں گے۔ دو بارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کی سبھی ساری جان ہوتا ہوں کہ اس معمولی سے معاملہ میں آپ کو تکلیف اٹھائی پڑی۔

یہ حراست بڑی مضحکہ خیز ہے اگر ایک سپاہی یا درچی خانہ میں ہے تو دوسرا اچھے پرادر تیسرا سڑک پر۔ میں گھر کے قریب جیل قدمی کر سکتا ہوں لیکن پولیس کا سپاہی سایہ کی طرح ساتھ ہے۔ مجھ ان سڑکوں پر جانے کی اجازت نہیں جہاں آمد و رفت زیادہ ہو

ساحس کو بھی ایک ایسے انسان کی نظرانی کرنا مشکل
 معلوم ہوتی ہے جس کا ارادہ کسی بھی وطن سے فرار نہ
 کا نہیں۔ اچھا شخص، آپ کو محبت، طاقت اور
 سکون قلب حاصل ہو۔ میں غلوں کے ساتھ آپ کے
 مصافحہ کے لئے اپنا ہتھ پش کرتا ہوں۔
 اے چچو

۱۶ جولائی ۱۹۰۱ء کو جب ٹالٹائے ایک خطرناک حالات کے
 بند محبت باب ہوئے تو دنیا کی ہر سمت سے تہنیت و مبارک باد کے
 تار آئے گوئی کے وطن سے بھی حسب ذیل تار آجاس پر سب سے
 پہلے دستخط گوری کے تھے۔

”سب لوگ بے حد مسرور ہیں کہ آپ دوبہ محبت ہیں۔
 اسے بزرگ انسان ہمارے دل میں تپنے کے حق پرست
 کے لئے تو اس دنیا میں محبت باب رہے تاکہ ترسے
 انتھک شریکیت الفاظ جو ٹھٹھ، کینہ اور نفرا کے
 خلاف ہمیشہ جہاد کرتے رہیں“

۱۷ جولائی ۱۹۰۱ء میں جب ٹالٹائے صحت کے خیال سے کمرتیا
 گئے تو اس زمانہ میں دونوں دوق کے مریض گوری کی ادھیڑت بھی
 روسی خاندان کے پاس پہنچ گئے گوری نے ایک باورداشت جوڑی
 ہے جس کے حسب ذیل اندراجات درج ہیں۔

”ایک دن گوری نے دیکھا کہ ٹالٹائے اپنی بیٹی میں
 ہاتھ دیے کھڑے ہیں اور ایک گویہ (بڑی قسم کی
 چھپکلی) سے جو صوب کھا رہی تھی کہہ رہے ہیں
 ”مزا رہا ہے نا، پھر چاروں طرف دیکھا اور گویہ
 سے کہنے لگے میں ہوں کہ زندگی میں کوئی لطف محوس
 نہیں کرتا“

گوری دیکھا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ٹالٹائے نے اپنے
 پوشیدہ پوشیدہ واقعات بے گم وکاست سپرد قلم کر دیے ہیں
 اور ان کا ذہنی رجحان شدت سے مذہبی تھا لیکن وہ زندگی کا
 مستندہ حل کر کے تھے اور ان کی نگاہ جب بھی اٹھتی تھی تو خلا کے موا
 کچھ نہ دیکھتی تھی گوری لکھا ہے ”یہ خلا میں دیکھا ٹالٹائے کے
 ہر انشائی کی کمی کرتا ہے وہ جب اپنے لئے تکلف دوستوں
 میں بیٹھے تھے تو کسی بھی اس پردہ سے نقاب اٹھاتا تھا
 ایک دن چچو نے لیو شیوٹ کی کتاب ”نظم اور ٹالٹائے

کی تعلیمات میں خبر و مشرق میں کا ذکر کیا اور اس پر تنقید کرتے
 ہوئے کہا کہ اس کتاب پر نہ دانی، ٹالٹائے نے اس کی فوراً
 مخالفت کی اور کہا ”کتاب دلچسپ ہے۔ میں مٹری قسم کے لوگوں
 کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ ان کے دل میں خلوص ہو حیثیت کہتا
 ہے کہ حقیقت کی جستجو فتنوں ہے وہ درست کہتا ہے۔ حقیقت کس
 معروف کی حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو افرام جانا ہے پھر تیزی سے
 بولے ”ایک مرتبہ انسان فکر کرنے کا عادی ہو جائے پھر وہ
 خواہ کسی مسئلہ ہی پر غور کیوں نہ کرے دراصل وہ موت پر غور
 کرتا ہے اور جہاں موت ہے وہاں کیا حقیقت رہ سکتی ہے؟
 ایک دن ٹالٹائے کہنے لگے ”خلیفہ عبدالرحمن کہا کرتے
 تھے کہ تمام جمیں ان کے چودہ دن خوشی سے گزرے جس میں لیکن میرے
 اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ میں کسی
 اپنے لئے زندہ نہیں رہا۔۔۔ دیکھا وہ اور خود غامی کے لئے
 زندہ رہا ہوں۔“ اس خود غامی کے سلسلہ میں گوری کی اور ٹالٹائے
 کا حسب ذیل مکالمہ دلچسپ ہے۔

ٹالٹائے: گوئی، ماسکو تب جا رہے ہو؟
 گوری: اب تک چلا جاتا لیکن نوجوانوں کی لیگ نے مجھے دعوت ۹۶
 دی ہے کہ ان کے جلسہ میں اپنا کوئی آواز نہ اٹھوں۔

ٹالٹائے: کیا تم بہت اچھا چاہتے ہو؟
 گوری: نہیں تو۔

ٹالٹائے: تب دعوت قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے! کیا خود
 غامی مفسور رہے؟

گوری: (مشرم سے شرع ہو کر) نوجوانوں کی لیگ میرے اس
 لئے مجھے دعوت قبول ہی گئی تھی۔

ٹالٹائے: بڑا بڑا کوئی معاہدہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح صرف خود
 غامی کے لئے کہیں جانا ناگزیر ہے۔ ایک دفعہ ماہرین
 سائنس کی کانگریس ہوئی ایک دوست مجھے بھی لے گئے
 جب میں صدر مقام پر پہنچا تو حاضرین نے مجھے بیان
 لیا اور بلا استقبالی کرتے گئے غامی بھائی میرے
 دوست نے مجھے کہنی ماری اور کہا تو متاذا استنبالی
 ہو رہا ہے۔ حاضرین کے سامنے مجھکو! میں نے کہا کہ
 تجھکو میں نے کیا تصور کیا ہے؟

اس مکالمے سے اگلے روز گوری کے ایک دوست نے

مالِ شائے سے ملے آئے تو مالِ شائے نے کہا بھئی کل میں نے
متھائے دوست کا دل دکھا دیا میں نے اس سے یہ نہیں کہا
کہ اس کی سب سے بڑی ادنیٰ خدمت یہ ہے کہ اس نے ہمارے
سامنے ایک آوارہ انسان کا جیتا جاگتا مرتے پیش کیا ہے۔ تو تو کو
نے ایک جرم کا اور گور کی نے ایک آوارہ انسان کا قاتل کا واقعہ
پیش کیا ہے جو دنیا کے ادب میں یادگار رہے گا۔ گور کی میں صرف
یہ کہی ہے کہ وہ بہت کچھ ایسا کر دیتے ہیں نفسیاتی کیفیات کو وہ
قدرتی نہیں رکھتے، مالِ شائے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں
"گور کی شاید غیر شعوری طور پر نشے کی مقبول تعلیم سے متاثر معلوم
ہوتے ہیں مجھے نشے کی تعلیم سید کر دہ معلوم ہوتی ہے"

گور کی کے جو اسانے مالِ شائے کی نظر سے گزرے ان کے
جوشی بڑا مالِ شائے کے فلم کے اس قسم کے - لوث درج ہیں
غلط، نفرت آمیز، مکروہ، جب مالِ شائے نے گور کی کی تعینت
اعترافات سے پر بھی تو فرمایا یہ عقل سے بالاتر ہیں "ذات سے
دوسرا مثل مالِ شائے سے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "گور کی
تصانیف پڑھیں بہت بڑا سمجھ ان کی ادبی اور انفرادیت بہت
غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گور کی سے لطیف انداز ہوتا تو
ان کی سقم پر نہیں بلکہ ان کی خوبصورتی پر نظر رکھی جاسکتی۔ سری
میں دوسرا انداز ہے گور کی کی تصانیف ختم کیں ایک مصنوعی بنیاد
طوفانی جذبات جو سب غلط اور انفرادیت معلوم ہوتے ہیں بہت
گور کی ختم کے دو تہی ہیں ان کو شاعری کرنی چاہئے کیونکہ شاعر
بن خیال اور دماغ کے لیے آواز دہ گور کی کرنے کا میدان بہت
بیشع ہے۔ شاعری میں ہر قسم کا انفرادیت چھ جابجہ پھڑکا
لکھنا چاہئے کیونکہ اس میں بھی منظر اور انیمیشن ڈرامے کے سقم
چھپا جاتے ہیں۔

ایک دن جنوت اور مالِ شائے باتیں کر رہے تھے دوران
گفتگو میں گور کی کا ذکر آ گیا جنوت نے کہا "گور کی بڑا سچا
انسان ہے، مالِ شائے نے فوراً گردن ہلائی اور بولے نہیں
نہیں ان باتوں کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں اس کی بطور کی
سینا تک ہے ایسے لوگ آد کے بڑے خراب ہوتے ہیں در
ہاں دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں گور کی کو پسند نہیں کرتیں اور
جس طرح کتا نیکدل انسان کو فوراً شتو ٹنگ لیتا ہے اسی طرح
عورتیں بھی ایک نیکدل انسان کو شتو ٹنگ لیتی ہیں کیونکہ عورتیں

۹۸

گور کی سے محبت نہیں کرتیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
نیک دل نہیں ہے"

ایک دن مالِ شائے اور گور کی چل رہے تھے کہ چائٹی
میں سے ایک چڑیا کے بولنے کی آواز آئی مالِ شائے نے اس
کی آواز کی نفی کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا
گور کی چڑیا مار رہے چکا تھا۔ اس لئے چڑیوں کی بابت اس کی
معلومات کافی صحیح گور کی نے اس چڑیا کی یہ خصوصیت بیان کی
کہ یہ چڑیا بہت حاسد ہوتی ہے۔ اس پر مالِ شائے بولے
"صرف ایک راگ سینے میں ہے اور اس پر بھی حاسد ہے۔ کیا
ظلم ہے کہ انسان کے سینہ میں ہزاروں نغے ہیں اور جب
وہ حسد کرتا ہے تو دنیا اس کو برا ہی ہے بھر حسد کی بات لکھو
ہونے لگی اور مالِ شائے نے اپنے پہلے خیال سے جن پر اظہار
وہ انے ناول کو ترک کر دیا۔ میں کر چکے تھے۔ اختلاف کیا گور کی
نے کہا "کر کر دینا، میں تو آپ نے اور خیال ظاہر کیا ہے اس
پر مالِ شائے نے ہنس کر جواب دیا۔ میں چڑیا نہیں ہوں کہ ایک
ہی راگ گائے جاؤں"

اگر مالِ شائے گور کی کی تصانیف پر سخت تنقید کرتے تھے
تو گور کی بھی مالِ شائے کے کلفظ پر تنقید کرنے میں کچھ کم نہ تھے
گور کی کا خیال تھا کہ مالِ شائے کا فلسفہ (

نراجی اور جنونی کا فلسفہ ہے۔ ان کا عدم وقت و اور اسناد کا
فلسفہ قوتِ عقل کو مغلوب کرتا ہے۔ ایک ذمہ دار گور کی
ڈاکٹر، کلکٹ اور مالِ شائے باتیں کر رہے تھے کہ مالِ شائے نے ایک
سخا، صنف کے ناول کے ایک سین کی بڑی تعریف کی جس میں
ایک شرابی میاں نے اپنی بیوی کو زور و کوب کیا تھا لیکن باوجود
خادم کے اس تشدد کے شریف بیوی نے میاں کا ہاتھ اس
کو آرام سے لٹایا اور اس کے سر کے نیچے ٹیکہ رکھا۔ مالِ شائے
کی رائے تھی اس سین میں ادبی جوہر موجود ہے۔ گور کی اس وقت
تو مالِ شائے کی رائے مستحکم رہا لیکن جب ڈاکٹر دالکون کے
ساتھ گھر واپس ہوا تو خیال میں مستغرق خود ہی عورتوں سے
کہنے لگا "ٹیکہ سر کے نیچے رکھ دیا! یہ ادبی جوہر ہے! ایک کفیل
سخا کر کھو بیٹھے پر راتی، باوجود ان اختلافات کے گور کی
مالِ شائے سے بہت محبت کرتا تھا۔ کمریسا کے حالات میں لکھنا
ہے۔

”ایک روز چہل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا اٹا لٹکائے پتھروں میں تھے شے ہیں۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے پتھر میں جان بڑھی ہے۔۔۔۔۔ ایک پتھر پر کھینچی ہوئی سہتہ محوڑی برہم تھیں۔ ڈراوھی کے سمندر بالوں میں سے انگلیاں نکلی ہوئی تھیں اور سمندر کے بار نظر ڈالی رہے ہیں۔۔۔۔۔ سمندر کی موجیں اس سارے مگر ابھی ہیں۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تاج دو گمر سمندر کی موجوں کو حکم دے رہا ہے۔۔۔۔۔ اس سین نے میرے قلب پر عجیب اثر کیا۔۔۔۔۔

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوا کہ جس وقت تک یہ انسان روئے زمین پر موجود ہے۔ میں تہمید و سیر نہیں ہوں، جب مٹا لٹکے کی وفات کی جراثیم تو گور کی روتے روتے بچکی بندھ گئی اور اس وقت واقعی اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ یتیم و سیر ہو گیا ہے۔

گور کی اگر مٹا لٹکے کے مذہبی تخیلات سے بیزار تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے گور کی کہتے ہیں:-

”مٹا لٹکے نے اچانک مجھ سے دریافت کیا گور کی تم خدا کو کیوں نہیں مانتے؟ میں نے عرض کیا یونیکلو ج مجھے یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ فرمانے لگے یہ غلط ہے۔ تم فطرتاً خدا میں یقین رکھتے ہو۔ خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں تم تھوڑے ہی عرصے میں اس حقیقت کا احساس کرو گے۔ دنیاوی نہیں جیسا کہ تم اس کا ہونا چاہتے ہو۔ سمجھا خدا پر یقین نہ رکھنا عرت ہٹا دھرم کی بنا پر ہے۔ کچھ لوگ عرف شرم کی وجہ سے خدا پر یقین نہیں رکھتے جیسے چند نوجوان ہن کے عورت ان کو بند تو ہوتی ہے لیکن شرم یا کم سن کی بنا پر اپنی پندیدگی کا انہماک نہیں کرتے یقین مثلی محبت کے جرات چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے کچھ میں یقین کرتا ہوں تو سب کام درست ہو گیا تم اپنی پندائیں سے خدا پر یقین رکھتے ہو اب یہ کہنا سیکار ہے کہ یقین نہیں رکھتے۔ تم کہتے ہو جمال اند جمال کیا ہے؟ یہ خدا کا بلند قرار مکمل تر رخ ہے کیونکہ مٹا لٹکے نے اس سے قبل کبھی مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اس لئے اس غیر متوقع گفتگو نے مجھے حیرت سا کر دیا اور میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر مٹا لٹکے نے ہنس کر انگلیاں میری طرف ہٹا کر دے کہا تم چپ رہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہرگز نہیں

چھڑا سکتے۔ اس بات کے پورا گور کی کہتے ہیں۔

”میں اگرچہ خدا پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت میں نے دل میں کہا کہ انسان خدا سے قریب تر ہے۔“

ایک خط جس نے گور کی کی طبی شرافت کا پتہ چلتا ہے جب ذیل ہے جب گور کی کی تصنیف کی شہرت تمام دنیا میں پھیل چکی تھی اور وہ دنیا کے ادب کا ایک درخشندہ ستارہ مانا جا چکا تھا اس وقت اپنے دوست اور مربی کئی آڑی کو جس نے گور کی کو سوانح حیات لکھی پرجیو کیا تھا لکھا ہے: میرے حبیب دوست اور استاد!

آج ۳۴ سال گزر چکے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ جب آپ اور میں آخری مرتبہ ملے تھے اس کو بھی آج ۲۲ سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں مجھے سیکڑوں انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں امیر بھی تھے اور عالم بھی لیکن یقین کیجئے کہ ان میں سے کسی کی محبت نے اس جذبہ کو دم نہیں کیا جو آپ کے لئے میرے دل میں بوجھ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ پہلے شخص تھے جس نے میری طرف خاص انسانی ہمدردی کی نظر ڈالی۔

آپ پہلے انسان تھے جس نے میں خود دشوری پیدا کی اور یہ آپ کی ہمت انسانی کا نتیجہ ہے کہ ۲۲ برس سے میں روسی ادب کی خدمت کر رہا ہوں اس امر کے تجربہ کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ انسان کی انسان سے ہمدردی کرنا کتنی عجیب شے ہے۔ میرے دیرینہ دوست میرے حبیب استاد میں محبت اور تشکر سے اپنا ہاتھ آپ کے مصافحہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

الیکسی جنیو (گور کی کا اصل نام)

سیفی بک مینو فکچرنگ ڈپو

لیٹر بک ، رائٹنگ پیڈ ، نوٹ پیپر ، اکسر سائزنگ ، نوٹ بک
ڈپلیکیٹ بک

ہر قسم کی اسٹیشنری کے ہول سٹیل اور ٹیل کیلئے

ہماری خدمات حاصل کر کے فائدہ اٹھائیے

سیفی بک مینو فکچرنگ ڈپو

۷۲ - عبدالرحمن اسٹریٹ ممبئی ۳



کتابخانه کتابخانه آفس
پروپرائٹرز سیف فقیہ برادران
محمد علی روڈ ممبئی نمبر ۳

بڑھاپے میں
جوانی کی طاقت
تندرستی
پھر حاصل کیجئے



NIXOL
نیکسول

چند روزہ نیکسول کے استعمال سے

کمزور اور پوٹے شخاص میں بھی جوانوں کی سی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طاقت کا دار و مدار جسم کے غدودوں پر ہے۔ جیسا کہ تصویر میں بتایا گیا ہے۔ نیکسول ان تمام غدودوں کو طاقت پہنچا کر انسان کو مضبوط بناتا ہے۔ قیمت بڑا کچن آؤٹھرومہ جھڑا کچن قین رومہ ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے با

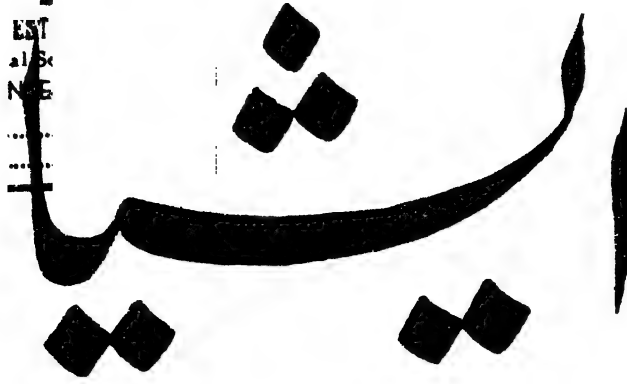
نیکسول ڈپلو پوسٹ بکس ۳۰۶۵ بمبئی ۳

ہر قسم کی نہایت اعلیٰ چھپائی و رنگین لیتھو پرنٹنگ کام
 نیز فینسی پیریاکس و بلاک بکھایت تیار کئے جاتے ہیں
 قادری پیریاکس فیکٹری
 نور منزل - محمد علی روڈ - بمبئی ۳

TEL:-27656

Kadri Paper Box Factory.
 CARDBOARD BOX MANUFACTURERS AND PRINTERS
 NOOR MUNZIL, MOHAMEDALI ROAD, BOMBAY 3.

ادبی مرکز ہند پیشترز کا ماہنامہ



پروپرائٹرز ماہنامہ ایشیا ادبی مرکز ہند پیشترز

ساغر نظامی

عبدالقادر محمد قادری

ادارہ
ذکیہ سلطانہ
ساغر نظامی

ناشر
ادبی مرکز ہند پیشترز

بائیکلہ بمبئی ۷۰

کرائسٹ چرچ روڈ

کورٹ رائیل

قیمت فی پرچہ

مشماہی چندہ

سالانہ چندہ

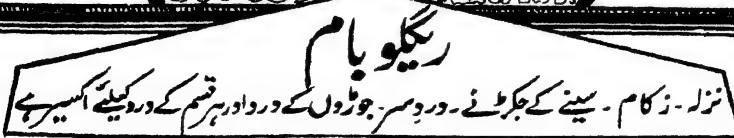
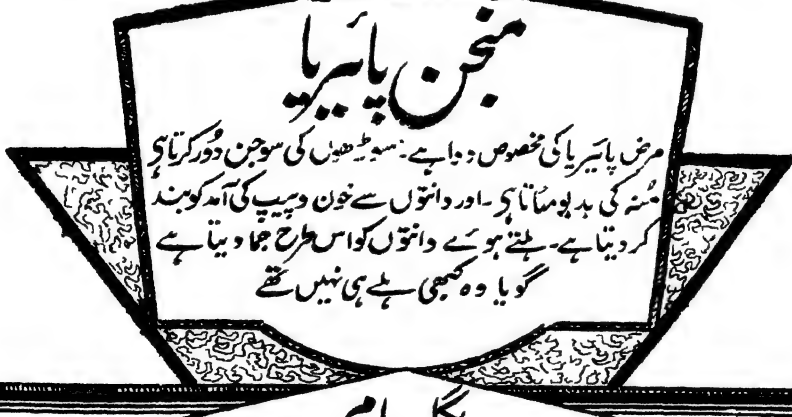
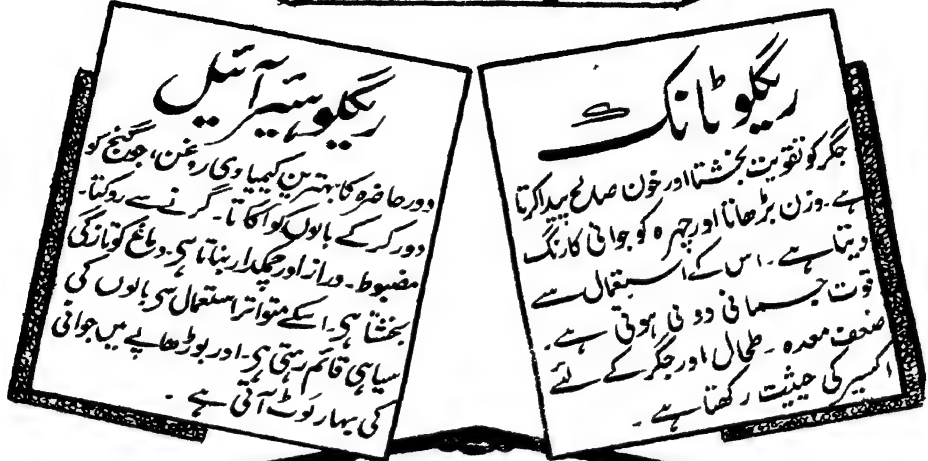
بارہ آنے

پانچ روپیہ

آٹھ روپیہ

بشر ساغر نظامی ۷۰ قادری پریس ڈومنز محل روڈ بمبئی ۷۰ میں چھپوا کر ادبی مرکز ۷۰ لے۔ کورٹ رائیل کرائسٹ چرچ روڈ بائیکلہ بمبئی ۷۰ سے شائع کیا

ریگو پروڈکس



ریگو کمیکل ورس پر دھان منیشن۔ جے جے ہسپتال۔ ممبئی۔ ۲

ایشیا

جلد (۱۰) فروری ۱۹۴۹ء نمبر (۱)

- ۱۔ انجام سے آغاز تک — ادارہ — ۴
- ۲۔ ۲۰۔ نظم لائن اور منشی پریم چند — "مہنس" — ۵۵
- ۳۔ ۲۱۔ جست غبارِ نظم — باقر رھوی — ۵۶
- ۴۔ ۲۲۔ پوسٹ ماسٹر (افسانہ) ٹیکن (ترجمہ) ذوالحضر عادل — ۵۷
- ۵۔ ۲۳۔ متواتر روایات — علامہ مولانا ابوالکلام آزاد — ۶۴
- ۶۔ ۲۴۔ زاویے (نظم) — قمر باشی — ۶۵
- ۷۔ ۲۵۔ فانی کے نظریۂ حیات کا اثر { غلیل الرب ایم ایچ ۶۶
- ۸۔ ۲۶۔ انسان کی لاش (افسانہ) بھندرناتھ — ۷۳
- ۹۔ ۲۷۔ لرزشیں (نظم) — میراجی — ۷۶
- ۱۰۔ ۲۸۔ خوبصورت حقائق — اسرار الحق مجاز — ۷۷
- ۱۱۔ ۲۹۔ مارشل پلان — کلیم اللہ — ۷۸
- ۱۲۔ ۳۰۔ غزل — عالی جعفری — ۸۲
- ۱۳۔ ۳۱۔ دیوالی — غلام ربانی سامان — ۸۳
- ۱۴۔ ۳۲۔ شادی کا باجہ (افسانہ) — راجندر پرکاش — ۸۴
- ۱۵۔ ۳۳۔ افلاس — سحر — ۸۷
- ۱۶۔ ۳۴۔ غزل — مسعود زری میرٹھی — ۸۸
- ۱۷۔ ۳۵۔ سیاہ مائے — خواجہ احمد عباس — ۸۹
- ۱۸۔ ۳۶۔ گور کی اور نالائکے — جوہر میرٹھی — ۹۱
- ۱۔ ۵۔ سرتیج بہادر سپرو — ۷
- ۲۔ ۶۔ بیخامات — ادیب و قاعدین — ۹
- ۳۔ ۷۔ طوفان سے پہلے طوفان کے بعد — سحر — ۱۷
- ۴۔ ۸۔ امر جوت (نظم) — ذکیہ سلطانہ — ۳۳
- ۵۔ ۹۔ بحالیہ کا پیغام — موسیو پال رچرڈ — ۳۵
- ۶۔ ۱۰۔ تاثرات (نظم) — احمد ریاض — ۳۸
- ۷۔ ۱۱۔ ساقی (نظم) — اختر ہوشیار پوری — ۳۹
- ۸۔ ۱۲۔ کہانی کی کہانی (افسانہ) — کرشن چندر — ۴۰
- ۹۔ ۱۳۔ سویرے سویرے (نظم) — عابد حشری — ۴۵
- ۱۰۔ ۱۴۔ غم زمانہ (غزل) — مضطر اکبر آبادی — ۴۵
- ۱۱۔ ۱۵۔ شریک اثر علاق و عادات پر — خواجہ غلام السیدین — ۴۶
- ۱۲۔ ۱۶۔ ایک پرتو (نظم) — اختر الایمان — ۴۹
- ۱۳۔ ۱۷۔ غزل — سلام بھلی ہنری — ۴۹
- ۱۴۔ ۱۸۔ کچھ حقیقت کچھ افسانہ — ممتاز حسین — ۵۰
- ۱۵۔ ۱۹۔ تنوعلی شاعر (نظم) — بل راج کول — ۵۲

ختم سے آغاز تک!

ایشیا ۱۵ سال کے بعد پھر شائع ہو رہا ہے۔ التواوکی! یہ مدت اتنی طویل ہے کہ اس کی اشاعت کا خیال بھی دل میں نہیں آتا چاہئے تھا لیکن یقین کیجئے کہ ان پانچ برسوں میں ایک لمحہ بھی اس خیال سے آزاد نہیں گذرا کہ ایشیا کو زندہ ہونا چاہیے۔ ایشیا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک جاری رہا یعنی کامل ۸ سال تک اس نے اُس تمام سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریکوں میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا جو اس کے مافوق کی ترقی پسند تحریکیں تھیں۔ اور جن تحریکوں کے کاربان سے ملک کا مستقبل وابستہ تھا۔

ایشیا نے قزو، تحریک کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی تحریک کے لئے کام کیا۔ اُس نے عیاف سوچنے والے، استعزاء اور اہل قلم کا ایک ترقی پسند عقیدہ وقت بنایا جب ترقی پسند تحریک اندرون میں نہیں ہوئی تھی و جب یہ تحریک ترقی ہوئی تو ایشیا سب سے پہلے مابینا سے تھا جس نے اس کی تائید و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ نوجوان ذہن کے لئے وہ مستقل ترغیب تھا۔ اس نے نیا دور، نئے ادب اور نئے ادب نواریاں کھولنے اور خاص طور پر اردو پر چنے والے ہندو مسلم عوام میں سیاسی شعور بکھڑکاتے کی آن تھک کوشش کی جس کی جگہ دہلائی سیاست پر نہیں، سیاست کی بنیادی باتیں جاننے پر تھیں۔

ایشیا نہ صرف ہندو مسلم اتحاد و دلوانی محکمہ اتحاد ایشیا کے گہنہ کلمہ والوں میں سے تھا اس کی آرزو بھی کہ مشرق کے تمام کچھ بے ہوئے تہذیبی رشتے اس طرح جلتے جائیں کہ کچھ کوئی طاقت ان کو نہ توڑ سکے۔

وہ آن دیوانوں کا ایک کاروان تھا جو دوزخ و زبان سے ادھر کھینچتا تو شیت کا خواب دیکھتے تھے، ہمتی، ملک کا خواب

دیکھتے تھے۔ انسانیت کا خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے انھوں نے اپنی فکری و علمی قوتوں کو وقف کر دیا تھا خواب بشر مندہ تعبیر نہیں ہوئے۔ لیکن خواب بشر مندہ تعبیر ہوں گے۔ ہر جہت کہ ۵ سال میں ملک کا نقشہ ہی نہیں بدلا، دنیا کا نقشہ بدل گیا ہے۔ لیکن ہر دم ایک نازہ تعبیر، ایک نئی پیمائی، ایک نیا کرب، اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بڑی تبدیلیاں ہم میں کھڑا رہی ہے اور خواب حقیقت ضرور بنیں گے۔

۵ سال قبل ہمارے سامنے ملک کی آزادی اور ترقی کا مقصد تھا۔ یہ مقصد آزادی کے بعد بھی پورا نہیں ہوا۔ یقیناً اس مقصد کی راہ میں بھی گہیاں پیدا کر دی ہیں ان پیچیدگیوں کے پہلی تمام کوششوں کو لے کر لڑ رہا ہے۔ لہذا اب از سر نوئے حادثہ کی روشنی میں تمام بنیادی و تعمیری کوششیں کرنی ہوں گی۔ رات تک اللہ کے طریق کار کا تعلق ہے شاید مجھے کی ضرورت نہیں کہ اس کا ذکر شکل و شکل کبھی محدود نہیں رہا وہ مسائل کے مسئلہ حل کا قائل ہے اُس نے بار بار اُس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ہماری تہذیب ایک ہے اور ماضی کے افراط سے آزاد ہو کر ہماری زندگی کی طرح نئی ہے اسی نئی تہذیب کو ہمیں سوارانا اور بکھارنا چاہیے۔

چنانچہ ہم اب بھی جداگانہ ہندو مسلم تہذیب کا نام پر ہم آس تہذیب کو نہ تحریک کے خلاف آزاد اعلان کریں گے جس کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کے تہذیبی رشتوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی تقسیم پر ممکن مخالفت کریں گے اور اردو ہندی کے ادیبوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دینگے تاکہ سب مل کر اپنے مشترک سرمایہ کی حفاظت کر سکیں۔

ریحیو۔۔۔ ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۷ء

ہم جانتے ہیں کہ ہماری راہ مکشہن ہے اور ۳۵
کے مقابلے میں ۱۹۹۳ میں ہمارے مخالفین بہت کچھ کر دیے
گئے ہیں ان اہم مخالفین سے عہدہ برآہو نے کے متعلق وعدہ
اور دعوے کرنا آسان بات نہیں ہے۔ ہم صرف اپنی بہت کا اظہار
کر سکتے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے شاید اعلان
کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے راہ صاف اور ہر کامد ہے ہم
... راہ کے سج و خم اور بہت شکن بہت بلند ہو گئی نہ
کسی طرح عبور کرتے ہیں گے اور اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس وقت تہی تیغ طرہ عوام
میں صحیح ذہنیت پیدا نہیں کی گئی تو نہ ہم آزاد دینی کی حفاظت
کر سکیں گے اور نہ ملک ترقی کر سکے گا۔ کیونکہ اگر محض سیاسی
انقلاب ذہنیت میں تبدیلی پیدا کر سکتا تو ملک میں ہرگز وہ
وہ خوبی تھیل نہ کھیلنا چاہتا جو وہ طے سے کھیل گیا۔ اس لئے
جب تک ادب کے ذریعہ عوام میں اتحاد، تعمیر ترقی اور ترقی
کے جذبات پیدا نہیں کیے جاسکیں گے۔ ملک خطروں سے محفوظ نہیں
ہو سکتا تعمیر اور تحفظ کے لئے ہمیں فز و پرست، موثق بازار
اور تمام انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے
اور اس کے لئے آپ کا قانون بنانیت ضروری ہے۔

ہمیں ایشیا کے ناظرین سے توقع ہے کہ وہ ہمیں مفید
مشعدے دیں گے۔ آپنی اُمیدوں اور توقعات سے آگاہ
کر دیں گے اور ہمارے کاموں پر تنقید کریں گے۔ تاکہ ہم اپنی
خامیوں کو محسوس کر سکیں اور صحت کے ساتھ ان کی توفیق آتے
کو پورا کریں۔

ایشیا کے پہلے ہی نمبر سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اسے
ملک کے تمام نئے اور بڑے بزرگ اور نوجوان مستدل
اور انتہا پسند، قدیم خیال اور ترقی پسند شعراء، ادیبوں
اور دانش برداروں کی دلآہانہ تائید و حمایت حاصل ہے یہ
ادیب ایک آواز، ایک نمبر کی گویا پس اور مردہ دلوں میں
زندگی کی نئی جوت جگاتا ہے۔

ایشیا کی بزم ادب، مذہب، نسل اور زبان کی بہت و
نامبارک قیدوں سے آزاد ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہندو
مسلمان سکھ اور اردو ہندی کے لکھنے والے پہلو پہلو
اس میں شریک ہیں۔ اور اپنے اشتراک میں سے سنی و دینی

کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

ہر چند کہ ممالک کے متعلق ایشیا کی ایک سطر
شدہ ملک ملتی اور سنی بنائی راہ ہے جس میں تحریک اور
روحیت کی کوئی گمانی کش نہیں۔ لیکن جس طرح وہ خود اپنے
لئے اظہار و بیان کی آزادی مانتا ہے اسی طرح ہر ملک
خیال کے ادیبوں اور شعرا کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے
دروازے سب کے لئے کھلے رہیں گے۔ ایجنی جو ہر دینی
راستے سے متفق نہیں نہیں ہی کامل آزادی خیر و شر کی لیکن
ہم اپنے بنیادی مقصد کی بہر حال حفاظت کریں گے اور اس
تفناؤ سے ایشیا کو بچائیں گے جو تحریک و اشتراک کا باعث
بن سکتا ہے۔

ایشیا کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرا آپ کا
اپنا ہر حصہ جس سے ماضی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں
گوشت و پھوس کا بنیادوں پر جا۔ کسی کیا گیا ہے۔ لیکن باری
طرح اس کی زندگی اور ترقی کے دسمہ ادبیات پر مبنی ہے
اگر آپ نے قیود کیا تو منزل ہم تنہا پورے یاد و دور ہیں۔

آخر میں یہ ان ادبا، ادعا دہیں ماسٹر۔ اس لئے یہ انہوں نے
ایشیا کی نئی زندگی کا مدعو کیا۔ ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر۔

ایڈیٹر لی۔ ای۔ ای۔ ایڈیٹر صاحب ساہیہ۔ ماسٹر ماسٹر ماسٹر
اور آخر میں شری کی جگہ دہریہ صاحب ماسٹر ماسٹر ماسٹر
مسی ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
کر سنی چہرہ راجا صاحب ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
حقوں و قصیر۔ ماسٹر صاحب ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر

محکمہ حکومت یو۔ پی۔ راج صاحب ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
میشن ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
ایس کے ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
میتھ ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
نہ اہل خانہ صاحب ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
آنریبل ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
سید اندر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
میتھ ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر
یو۔ پی۔ کا انہوں اور ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر ماسٹر

کی طرف ہدایت ہے۔ یہہ زرتواری کی ایک اہم دستاویز ہے۔ جس کے ایک ایک نقطہ میں ہم نے بڑی دودھ سے اس میں قلم کی گئی ہے۔ ان میں ایک ایک کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

ادب کی قدروں پر تقسیم کا اثر

تقسیم سے قبل اردو ادب جن راہوں سے گزرا وہ جبر و جبرگی ایسی راہیں تھیں جن میں سیکڑوں گڈ بندیاں آکر مٹی تھیں۔ ان میں ہماری بے پناہی سے بھرتے دایہ بچے بھی تھے اور حال سے نکلے ہوئے نئے راستے بھی۔ ان راستوں پر مختلف تصورات اور متضاد خیالات کا اندسے سے کاغذ کاٹنے ایک بڑی شاہراہ کی طرف جلتے رہے۔ یہ شاہراہ برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی شاہراہ تھی۔ جبر و جبرستی اور جبر و بندگی کے حملوں سے محفوظ تھی۔

لیکن اردو ادب نے اپنی فوج نو خلقیت سے ان دونوں کے حملوں کا مردانہ اور مقابلہ کیا، اس مقابلے سے اس میں نئی توانائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے نئی تحریک میں عوامی شعور بڑھتا گیا۔ ادب کے موضوع اور تصدیق کی گتہ سے کہاں تک کہ ادب میں دیگر نئی مہمیں چلی گئیں۔ سماجی شعور کے تقاضوں کی گتہ میں ملائی۔ انما نکلیں ایک نئی جہت اور سکھانہ انما دھیکنے نظر میں گزشتوں میں تو ادب کی نئی تحریک نئی تحریک سے آگے بڑھ گئی۔ تاہم نظر ثانات اور عمل میں کوئی قطعی ربط پیدا کرنے کا عزم نہیں تھا۔ بہت کچھ بے ربطی موجود تھی۔

جان تک ملک تقسیم ہو گیا۔ اردو بے ربطی نقطہ غور پر پہنچ گئی۔ تقسیم نے جان اور ضرورتوں کو تقسیم کیا۔ ادب اور اس کے قلم کاروں کو الٹا چلنے پڑا۔ ہندوستانی وطنیت کا شعور کسی قدر متاثر ہوا تھا وہ بارہ بار ہو کر نکلتی۔ پاکستان اور ہندوستانی وطنیت میں تبدیلی ہو گیا وہ قوت اور وطن میں جانے کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا جس نے ادب کا مزاج قدر و قدر کو بھی ملا دیا۔ جن کی گتہ سے گتہ نکلنے میں جبر و جبرستی اس تبدیلی کو برداشت کر گئے۔ لیکن جہت کی گتہ تمام قوتیں ہندوستانی کی زندگی میں بہہ گئے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں وقت اور مصروفیت نے ترقی پسندی کا روحانی سندس۔ دلوادی تھیں لیکن ای جی ای ہاتھوں کو کاٹنے کے لئے بڑھ رہے ہیں جن ہاتھوں نے انہیں سیر علی کی تھیں۔

لیکن ان لوگوں کو یہ فراموش کرنا چاہئے کہ تقسیم ہندو دونوں ملکوں

میں زندگی کا مادہ نہیں چوڑا ہے۔ اگر زمین ہے تو اس کے سینے سے نکلے ہوئے مادہ کے لیے ایک نئی شکل تلاش کی جائے گی۔ اس میں کبھی کبھی پولیٹیکل اور سماجی گتہ ہندو نظام کے خولے سے نئی روح ابھرے گی۔ اور ضرور ابھرے گی تو اس وقت زندگی و ترقی سے فراہم کیا جائے گی۔ ادب کہاں پناہ میں ہے۔ ۱۔ تقسیم نے ایک زمانہ کا دارا کو دو سلطنتوں میں فروز بانٹ دیا جو دل و دماغ کی ہر اہل و نہاد کا انجام اندام کے سوا کچھ نہیں بلکہ انہیں محبت کے آئینوں سے خالی نہیں اور جب تک انسان میں انسانیت کی پیاس موجود ہے خالی نہیں ہو سکتی۔

ان امور میں اندھا دلوں کو جھٹکے ادب میں قدرتی رجحانیں اور مذہبی بصیرت کا جبر و جبر کا یہ یہ سونا چاند ہے۔ ادب بدلتی ہوئی سیاست کا غلام نہیں ہوتا۔ ادب کی اقتدار دیکھی اس کی ایک اہم قدر ہے اور اسے کمالی ادب میں بھی باقی نہ ہونا چاہئے۔

اب دونوں نوآبادیات میں جس سماجی وادھر سنگائی کے جذبات ترقی پاتے ہیں اندر سماجی مسائل کو نظر سے لے کر نئی ذہنیت پیدا ہو چکی ہے یہ ہندوستان کے لئے نہایت مہم کاغذ ہیں۔ اب ادب میں کافر ہیں کہ وہ عوامی اتحاد و انسانیت کے جذبات پیدا کر سکیں۔ زرتواری کا احساس کریں۔ اور آتی وادھر سنگائی کے لئے رشتوں کو مضبوط کریں۔

اور انہی کا نہیں اردو شعور کی دونوں زبانوں کے ادیبوں کے گتہ ہے کہ جبر و جبر کا ہندوستان ایک نیا جہت ہے اسے اکٹھا کر لیں، یہ رجحان ہندی اور وسطی ذہنیت کا گتہ ہے۔ انسانی کی تباہی و بربادی اور انسانی فطرت کا سبب بن چکی ہے۔ اس کی بنیادوں پر اگر مستقبل کی ترقی کی گتہ یہ بنیاد ہوگی اور نہ ہی سے لیا وہ فتنہ کا ستارے پیدا کرے گی۔

آج جب ہر طرف ذہنی اختلا ہے، ہزاروں برس کی تہذیبی مذاہات الٹا چل رہی ہیں ادب کی نئی تدبیر ضرور ہے۔ ہندو گتہ بڑھ کر رانگی خفاقت کرنا ہے اور اس طرح فکر و حکم کرنا ہے جو سلطنتوں کی مٹا دی ہوئی سیاسی خفاقت سے لے پیا گیا ہے اور جبر و جبر کا تہذیبی مٹا دیا گیا ہے یہ طریقہ فکر کو سیاسی خود مختاری کی بنا پر جبر و جبر کی گتہ اختیار کرنا جائے ان سب سے بڑھ کر کوئی نوآبادی کا جوتیم کے مٹا دیا گیا کہ دوسرے کو ملاتا ہے۔ اگر ایسا ہاتھوں میں ایک دوسرے کے لئے بالکل جبر ہو جائے گا کہ جبر کی بددلی اور کتنی نہیں ہوگی۔

نوکیہ سلطانی
ساز نظامی

ڈاکٹر تاج بہادر سپرو

آزاد ہند کے آسمان پر ہزاروں نئے ستارے جگمگاتے ہیں لیکن زندگی کے افق سے کبھی یہ ستارہ طلوع نہ ہوگا جوشنکر تہذیب کا ستارہ تھا متحدہ تہذیب کا ستارہ تھا اور متحدہ قومیت کے عرش کی نمودیل تھا۔

سر تاج بہادر سپرو کی مسلسل ملاقات بجائے خود ہندوستان کا مستقل نقطہ نظر تھی لیکن ان کی موت تو ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کوئی آنے والا زمانہ نہ کر سکے گا۔ ان کی ذات متحدہ قومیت، ملی جلی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک آدرش تھی۔ وہ قدیم تہذیب و اخلاق اور جدید سائنس و تعلیم کا ایک شاندار منظر تھے۔ ان کی ہستی قانون حیات اور طب و معائنہ اور علم و فن کا ایک باکیرہ اشتراک تھی، وہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور ان کی سب سے نمایاں صفت انسانی یک رنگی برائے ان کا یقین تھا ان کے دماغ دو روح کے درمیان ایسی کوئی خطا موجود نہ تھی جہاں زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق شک اور تذبذب نے اپنا آشیانہ بنایا ہو۔

روح سے لے کر دماغ تک اور مذہب سے لے کر سیاست تک وہ ایک بالکل نظر، آراء و خیال منظم تھے۔ جن کے انداز فکر میں کبھی دینی، سیاسی یا کچھ لچک کا فضا نہیں محسوس نہیں ہوا۔ مادی ترقی کی مزاح پر بیٹھنے کے بعد وہ تہذیبی رجحان کے دامن میں نہیں پھنسے وہ مادی ترقی کی کال کو ٹھکری سے روڑہ رہے اور احوال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ پاکستان کو اس مرکز پر قائم ہو گئے کہ پہلے دو سال میں ہندو مسلمانوں کے درمیان فیصلہ جوں سے جولو، زبان اور زندگی پیدا ہوئی ہے وہ زندگی ہندوستانی قومیت کا ایک پورا نظام اپنے اندر یکم کر چکی ہے۔ یہی نظام ہماری موجودہ نسلیوں

کے لئے ایک آدرشی نظام ہے۔ یہی ایک آئینہ عمل تہذیب ہے جسے ہم اختیار کر چکے ہیں اور جو وہ ہمیں پیش چکی ہے۔ ۹۱۔ سر سپرو کی صحبت میں یقین ہوتا تھا کہ ہم ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں صرف ایک قوم رہتی ہے۔ جہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی دوسری نہیں ہے۔ جہاں انسانیت کے سوائے کسی دوسرے مذہب کی حکومت نہیں ہے۔

وہ مجسم آدمش تھے، ایک اچھے ہندو کا، ایک اچھے مسلمان کا، ایک اچھے ہندوستانی کا اور ایک اچھے انسان کا۔ ابا حیف وہ اچھا انسان، اس وقت ہم سے جدا ہو گیا۔ جب ہم بڑوں کو اس کی سخت ضرورت تھی سپرو کی موت ہند کے دل میں ایک گہرا زخم ہے جو آسانی سے نہیں بھرے گا۔ یہ ایک ہی زخم ہوتا تو شاید کبھی جاتا لیکن یہ احساس کہ نئے بیٹے والے ساج میں شاید اب کوئی دیگر سپرو پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بجائے خود ایک زخم ہے اور پہلے زخم سے نہیں زیادہ گہرا ہے۔

ڈاکٹر تاج بہادر سپرو فارسی اور اردو کے ممتاز عالم تھے تاریخ اور دکنی ادب و ترقی سے متعلق ان کی مخلصانہ کوششوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

ہندی اردو کے سلسلے میں انھوں نے پوری رواداری اور وسیع قلبی سے مسائل کو حل کرنا اور دوسروں سے حل کرائے کی کوشش کی۔ ان کی ادب نواری، اور اردو شاعری سے ان کا خلقی ذوق اردو کے تمام، قدیم جدید، نوجوان اور سن رسیدہ ادیب و شاعر کو ان کی ذات سے وابستہ رکھتا تھا۔ اور وہ بھی صحیح طور پر ان کے قدیم شناس تھے، باوجود اختلاف خیال کے وہ اس عہد کے انقلابی شاعر

میں اپنی ہی گہری دوستی رکھنے اور ان کی قد و منزلت کو بے جا تعصب و کھنڈہ کشی سے شرا کر کے عزت کرتے تھے۔ ان کی مدد و معاونت سے انہیں ہمیشہ زندگی کی بد و قیوں اور سیاست کی پیٹریوں سے محفوظ رکھا۔

لیکن امرتسراج بہادر سرور ایک ممتاز گھری خاندان کے فرد تھے۔ ان کے جذباتی جذبات و ادعا کشن سرور کشمیر میں دہلی کے عہدہ پر فائز تھے اور کشمیر کے سرزمین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

وہ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے ۱۴ سال کی عمر میں سترے انٹر میڈیٹ کیا اور آگرہ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈگری حاصل کی ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر پیٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح ان کی شاندار علمی زندگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچی۔

۸ ثانوی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی عام سماجی و سیاسی تحریکات میں نمایاں شہرت حاصل کرتے گئے ۱۹۰۶ء میں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے ۱۹۱۳ء میں یو۔ پی کی لیجلیٹو کونسل کے ممبر بن گئے اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۳ء تک وہ امپریل لیجلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ یو۔ پی کی لیبر لیگ کے صدر ہوئے ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا میں قانون کے ممبر مقرر کئے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امپریل کانفرنس کے ممبر کی حیثیت میں ان کی صلاحیت و علم برسرِ آواز آیا۔

ترج بہادر سرور لیبر عقیدہ رکھنے والے سیاست دانوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انتہا پسند اور کانگریسی نہیں تھے۔ لیکن کلچرل مسائل اور ایک متحدہ قومیت کے ترقیاتی غرض کے متعلق انتہا پسندوں سے زیادہ صاف محفوظ اندیشہ و آواز رکھتے تھے بے شک وہ انقلابی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک صالح و جادہ فرد و محب وطن فرد تھے۔ خواہ اس حقیقت کو انقلابی ذہن تسلیم نہ کرے لیکن یہ ایک بن حقیقت ہے کہ بالآخر انتہا پسند قوم پرستوں کو بھی اپنی پسندوں سے سیاست کی اسی سطح

پر اتر کر خلائی سیاست بابر کرنا پڑا جو مستبدین کی سطح تھی۔ بہرحال وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے بیحد ضروری و سببیت کی تاریخ میں مزید جگہ دی جائے گی۔ ۱۹۱۹ء میں سرور جیکر مشن نے حکومت اور کانگریس کے مابین ایک گولی کا نفرین کرنے کی تجویز کی بنیاد رکھی۔ اور ڈاکٹر سرور نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو منوانے کے لیے متقابل قوتوں کو ایک نقطہ پر متحد کرنے کی جان فوری کوشش کی۔ مگر انہیں کی اخلاقی کشش اور قوت امدادی کا اعجاز تھا کہ اگست ۱۹۱۹ء میں ان کی دعوت پر ہاتھ تاجی گولی بزرگانِ کانفرنس میں شریک ہوئے۔

۱۹۲۲ء میں وہ بریڈی کوئلہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ہندوستانی لیڈروں نے کانگریسی رہنماؤں کے خلاف لگائے ہوئے الزامات کے خلاف ایک بیان دیا جس میں انگریزی حکومت سے آزاد تحفظات اور غیر جانبدارانہ ثالث مقرر کرنے اور رہنماؤں کو ہاکر کا مطالعہ کیا۔ تاریخی اہمیت کے اس بہت شکن عہدہ میں جن رہنماؤں نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا ان رہنماؤں کے سربراہ سرور ہونا چاہئے۔ سیاسی میدان میں ان کی آخری جھلک کینیڈا میں سفر کی آمد کے موقع پر دکھائی دی، اس کے بعد ان پر ناچ کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے۔

پیشگامات میں ان کا آخری خط پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں اس وقت جب گہری تاریکی میں اس چراغ کی فروغ بھی موت کے بے رحم جھوٹوں نے اُسے بجھا دیا۔ لیکن جوت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی زندگی ایک آدرش تھی ایک نمونہ تھی۔ چاہے تک ہندوستانیات اور انسانیت کی جوت جگمگاتی رہے گی۔

پیغامات

آئر ویل مشنری جی کھیرنڈیر عظیم بمبئی

کمپ جے پور
ہندو برہمن

ادام صوفیہ واڈیا۔ بانی انڈین پی۔ ای۔ این

۲۰ دسمبر ۱۹۰۷ء

عزیز دوست!

آپ کے ہندو تاریخ کے خطا کا شکریہ خط سے زیادہ خوشی تو یوں ہوئی کہ میں خود آپ کے مسکن کا چہ چلائی کو خوش کر رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب سے میں نے آپ کا کلام سنا ہے۔ تب سے کافی مدت گزر چکی ہے۔

مجھے سچے اولیٰ مرکز ایشیا کی فی زندگی کا خیال بہت خوش ہوئی۔ ایشیا نے مجھے چند سالوں تک ہندوستان کی کچل اور ذہنی زندگی میں اپنا حق ادا کیا ہے اور آہ ہندوستان میں اولیٰ مرکز اور ایشیا کے تازہ طبعی و ادبی اضافہ کا حقیقت ایک نشانہ کی جیسی پٹی ہی نہایت مخلصانہ اور نیک آئندہ میں ان دونوں اداروں کے لئے بیچ رہی ہوں کہ یہ قائم جاری ہیں۔

آپ کی فطرت

صوفیہ واڈیا

محترم عصمت چیتائی بی۔ اے

بہن دوست۔

یہ سن کر کہ "ایشیا" پھر سے جاری کیا جا رہا ہے۔ سرت ہوئی۔ امید ہے کہ اسی کی صورت دیکھ کر یہ اختیار کو لکھ دینے کو جی چاہے گا۔ نیز امید ہے کہ "ایشیا" بجائے گنتی کے پانے علم اور ہر کاموں کے لئے۔ لیکن دونوں کی رہنمائی اور بہت اولیٰ مرکز زندگی نہ جویہ نامہ کوٹ لی ہے اس نے جانے جتنے حقائق کو چھپا دیا ہوگا۔

خاکسار عصمت

ہندوستان کی ذہنی اور کچل ترقی کے لئے ہمیں ذہنی طبقہ کی نگاہ تازہ بخوشی کو بخش بہت ضروری ہے، گذشتہ دور میں جب کہ ہم غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے معروف پیکار تھے قوم کی تمام کوشش اور توانائی سیاسی سرگرمی کی خاطر وقف تھی، حتیٰ کہ ہمارے کچل سرگرمیوں میں سیاسی تنگ نظری کا فروغ بھی، اس لئے کہ ہم ایسی کئی چیز کو قبول کرتے پر آدھ تھے جو ہلکے سیاسی مشن کی کامیابی میں پروردہ ممد تھی، اب چونکہ سیاسی کشیدگی آزادی کی زیادہ خوش گوار اور کھلی فضا میں ختم ہو چکی ہے، ذہنی اور کچل سرگرمیوں میں ترقی کا بہت امکان ہے۔ ہمارے مستقبل کے لئے یہ ابتداء سبک ہے کہ کچل فضا کا استعمال ہمیں نظر رکھ کر کو بعض ادارے عوامی آزادی کے ادارے ہیں۔ بڑے صبر و تحمل کے کام کے منصوبوں کو لے کر پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اولیٰ مرکز کا ایشیا بھی اسی کام کی ایک کوشش ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، بالخصوص اس لئے کہ اردو ہندی اور انگریزی کے توسط سے کام لیا جائے گا اور اس طرح ہماری تہذیب میں بین گروں قدر دھاکے سمونے جائیں گے۔ یہ کام کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں،

(بی۔ جی۔ کھیر)

ہزاریکسینسی کوڈر سہارا راج سنگہ گورنر آف بمبئی

گورنر آف س۔ بی۔ جی۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۷ء

ڈیر سٹر نظامی!

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۰۸ء

ہذا کی فلسفی نے خواہش کی ہے کہ میں آپ کے ارتقائے روح کے خط
کا شکریہ ادا کروں۔ اور ذیل کا پیغام بھیجوں۔

”مزدت سترہ سو سی چار سو اب اس پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا
کہ ہم اپنے خزانے کے درختوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اگلا مال کریں آج
دنیا کو جسے مادیت سے نقصان پہنچا رہا ہے اس کے سہارے کی مزدت ہے
جاگدہ سر ملنے ہو سکے۔ میں ایشیا کی پوری پوری کامیابی کی آرزو
کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ وہ جدید ہے جو اس نعتیہ اور
کچھ اور اچھے حصوں کے لئے وقف ہے۔“

(ایل۔ ایم۔ ناؤگرنی)

سرتیج بہادر سپرو بارلیٹ لا

۱۹ ابریل ۱۹۱۵ء

مورخہ ۱۵ ابریل ۱۹۱۵ء

جناب بندہ۔ تسلیم دنیا

میں تو دعائی سال سے مرزا خانج میں مبتلا ہوں۔ ایک قدم بھی
نہیں چل سکتا۔ کچھ کام آتے رہ سکتا ہوں۔ میں نے اپنے سیکریٹری
سے کہہ دیا ہے وہ خط آپ کو میری جانب سے لکھ دیں گے۔

میں آپ کے رسالہ کی کامیابی دلی دجان سے چاہتا ہوں۔ مگر میری
کئی کتاب یا اخبار نہیں پڑھ سکتا کیونکہ اخبار یا کتاب اپنے ہاتھ میں پڑنا
میرے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ نیاز

بندہ

تیج بہادر سپرو تعلیم تربیت لعل مرئی دستور ایسی سیکریٹری

ڈاکٹر سپرو اندر سنا بارلیٹ لا

اولین مندرجہ دستور ساز ایشیا

سناٹا ٹبریں ری مڈ۔ پوسٹ بکس ۷۷۲ جی پی او۔ پٹنہ

۱۵ دسمبر ۱۹۱۵ء

میرے پاس نظامی صاحب

آپ کا زیادہ دیر کا خط انگریزی اور اردو دونوں میں مجھے اچھی
لا۔ میں نے آج اور ہفتہ کے ساتھ ڈیڑھ بجی ہے جسے ہمدردی میں کی

سز کرشنا باقھی سنگھ

”ایشیا“ کے لئے میری بہترین آرزو میں، قبول کیجئے۔
سز کرشنا باقھی سنگھ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

میرے واسطے حقنویت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری
ہے کہ حضرت باغ (جنہیں میں ہرگز ”نظامی“ نہیں کہوں گا) ”ایشیا“
کو دوبارہ جادی، اور ایک دارالاشاعت کفایت کر رہے ہیں۔

سازو صاحب اس درجہ مشہور، اور اسی کے دوش بدوش اس
قد مقبول و محبوب شاعر ہیں کہ انہیں میرے پاس کی تعارف کا احتیاج
نہیں لیکن ان کی اس خاصی مفت سے شاید لوگ زیادہ واقف نہیں
کہ وہ ایک نہایت ضابطہ پسند، خوش سلیقہ اور بیدار متفکر انسان بھی
ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جن حضرات نے ان کے مجموعہ کلام ”بادہ
مشرق“ کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گے
کہ جہاں تک کتابوں کی طباعت و اشاعت، اور ان کی زیبائش و
آرائش کا تعلق ہے، ہندوستان کا کوئی صاحب طبیع اور کوئی خوشن
لا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ”مارگزیدہ“ اور ”سنگ گزیدہ“ کے ساتھ ساتھ
اس بدعت ملک میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک مظلوم طبقہ ہے۔ جسے
”ناشر گزیدہ“ کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ میں ان مظلوم ناشر گزیدہ
ہند کو شکر ... سنا ہوں کہ ادبی مرکز پٹی میں سازو صاحب کی زیر
نگرانی ”ہندہ مشرق“ کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم ہو چکا ہے۔ جس میں
ان کے تمام حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور ان کی دعا عملی پیداوار کی
فراخ دلی و دیانت داری کے ساتھ داد دی، اور قدر و قدر کی جگہ کی
دہ رے اپنا ہی دارالاشاعت سمجھیں۔ اور اس سے مستفاد و مست
ہو جائیں۔

سازو صاحب کی طرح ”ایشیا“ کے باب میں بھی کی تعارف کی ضرورت
نہیں۔ ”ایشیا“ میرے لئے جس آب و تاب کے ساتھ نکل چکا ہے، وہ سب کو
مسلط ہے اور اسی پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شائع ہوتے ہی
تمام حیرت پر چھاجائے گا۔

جوش

کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے خدمت کر کے مختلف انگریزی اور دو اور ہندی کی مملو معات کی ایک فہرست بھیجیں۔ تاکہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکوں۔

میں آپ کے منصوبہ کی کامیابی کی آرزو کرتا ہوں اور

آپ کا مخلص

ایس۔ سہنا

مسٹر میک نہاس میئر آف لمبئی

از لمبئی

۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء

ڈیر سہر آشرف نظامی

آپ کا نام تاریخ کا خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے جنوری ۱۹۲۳ء سے ادبی مرکز کے تحت ماہنامہ انیشیا کی اشاعت کا ارادہ کیا ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں "انیشیا" کا مستقبل شان دار رہے گا۔ اس لئے کہ کلچرل اتحاد و ترقی اور کلچرل اشتیاقی جیسے نصب العین کے حصول کے لیے سوانح ہیں۔ میں ماہنامہ کی پوری پوری کامیابی کی آرزو کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

میک نہاس

میئر

مسٹر یوسف مہر علی سوشل ٹیلر

فاجیٹ اسٹریٹ، پٹی ۱۰

۱۲ دسمبر ۱۹۲۳ء

ڈیر سہر آشرف نظامی صاحب

آپ کا خط ملا۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ "انیشیا" کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔ اس کو شش کے لیے بہت لوگ آپ کے ممنون ہوں گے کیوں کہ یہ بہت ہی اہم ہے کہ اردو اور ہندی کا پڑھنے والے دنیا کے سب سے بڑے براعظم کی زبردست مبادی سے واقف ہوں۔ انیشیا کی بادی نصف دنیا کی آبادی کے برابر ہے

پروفیسر نجیب اشرف ندی ایم۔ اے

آپ کے انیشیا اور ہائے براعظم انیشیا کا حال یکساں رہا ہے، شاید یہ نام کی برکت یا اثر ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد انیشیا کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے اور اس مرتبہ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ ان خوش گواری حالات میں آپ کے انیشیا کا بھی ایک نئی زندگی کے ساتھ منصفہ شہر پر جلوہ گر ہونے کا مشرودہ خوش گواری تعلقات کی دنیا سامنے لا دیتا ہے، خدا کرے میرے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوں۔ اس مرتبہ آپ نے جس جوش و اہماک سے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ کامیابی کی بڑی حد تک ضمانت ہے۔ اس لئے کہ ساغر دہی کار آمد ہے اور اس وقت تک کار آمد ہے جب تک کہ وہ گردش میں ہو رہا ہے۔

آپ کا

نجیب اشرف ندی

ملک راج آنند

ڈی ڈی۔ ساغر صاحب

یہ پیام آپ کے ماہنامہ کی عظیم ترین کامیابی کی آرزو کا حامل ہے۔ چارے ملک میں ماضی اور عصر حاضر دونوں کے ادبی اور کلچرل کام کا پھر سے عہدہ کرنا اداس کی قدر میں معلوم کرنے کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ اگر ہم بلند ترین اذانتوں میں مسلسل طور پر چوکنا نہ رہیں گے۔ تو ہم نے اپنی نشاۃ الثانیہ پیدا حاصل کیا ہے۔ اس وقتوں کے معیار اتنے بلند نہ ہوں گے۔ جتنے کہ دوسری جنگ حاصل کیے جا چکے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی رہنمائی میں بہترین تخلیقی اور تنقیدی تحریریں اس رسالہ میں شائع ہوں گی۔

آپ کا مخلص

ملک راج آنند

ادرس میں تلے قدمی و سائل و ذخائر میں کفراب و خیال میں بھی نہیں آسکے ہیں۔ اس کے مختلف ملکوں میں سیاسی اور کچل میدان میں ایک طرفان پر پائے اور ہندوستان کو اس طرفان میں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ آپ کا ایشیا مطالعوں میں دلچسپی کثرت کی جلد چھوڑ کر اس کی امیدوں اور خوابوں کا ترجمان بنے۔

آپ کا مخلص

یوسف ہرملی

مسٹر ایس کے پاٹل ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی

کانگریس ہاؤس ممبئی ۴۰

۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء

عزیز دوست!

مجھے آپ کا پچھلے ماہ ۲۸ تاریخ کا خط مل چکا ہے۔ جب خواہش ایشیا کے لئے مختصر سا پیغام حاضر ہے۔ ہندوستان کی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اس وقت ہندوستانی کا نقطہ نظر بدل جانا چاہئے اور یہ اس لئے کہ ہمارا مشکل سے حاصل کی ہوئی آزادی سخت ہو۔ ہر اچارہ کی پرکوشش ہونی چاہئے کہ وہ اس مسئلے میں ہماری حکومت کی مدد کرے اور مجھے بھرپور ہے کہ ایشیا میں فرقہ دارانہ اتحاد و یکجہلی کا پھیلنا چاہئے، ذہنی ترقی اور قومی حکومت کا استحکام کے حق میں اپنا جائز حق ادا کرے گا اپنے ماہنامہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین آرزو میں تجویز کیجئے۔

آپ کا مخلص

ایس۔ کے۔ پاٹل

مسٹر اے۔ اے۔ فیضی (رکن چیک مسٹر کوشن کوٹ میٹ)

ایشیا ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد پھر بیدار ہو رہا ہے۔ جس کی بڑی خوشی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ ذہنی پس ماندگی کے دور میں اسے مسائل کی بہت ضرورت ہے جو ہمارے ملک کے عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی صحیح طریقہ پر رہنمائی کریں اور انہیں فرقہ دارانہ ذہنیت کے ادبار سے نکال کر عقل و اتحاد کا راستہ دکھلائیں۔ خدا کرے ایشیا کو اپنے تمام ممالک میں کامیابی

کوشن چند (رکن ادارہ دنیا ادب ممبئی)

۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء

پیارے بھائی ساعر

اس کی مجھے بے حد خوشی ہے کہ ایشیا دوبارہ شائع ہو رہا ہے، اور آپ کی اور اس میں۔ آپ نے آپ واقعی ایشیا کی ادب کا ترجمان بنائیجئے۔ اس وقت پورے ایشیا میں عوام انقلاب کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں، اس وقت انگریز ادیب لوگ سوئے رہے تو کوئی نہیں اٹھائے گا نہیں۔ عوام سوئے ہوئے کو پاؤں تلے دوند کر گئے ہر جگہ اٹھائے جئے امید ہے کہ ایشیا پڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے گا۔ لاشوں کے ادب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

کوشن چند

خواجہ احمد عباس (رکن ادارہ دنیا ادب ممبئی)

جس طرح دنیا کے آفتی پر ایشیا کا روشن شامہ آج بھر رہا ہے اسی طرح یقین ہے۔ ساعر صاحب کا "ایشیا" بھی آسان صحافت پر چلے گا۔

"ایشیا" کو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ چلنا ہے۔ اور تمام ترقی پسندوں کو "ایشیا" کا ساتھ دینا ہے۔

احمد عباس

سید ممتاز حسین ایم۔ اے

ساعر نظامی صاحب نے ایک بار پھر ایشیا کی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایشیا جس آب و تاب اور نئے پیغام کے ساتھ پھر کی پڑاؤ شوب سر زمین سے نکلا گیا تھا وہی ایشیا آج پھر پھلنے سے نکلا جا رہا ہے۔ ساعر صاحب ایشیا کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس وقت ایشیا میں ایک نئی تبدیلی پا رہی ہے۔ اور تبدیلی ایشیا کی زندگی کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ آج پورا ایشیا اپنی آزادی کی آخری جنگ لڑ رہا ہے ہمارے ادیبوں کی اس جدوجہد کا ایک نئے پیغام حیات کے ساتھ مزین کر رہے ہیں۔ وہ پیغام زندگی کو لبیک کہتے اور تمام رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کا پیغام ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا کا نیا پھر نہ صرف

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۷ء

حاصل ہو، اور موجودہ دور تاریکی میں ایک روشن ستارہ بن کر
قوم ملک کی رہبری کرے۔
آصف نعیمی

انحطاط پسند طاقتوں کے خلاف جلال و جبروت کا مظہر ہوگا بلکہ
نئی زندگی کی جمالی قدروں کا سہارا بنے گا
منازع حسین

راجندر سنگھ بیدی بی۔ اے

فیس کچنر لٹریٹر - کینڈل رڈ

ممبئی

محترمی ساغر صاحب تسلیم
"ایشیا" کی تجدید کی متعلق سننا۔ بھئی خوشی ہوئی۔
زبان کے مسئلہ میں جتنا جھگڑا ہے، اس کا سبب براہِ اصل یہی ہے کہ ترجمہ
زبان زیادہ سے زیادہ بولی جائے۔ اور نشر کی جائے۔
مجھے یقین ہے کہ "ایشیا" ایسا ماہنامہ سازدوں کے مستقبل کی بابت
ہمارے سب شکوک و دودھ کو مٹائے گا۔ یہ حق الوسع ہر قسم کے تعاون
کا یقین دلاتا ہوں۔

نیا زینہ

راجندر سنگھ بیدی

۵ رجنوری ۱۹۴۷ء

۱۳۳

رامانند ساگر بی۔ اے

"ایشیا" کے دوبارہ اجراء پر میری طرف سے مبارک باد قبول
فرمائیے۔

خدا کہے کہ "ایشیا" موجودہ دور میں ایشیا کی آواز کی
علیہ اور ثابت ہو۔ اور مستقبل میں اس کا لحاظ۔

رامانند ساگر

سید شہاب الدین دسنوی

آزادی ہند کے بانی "ایشیا" میں حرکت پیدا نہ ہوتی تو یقین
ہوتا۔ اب "ایشیا" کے سامنے نئے زلوعے اور نئے میدان ہیں۔ بادۂ
ادب کے توالے "ساغر" کی طرف آنکھ کھلائے ہیں۔ اوتساک کے
ایسے پورے کی فردت ہے جو ہمارے اخلاقی اور سماجی زندگی کے معیار

نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کراچی ٹیوٹ اے بی

مجھے یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہوئی کہ میرے نوجوان دوست
ساغر نظامی صاحب نے امانہ ایشیا کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام
مکمل کر لیا ہے۔ امانہ ایشیا ایک بلند پایہ ادبی رسالہ رہا ہے
جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور اس امانہ رسالہ کے مستقبل
یہ کہنا بھی ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ یہ اردو ادب کا ایک عبادی رسالہ
تھا۔ اور اب ذوق اس کے بند ہو جانے پر ایک خاص کمی محسوس کر رہے
ہے، ساغر نظامی صاحب سختی مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی احمک
کوششوں سے اس کمی کو دور کر دیا۔

میری دعا ہے کہ انشاء تعالیٰ امانہ ایشیا کو خاطر خواہ طور پر
کاہیاب کرے۔ اور یہ رسالہ ادبی دنیا کے لئے مفید معلومات اور
ادبی ذوق میں اضافہ کا باعث ہو۔

محمد اسماعیل خاں

ممبر کراچی ٹیوٹ اے بی ہند

۱۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

آنرےبل نثار احمد خاں شروانی وزیر راجستھان پٹی

۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء

ماہنامہ "ایشیا" ایک عرصہ کے بعد پھر وجود میں آیا
ہے یہ پھر جدید ساغر صاحب نظامی کی زیر نگرانی میرے سے ماہ
بہ ماہ شائع ہو کر اعلیٰ ادب پیش کرتا تھا۔

میں ساغر صاحب سے ایک عرصہ سے واقف ہوں کہ میری ہیں
ان کی کوشاں شاعری کا شوق ہوا۔ نہ بہت جلد اپنے آپ کو اس نوجوان نے اپنی
دنیا میں روشناس کر لیا۔ آج ہندوستان کا ہر ادب نواز شخص
ان سے واقف ہے ان کی سیاسی نظریں جوان کے قلم پر ورنہ
جلد بات کی تائید دہوتی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں خراج تحسین

ماہنامہ ایشیا فردی طور پر؟

کو بدل کے، بیاروں و دماغ کی اصلاح کر کے اور مریضوں کو
روح میں بالیدگی پیدا کر کے۔
مجھے آمید ہے کہ "ایشیا" یہ خدمت انجام دے سکے گا
سید شہاب الدین و سنوی
۶ جنوری ۱۹۳۹ء
بمبئی

اختر الایمان

دکن اور ماہنامہ خیال "بمبئی
"ایشیا" ان پرچوں میں سے ہے۔ جن پر اردو کے ماہناموں
کو نام ہے۔ ساغر صاحب سمجھ رہے ہیں کہ وہ پرچہ نکال رہے ہیں
میں سمجھ رہا ہوں کہ نئی آنکھیں کھلے۔ دم لے کر دلی بات ہے۔
"ایشیا" نے پہلے بھی اردو کی خدمت کی ہے۔ آج بھی اس
کی وہی نیت ہے۔ میاں کے بارے میں کچھ کہنا لا حاصل ہے۔

اختر الایمان
۶ جنوری ۱۹۳۹ء

قاصی بدر الحسن بدر جلالی بی۔ اے (علیگ)

برادر عزیز حضرت ساغر نظامی نے یہ خبر خوش عنایت
فرمائی ہے کہ سائہ ایشیا اپنے نئے جسم اور نئے روپ
میں پھر زب نظر و فکر ہونے والا ہے۔ اگرچہ انتظار کی
گھڑیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں اور آنکھیں تیار ہونے کے
لئے مضطرب ہیں۔ پھر بھی غریب سے جو سرت قسبی
ہوئی ہے۔ وہی اپنے عزیز بھائی کی نذر کرتا ہوں۔ ۶
برج ترہہ گرد جاں فدا نم دوست

ہم ہندیوں کی منتائے سیاست کا ایک روشن
اعد و لغز سب پہلواخت ایشیا کے حسین خوابوں کی وادھی
تغیر میں ہیں۔ اس لئے حضرت ساغر کے ایشیا کی
نشانیہ نامہ آن آرزوؤں کی تکمیل کا ایک عنوان
معلوم ہونا ہے جو اتحاد ایشیا کی آفرینش سے وابستہ ہیں۔ ایشیا قیقا
ہائے دوق ادب کی ایک رنگین شاہ گاہ ثابت ہوگا اور ہمیں مانگیر

وصول کر چکی ہیں۔
ساغر صاحب ایک خوش الحان خوش گوشا کے علاوہ شہید
ادیب بھی ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف نے ہندوستان کے نوجوانوں کے
دلوں میں آواز کی ایک نئی روح پھونک لی۔

آج جب کہ ہندوستان آزاد ہے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ
ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے ایک ایسا ترقی پسند و محنت مند
ادب پیش کیا جائے جو عوام میں اتحاد۔ ترقی۔ یکجہلیت و تعمیر کی موج
پیدا کرے۔

مجھے آمید ہے کہ ایشیا ساغر صاحب کی زیر نگرانی و
ادارت ایسا ادب پیش کرے گا۔ ادبی دنیا میں یقیناً اس ماہنامہ
کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

میری دعا ہے کہ ساغر صاحب اپنے مقام مدین کا صاحب ہوں
نثار احمد شیرانی

پندت سندر لال جی (الہ آباد)

پیارے بھائی ساغر صاحب
آپ کا ادب سب کا خط مجھے ملے گا۔ آپ اپنے ماہنامہ
"ایشیا" کو پھر سے نکلنے جا رہے ہیں۔ مبارک!

میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس ماہنامہ کے
فروری سب مذہب کے لوگوں، خاص کر اس ملک کے ہندو
اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک
آویں، فرقت پرستی بلکہ فرقہ وارانہ نقطہ نگاہ دماغوں
سے مٹے، ہم سب کے قدم ایک مشترکہ قومیت، مشترکہ
کھڑ اور مشترکہ سماجی زندگی کی طرف تیزی سے ساتھ چلیں
میری یہ بھی خواہش ہے اور درخواست ہے کہ "ایشیا" تہ
کی زبان آسان بول چال کی اور ہندوستانی ہو۔ مثال
کے طور پر ہندوستانی میں وکیل کی جگہ دلا نہیں وکیل
یا گیلوں ہونی چاہئے۔ ایسے ہی مقصد کی جمع مقاصد نہیں
مقصد یا مقصدوں۔ اردو کو بھی اگر اس ملک میں زندہ رہنا
ہے تو یہی شکل اختیار کرنی ہوگی۔ ہندی ہندوستانی بنا ہوگا
ہندی اور اردو کی الگ الگ جاں نیا دیں سے ہٹ کر ایک
نئی جلی پیاری قومی زبان کو روپ دینا اور بڑھانا ہی ہوگا۔

آپ کا بھائی
سندر لال

شیخ محمد عبداللہ زید عظیم حکومت جہوں و کشمیر

قزوی ساغر صاحب

تسلیم آپ کے دو دلوں خطوط، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔
آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ موجودہ حالات میں وہ بہت ہی اہم ہے
ہندوستان کے باشندوں میں جو ذہنی شور مچا کر اذیت کا سب سے اہم
تفاصلہ۔ جہاں غلامی سے ذہنی غلامی زیادہ پہلک ہو کر رہی ہے۔ یہ
صحیح ہے کہ ہندوستان نے سال ہا سال کی کوششوں کو
قربانیوں کے بعد جہاں غلامی سے آزادی کو حاصل کر لیا ہے۔ لیکن
انگریز کی سامراجی طاقت نے ہندوستان کو نہ صرف جہاں کی طرح
پر غلام بنایا تھا بلکہ ہندوستانیوں کے ذہن کو بھی غلامی کے
سائے میں ڈھال دیا تھا۔ اور جب تک ہندوستانیوں کے سینے
تھکنے کے طریقے وہی رہیں گے۔ جو کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں
انگریز نے ان کو سکھلائے تھے تب تک یہ خیال کہ جہاں ریش
سامراجی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے بہت بڑا دھوکا ہے۔ ہندوستانیوں
کو یا تو بے طور پر ذہنی نشین کر لیا جائے کہ جن کے زور پوں کی
وجہ سے ہندوستان انگریزی سامراج کے چنگل میں پھنسا تھا اور جن کی
وجہ سے ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جب تک وہ کمزوریاں موجود
رہیں گی ہندوستان کی آزادی ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس لئے وقت
اگلے کہ ہندوستان کے اوپر مل ہم زلفیہ کی طرف اپنی ساری توجہ
مركز کریں۔ کیونکہ ذہنی طور پر آزاد کرنا ایک دایہ کا کام ہے آپ نے
اس فرق کو انجام دینے میں جو بڑی راکھی ہے میں اس کے لئے آپ کو تہن
سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔
آپ کا مخلص
شیخ محمد عبداللہ

حسن شہید شہروردی

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو ہائٹا ایشیا تو اس مقصد
سے زندہ کر رہے ہیں کہ اس سے نئی نسل انسان کی خدمت ہو سکے اور ہماری
پُر آشوب زندگی کی نقصان نہ ہو سکے۔ لوگوں کی پس کے اشتراک بھائی
چارہ اور روادار کی کوئی دنیا۔ ان کے سر کا لیا ظاہر کم کرنا اور اس بات
کو زنی دنیا کو لایک دوسرے کو بھی طرح سے کیجیے۔ جو چیزیں ایسی ہیں جن کے اثر
کام زنی کی ضرورت ہے اور میں آپ کی کوششوں میں طرح کا کامیابی کی آئندہ توفیق

آپ کا مخلص

شہید شہروردی

ہائٹا ایشیا فورڈی

تبیات کا سبق دے گا۔

”اس دعا میں از جملہ حیاتیات باد“

تبدار جلالی

قاضی عبدالغفار مراد آبادی

ہماری بزم ادب میں الیشیا ایک ہدم دیرینہ ہے جو
بھرا س بزم میں داپس آ رہا ہے اور ایسے وقت داپس آ رہا ہے جبکہ
اس کی بہت ضرورت تھی۔ تقسیم ہند نے وہ سب کچھ تقسیم کر ڈالا جو
ہمیں عزیز تھا۔ ہماری شوریہ درستیا نے۔ صرف ملک کو،
خانہ انوں کو اور دلوں کو۔۔۔ تقسیم کر دیا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ
ہندوستان کی انسانیہ کو تقسیم کر ڈالا اور ہماری بدستی
پر ایک ایسی ہرنگادی جسد ہے ہماری سیاست کی رسوائی پر!
اس بد بخت تقسیم نے ہماری ادبی مخلوق کو بھی اس قدر بھم کر دیا
کہ اب زبان باغیان کف و شرف و شرف کی کوئی پرچہ نہیں ملتی
کہیں نظر نہیں آتی۔ اس جھل کو بھرا زمرہ نو سنوارنا ہے
اور اس دیر نے کو بھرا کرنا ہے۔ جس گوشہ میں کبھی کوئی چراغ
تہ دال باقی ہوئے سے جلد سے جلد منظر عام پر آنا چاہئے غلط
سیاست ملکوں اور قوموں کو تباہ کر سکتی ہے لیکن دلوں اور
دماغوں کے آتش خانوں کو مزہ نہیں کر سکتی۔

آدو ادب کے تمام حامیوں اور خابوں کی ہمت میں
تمنا میں حضرت ساغر کے ساتھ ہیں۔ میرا بام صفت ایشیا
ہے۔ جو ایشیا کے ایک حصہ میں سما جاتا ہے۔
گلشن پھر بیان کش اے مجھ کا گلاب اندھا!

محمد عبدالغفار

لکھنؤ ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر دوست محمد خاں

اگر آپ اب بھی میدان میں نہ آتے تو تاریخ آپ کے
ادبی گناہ کو کسی صاف نہ کرتی۔ میں دل و جان سے ایشیا کا
خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور اس کی کامیابی کی ہر ممکن کوشش
کروں گا۔

دوست محمد

آرمیل ڈاکٹر سمپورنا نند وزیر تعلیم و محنت

حکومت یو۔ پی
لکھنؤ ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء

یہ فردی ہے کہ ہندوستان کے کلچرل اتحاد پر وہ لوگ
زور دے جن کے لئے اس موضوع پر مستند ہے۔ ہمارا کلچرل ورثہ
بہت شاندار ہے جس میں بیسیوں سوئے مختلف بنیوں کے نکل
کر اس میں سمونے گئے ہیں اور جن سے وہ ورثہ سرسبز و نہال
ہوا ہے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس نے ایک سخت دھارے
کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے حیات بخش ذائقے صرف ہندوستان
تک ہی محدود نہیں ہیں، سب سے آرزو ہے کہ ایشیا کو اپنی
کوششوں میں کامیابی حاصل ہو۔

سمپورنا نند

مولانا حفظ الرحمن

ماہنامہ ایشیا ہندوستان ممتاز اور مؤثر جرائد میں تین
ماہنامہ ہے۔

عدہ اور مفید ترین مضامین کی اشاعت، بہترین
ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے اس ماہنامہ کو اردو کے
اخبارات میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔

میں نے ایشیا کے بعض پرچے جسنے جسنے دیکھے ہیں
اس میں شک نہیں کہ آئیے اپنی زندگی میں جو بلند پایہ علمی،
اخلاقی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ علم و ادب
کی دنیا میں تقدیر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

سب سے آرزو ہے کہ ملک کے علمی حلقے ایشیا کی تدبیریں
اور اسے ماضی سے زیادہ مستقبل کی کامیابیوں نصیب ہوں۔

خادم ملک و ملت

محمد حفظ الرحمن

۸ جنوری ۱۹۲۹ء

محمود جالندھری

ساعر بھائی

آداب عرض۔ ایشیا کا نیا جہم مبارک! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ
ایشیا کو اب مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا جا رہا ہے اور آپ نے
ایشیا کی جس پالیسی کا خط میں اظہار کیا ہے اس سے کہ آپ اسے برقرار
رکھنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

آپ کا

محمود جالندھری

ادیب لکھنوی بی۔ اے

بلدہری (ضلع مراد آباد)

ارمان تھے جو دل میں ان کی تائید ہوئی
زندہ پھر اہل دل کی آسید ہوئی
پھر علم و ادب کی ہوگی سچی خدمت
صد شکر کہ ایشیا کی تجدید ہوئی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر علی گڑھ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۹ء

ساعر صاحب محترم۔ آداب

گرامی نامہ صادر ہوا۔ بالوفرائی اور عزت افزائی کا شکر گزار
ہوں۔ آپ نے خوب کیا کہ ایشیا کے احیاء کا ارادہ کر لیا۔ ایشیا
جب نکلتا تھا تو آپ کے لطف و گرم سے اس کے مفلحانہ
سورج ملتا تھا۔ میں اس کا جب بھی محضرت تھا اور مجھے یقین ہے
کہ آپ کی ادارت میں وہ اب بھی اور مقبول رہے گا۔
کل میں لکھنؤ میں تھا، ایک دوست کے بیان شام کی جانے پر
بہت سے نامور اہل قلم مل گئے۔ آپ کے ایشیا کا ذکر و ایشیا سب نے
بڑی محنت کا اظہار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیا کے حق میں یہ بڑی مبارک
بات ہے۔ میرے ذہن کے پیر سے سب دوست جھگڑتے ہیں۔ کیا کروں
شرمندہ ہوں ہوں اور کچھ کر نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہمیشہ صاف فرماتے آئے
ہیں، جب میری تحفہ بدلتی ہو تو آپ اپنی دفعہ کیوں بدلتے، یعنی آپ
برہم ہوتے رہیں میں بھی لگ پر لکھتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے اپنے دیکھیں۔

رشید احمد صدیقی

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۲۹ء

طوفان سے پہلے طوفان کے بعد!

ابھی جب ۲۱ نومبر کو ممبئی میں طوفان آیا تو میرے مکان کے پہلو میں جو تناور درخت تھے وہ بھی ٹر پڑے۔ مکان سے نیچے آ کر انہیں دیکھا دیکھ کر دھڑکنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے روز آج تک بڑے سلیم ہوتے تھے۔ ہینکس، بد شکل، نفاست سے محروم، تہذیب کے دروازے سے دھتکارے ہوئے بے بس گندے انسانوں کی طرح وہ راستوں کی خوبصورتی کے شمس تھے جس نے کہا مگر کبھی جھاڑوں سے محروم ہو گئیں کوئی بولا راستے سونے ہو گئے۔ تھکے پارے ان درختوں کے سائے میں اب گھڑی بھر دم توڑ لیتے تھے۔ میرے کہنا ان کے سائے میں دم لے کر میری راہ طے کرنے والوں کے سہارے سمٹ جاتی چاہئے تھے۔ میں ان جادو بڑے درختوں کا سایہ نہیں چاہئے۔ طوفان ٹھیک ہے کہ اس نے نئی تخلیق کی راہیں کھولیں۔ ہم جھپکے اور پھیلے ہوئے عمر رسیدہ درخت نہیں چاہتے۔ ہم تازہ دم نئے پھولنے والے پودے چاہتے ہیں۔ جو سوکھاپ وہاں میں پھولیں اور راستوں پر نئی خوبصورتی بکھیریں۔ اگر مگر کبھی پھول جاتیں تو پوری خوشی کی بات تھی۔ سیرت کی سڑکیں بننے کی راہ کھلتی۔ یہ ڈرامہ کی کالی کولٹی سڑکیں اب رنگا ہوں کو بالکل نہیں بھاتی۔

میرے یہ فقرے سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ طوفان کی تباہ کاریوں کی داستان کہتے رہے۔ میں نے کہا تخریب و تعمیر لازم و ملزوم ہیں۔ مگر بڑے درختوں نے ہونے لگاؤں کی اور بھی ہوئی کشتیاں یا طوفان کی زد میں آئے ہونے لگاؤں کی شہارے قائم؟ اب گزراؤں کا ڈھیر برائے ہو گیا ہے کیا حاصل؟ کہ طوفان کیا ہمارے کیا ڈھیر اور زندگی کو کس درجہ تو ٹھمر ڈر کر رکھ گیا۔؟ اگر کہہ سکتے ہو تو اپنی دنیا کی ناخوشی، اپنی قوت مقابلہ کی خامی اور اپنی زندگی کی بے بسی کا اندازہ کرو۔ طوفان کی تباہی کا شکوہ کیوں ہے؟ ہمارے چشم و ابرو میں رات اور دن کی پوشیدہ کیفیت

تقسیم ہم

جس طرح سمندروں میں طوفان آتے ہیں، خلا میں طوفان آتے ہیں، زمین و زلزلوں سے متق ہوتی ہے۔ اسی طرح قوتوں کی دنیا میں بھی طوفان آتے ہیں، عام طوفانوں کی طرح "تقسیم" بھی ایک طوفان تھی، خوفناک، بھیاں تک اور خوں، قدرت کے طوفان غیر شعوری ہوتے ہیں، یہ انسانوں کا شعوری اور اختیار ہی طوفان تھا جو ہماری زندگی کو خوشی بہا لے گیا۔ اس کی ہر موج بچائے خود ایک طوفان تھی جس کے پتھروں میں تاریخ، ابد تک بچکے لکھا رہے گی۔ اس طوفان نے تہذیب و تمدن، سیاست و مذہب اور ہماری جملہ روحانی و اخلاقی قدروں کو بقدر بنا دیا۔ اس کی موجوں نے ہماری زبان و ادب کی راہی بھی خستہ و خوار کر دیا۔ یہ تو

دھڑپیں ہیں جن کا ہم شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن بے شمار متاع ایسی ہے جس کی بربادی کا ہمیں اندازہ نہیں۔

اس طوفان کے ایک نہیں، ہزار لاکھ پہلو ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد تو اس کے کچھ اشیائی رخ بھی ہمیں صاف نظر آسکتے ہیں۔

پہلی نظر میں جس پہلو پر نگاہ جمی ہے وہ ہماری قومی جدوجہد کا پہلو ہے۔ اس طوفان نے ہماری قومی تحریک کی خامیوں اور ماضی کی کمزوریوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تہذیب و تمدن زبان و ادب ادب ہمارے ماضی و حال کے تمام دروازے کی حفاظت کے مدعی تھے۔ ان کے ہر دعویٰ کو باطل کر دیا ہے اور جو لوگ ایک ملی تہذیب، متحدہ قومیت، ملکی وحدت اور مشترک وطنیت کے سہارے انھوں نے اپنی تعمیروں کو اپنے معنی ہمارے طوفان میں غرق کر دیا اور خود جانے کر نامعلوم سمندر میں بیٹھے ہیں۔ اس بار کا ذکر نہیں۔ اس بار کے دو قومی نظریے رکھنے والوں پر تقسیم کے سامنے آنے والے تینوں نے ثابت کر دیا کہ ان کی مدعہ حلقہ نہیں معلوم ہو گیا کہ تقسیم کے بعد وہ ان طریقوں سے اپنے کسی ثقافتی دروازے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جن طریقوں پر ان کو یقین حاصل تھا کہ وہ ان کی جد آگاہانہ قومیت کے جملہ اختیارات کی پوری حفاظت کر سکتے ہیں۔

تقسیم کے وقتی نتیجے

تقسیم کا پہلا نتیجہ تبادلۂ آبادی کی تباہ کاریوں کی صورت میں رونما ہوا۔ جس نے باقائریہ حقیقت واضح کر دی کہ مجتہدہ سے کہیں زیادہ اتحاد اور اشتراک کی ضرورت تھی اور ہمیں دو موافق تین ہندوستانی انسانیت کی دائمی بہتری اور ترقی و ترقی غرض سے ہندوستان جانے والوں کو آسودگی، روح و قلب نصیب ہوئی اور یہ پاکستان سے ہندوستان والوں کو آتمک چین ملا۔

ان طوفانوں سے پہلے کرنے والی حالات سے بدراشدہ وہ اہم سیاسی مسائل تھے جو دونوں حکومتوں کی متحدہ کوششوں کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جیسے جیسے زخم بھر رہے ہیں، ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم نے اپنے ہی ناتوازی سے اپنا منہ بچا ہے انسانیت کے رخنہ پرستی خراشیں ہیں وہ ہمارے ہی نتیجہ جنوں کی کافور دنیا ہیں لیکن ہم علیحدہ ہونے کے بعد بھی ایک اہم منہ کی ضرورت سے انکار

نہیں کر سکتے۔ ہم ایک خون، ایک جسم، ایک روح ہیں، تقسیم کے بعد جو سب سے عجیب حقیقت سامنے آئی ہے وہ لائبرٹ (جی) ہی ہے جس سے ان کا راجہ نتیجہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔

متحدہ قومیت کا خواب

متحدہ قومیت کا خواب محض خواب نہیں تھا ایک حقیقت تھا جس کی اساس تاریخ میں بہت گہری ہے اس اساس کو ایشیائی فلسفے کے اہل الطبیعیات نے تقسیم کے مطابق کے معنیوں پر کیا ہے۔ مشرق کی اقوام باؤپرست نہیں وہ مدح کی اہلیا کی گولہ بٹوں کی قائل ہیں یعنی ایشیائی ثقافتی اتحاد کی اصل بنیاد ایک الہیاتی تصور ہے جو تمام ایشیائی مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اسی روحانی رشتے کے پیش نظر تمام مشرقی قومیں ایک ہی قوم تصور ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی مذہب کو مانیتی ہیں۔ اگر متحدہ قومیت کے مدعی یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم ہیں تو ان کی دلیل گرو نہیں تھی۔ دونوں قومیں روحانی علاقوں اور آسمانی قوتوں کی قائل ہیں اور دونوں ایک خدا کو مانیتی ہیں۔

طوفانوں کی آواز..... ایک وسیع اور اہم سوال ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے تاریخ اور وقت کے پہلوؤں سے جھوٹے ذلے تمدنی حالات و واقعات کا تجزیہ کرنا پڑیگا۔ عیسائیوں کے قریب انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں برطانوی سامراج کے غوس دم آئے۔ تاریخ کے انقلاب عمل کے لحاظ سے منشی انقلاب سے زندگی میں کسی قدر تبدیلی پیدا کی اور انگریزی حکومت نے ہندوستان میں قدیم جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ ہم ایک نیا زمانہ سے نکالے اور دوسرے قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ جس کا معنی تقدیر ہے۔

کشادہ تھا لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کا رتبہ عمل ہندوستانوں پر اس شعور کے ساتھ نہیں ہمارا کہ وہ ایک نظام سے آزاد ہو کر دوسرے نظام میں داخل ہو رہے ہیں، پہلا حال زیادہ سخت تھا جسے ارتقائی عمل نے توڑ دیا ہے اور نیا حال اس کے مقابلے میں کمزور ہے جسے وہ آسانی سے توڑ سکتے ہیں۔ مگر اس انقلاب کا اثر ہندو مسلمانوں پر جمعی صورت میں ہوا۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ برائی زنجیروں کی یاد میں کی گئیں، جتنی تحریکیں انھیں وہ سمجھے والیں جانے کے لئے تھیں آگے بڑھنے کے لئے نہیں عوام کا ذہن جزوی شعور اور بالآخر نہیں تھا نہ ہندو کی کٹا ہلائی نہ اور اچانک اسلام کے دور میں نتائج نمک

نہیں سمجھ سکا اور ہمارے سیاسی مفکرین کے پاس (جو خود
 وراثت کی دقیقاً فہمی قیدوں سے آزاد نہیں تھے) نے دے
 کر صرف ایک نسخہ تھا کہ وہ عوام کو ماضی کے نام پر بیدار کریں
 اس نسخہ کیسے کے اجزاء ترکیبی میں سب سے بڑا جز مذہب
 کا تھا۔ جس کا نام نے کے غلامی کے خلاف مدام کا رویہ بنایا تھا
 سیاسی داخلاتی طریقوں کی تشخیص ہی غلط تھی۔ انھوں نے فرض
 کی حقیقی طاقت کو معلوم نہیں کیا جو جاگیر داری سے لے کر سرمایہ داری
 تک عوام کی روح میں گھس گھس رہی تھی۔ عوام کے مذہبی
 احساس کو جدید کیا گیا تاکہ سرمایہ داری غلامی کی نیچر سے توڑی
 جاسکے، برطانوی غلامی کو اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں
 کے اخلاق و اعمال کے زوال کی بنیاد قرار دیا گیا۔ سیاست دانوں
 سے لے کر شاعر اور ادیبوں تک نے ایک ہی راگ گایا کہ ہاری نجات
 مسلمانوں کے گردن و سطلی کے واپس لانے میں مغربہ اور اس مقصد
 کے حاصل کرنے کے لئے برطانوی غلامی کی زنجیریں توڑ دینا ضروری
 ہے۔ اس طرح مسلم عوام کے ذہن پر یہ چھاپ پڑی کہ آزادی کے
 معنی اسلامی حکومت کے قیام اور بدروستان میں مسلم اقتدار کے ہیں۔
 اس طرح ہندو مذہبناؤں نے جن خطوں پر ہندو عوام کو جنگ
 کے لئے تیار کیا ان کے وائٹس بھی پراچین تہذیب، ہندوستان کی
 اور ہندوستانی تہذیب کی تمام ہندو روایات سے جاتے ہیں اور انہی کے
 احیاء کے وعدوں پر قوم کی مذہبی تربیت کی گئی۔ اس طرح آہستہ
 ہندو مسلمانوں کے فکر و عمل میں مسلسل تغاؤ پیدا ہوتا چلا گیا اور وہ اس
 وقت نمایاں ہو جب آزادی کی منزل قریب آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تغاؤ کا پس منظر ہیوت ویتس
 جس میں ہمیں دوسرے اسباب کی نشانیاں ملتی ہیں جن کا تعلق
 ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی غامی اور سماجی تضام سے بھی
 ہے لیکن بہر حال یہ ہمارے سیاسی مفکرین کی ناچنگی تھی کہ انھوں نے توینا
 کے واضح خیال کی بنیاد پر ہندوستانی عوام کی تربیت نہیں کی۔ اس کے
 اعمال و افکار میں ترقی پسندی کا اتنا ہی جزو تھا کہ وہ آزادی چاہتے
 تھے باقی محبت ہندی ہی جیت پھر بھی چکے گردا دیں۔ وہ جیسے کہہ گئے جن
 مسلمان اور ہندو عوام کو تقریباً پندرہ سو سال کا غلامی کا یہ معلوم بتایا
 گیا کہ شاہی پھر واپس آجائے گی اور آزادی کی تیسری سلسلہ اقتدار قائم ہوگا
 یا تو ہم آریہودت کا ر یا انی اقتدار ہندوؤں کو حاصل ہو جائیگا اور وہ عوام
 راج کی برکتوں سے مالا مال ہو جائیں گے ان کے ذہن آزادی کی غیر منطقی

توجہ کیوں کر کر سکتے تھے کہ حقیقی آزادی کا مقصد ایک نئے آدمش پر
 پر موقوف نہ ہو جو قیامت کی بنا پر پستی قوم کی محکم تعمیر کے مترادف ہے۔

زہر سے زہر کا تریاق

ادھر ہندو اور مسلمان رہنا گزرے ہوئے دور کی غیر مرتقی
 مذہبی ثقافت کے نام پر عوام کو انگریزوں سے بھرا رہے تھے اور انگریز
 بھی ان زہریلے خون سے ناخن نہیں تھا جو ہمارے سیاسی داخلاتی
 طبیب غلامی اور محکم کی جراخ کو ہلاک کرنے کے لئے جو بزرگ بکھڑے
 زہر بک انگریز نے اس زہر کا تریاق انہیں کے زہر سے حاصل کیا اس نے
 اس اتحاد کو جو نیم مذہبی سیاسی شعور کی بنیاد پر پیدا کیا جا رہا تھا
 مذہب ہی کے نام پر ختم کر دیا پلان بنایا۔ اور ان نفاذوں کو دھڑلے
 سے استعمال کیا جو قومی تحریک کے اجزائے ترکیبی میں موجود تھے۔ مذہب
 کے جزوی اور ذروی اختلافات کے نام پر بڑھاپا سامراج اور ملک کے
 غداروں نے قومی تحریک کا ہر ممکن توڑ کیا اور اسے نمایاں کامیابیوں
 لئے ہوئی کہ ہندو مسلم عوام میں آج تک جس جذبہ کو ابھارا گیا تھا وہ دین
 دھرم کی غلط فہمی پر تھا۔ اس جذبے کے دودھ مارے ایک دوسرے
 کے تحت ان شعور و تحقیق سے ناخالص ہو کر آزادی کے جوش میں غلامی کی
 آگہنی دیواروں سے بھرا رہے تھے۔ انگریزوں نے یہیلان و دھاروں کا
 بند باندھا اور ہر شخص کو مخالف ستوں میں بوڑھا دیکھتے ہی دیکھتے
 یہ دھارے بے پناہ مسللا ہیں تبدیل ہو گئے اور ملک میں اختلاف
 و لفاظی کا ایک ماحول برپا ہو گیا۔

ہندو مت اور اسلام کے نام پر ملک میں جواگ لگانا لگی وہ آگ
 کلا بڑا اور ہیشنگز کے عہد سے لے کر ٹاؤنٹ میں کے عہد تک ہمارے
 اخلاق و انسانیت کو بھونکتی رہی۔

جیسے جیسے انگریزوں کو ظان آزادی کی خشونت اور ہر گری کا
 اندازہ ہوتا گیا وہ نئے نئے مذہب باندھتا گیا اس نے ہندوستان
 کا تاریخ میں تیسری تاریخ کی اس نے قومی حیثیت کے ہمہ احساسات
 کو زندہ کیا اور مشترک قومیت کی داغ بیل کو مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش
 کی۔ اور سیاست کے طبق سے بالا خرقہ پرستی کی اثر رسوخ پیدا
 ہوئی۔ جس نے ہندوستان کو تمام عالم میں رسوا اور بدنام کر کے
 چھوڑا۔

غلامی کے خلاف لڑائی میں قوم پرستوں کو وہ تمام مصلح بہ
 بڑے جو حکومت، بیوروکریسی، فزق پرستی اور دوسرے وطن دشمن

عناصر کی طرف سے اُن پر توڑے گئے اور وہ انگریزی و ملیٹی کی مہر کاٹا ہوا نیک نہ بھاسکے۔ انھیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اتحاد ممکن قوتوں کے مقابلے میں کوئی خوری اور متحرک اقدام اُن کے بس کا نہیں تھا، وہ کوئی ایسی تحریک برسرِ کار نہ لاسکے۔ جو سائنسٹک اصولوں پر مذہب زدہ عوام کی ذہنی تربیت کر سکی یا اُن کو مذہب کی مشترک حقیقتوں سے مددگار بناس کر دیتی۔

میرے خیال میں جب تک آزادی کا وہ دور جو برطانوی سامراج کے نئے نئے دادریش کی زدوں میں گنبد۔ ہمارے زندگی کی بجلی تھوں میں المناک آتار پیدا کرتا رہا۔ مذہب زدہ عوام غیر شعوری طور پر کچھ مدت کے لئے سامراج سے ملکر لے لیکن ان کے ذہن صاف نہیں تھے، مقصد کی تصویر تو عہد کی بھی اور منزل کے آثار پر تبسم اور اسکا اصل سبب تھا کہ ہندو مسلم عوام باہمی محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک مشترک عقلم کے مقابلے میں نفرت اور بغض کے باعث متحد ہوئے تھے۔ اس مکرور رہن میں کو چار حریف جب چاہتا کر در کر دیتا تھا۔ جیسے ہی ملک میں مذہبی تضادوں کے نام پر لڑائییں برپاں تھیں انھیں یہ اتحاد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور اس شکست کی گورج میں لوگ پہلی علاقوں اور شہروں کی لذت کو بھی بھولی گئے، یہاں تک کہ چارہائی وطنی زندگی بھلی اور کڑواہٹ کا تمام من گھٹی۔ مدحیت کر اس تمام میں لیڈروں کا غیر ضروری جوش سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

دلیسی زبانوں کا ادب اور قومی تحریک

اس کے باوجود کہ قومی تحریک میں مثبت اور صحت مند عناصر کی کمی تھی لیکن اُس نے ایک نیم مذہبی سیاسی مارشل ضرور پیدا کر دیا۔ جس سے کم و بیش دلیسی زبانوں کا ادب۔ شاعر ہوا۔ چند سی، بنگالی، گجراتی اور اڑبھی وغیرہ کے سائنسدان قومی کی بنیادوں پر سیاسی حقیقتات جو میں کوشش اور افسانہ نگار اور دیب بھی پیدا ہوئے جو آوازہ انقلاب کے ساتھ جھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان سب کے ادب کا غیر صدیقی پرانی تہمتی سے گوندھا لیکھ اور ان کی تخلیقات سے اثراتی اور بھتی ہوئی ذہنیت بھانکتی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح آندھرا زبان میں جو قومی ادب پیدا ہوا، اس کے عناصر ترکیبی میں بھی افسانہ کی روایات اور مذہبیت درجی ہوئی تھی

اور یہ عقائدات، مٹی اور تانہ دم قومیت کے مطابق نہیں تھے اکثر اوجوں اور شاعروں کا آغاز قوم پرستی سے تھا اور انعام میں اسلام ازم پر! ادب کی اس دورنگی سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ہر جہت میں وہ چارے پتے رہے اور ان دھاروں کو ایک کرنے کی کوئی نیا یا نوکثر ذہنی تحریک کی بیج نہیں ملتی۔ موبائی زبانوں کے ادب میں تخلیق اختلاں موجود تھا۔ جسے کم از کم شاعرانہ ہمارے عواموں اور شاعروں نے ٹھٹھنے کی کوئی حد و چہرہ نہیں کی اور نہ کوئی خاص توانت ہی پیدا کر سکے جو چارہائی کی کلنگت کا موقع بن جاتی۔ بلکہ اس کے خلاف ہندی آرو و کی کشمکش کی ایک طویل داستان بنتی ہے جس پر قومی تحریک کے سربراہ احمدہ افراد کے دستخط ملے۔ یہاں حالانکہ پولیل داستان چند اور مسلمان کے درمیان تہذیبی اور لسانی خلیج حائل کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج میں برطانوی حکمت عملی نے تعین کی تھی، دو لڑائیوں کو اس حکمت عملی کے پیچھے چھپی ہوئی اس سازش کو آشکارا کرنا چاہئے تھا لیکن دو لڑائیوں کے ماننے والے اس سازش کا شکار ہو گئے اور بالآخر ادب دیا سمت کی دوری نے زبان کے مسئلہ کو خطرناک صورت دے دی۔ رہبر سیاسی حلقہ سے اس سلسلہ میں جتنے قدم اٹھائے گئے وہ متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کی تکذیب اور فرقہ پرستی کی تصدیق کرتے ہیں۔

قومی تحریک کے اندھا لڑنے کے ادب کو اپنے دائرہ عمل سے بالکل خارج رکھا اور اس کی افادیت سے فائدہ اٹھانے سے حیرت انگیز طور پر احتراز کیا۔ اگر ادب کی بہت سی طرح بر آمانان کی شان کے سناٹی تھا تو وہ خود ہی کوئی ایسا ادارہ قائم کر سکتے تھے جس کے ذریعہ عوام میں صحت مدہ سیاسی شعور پیدا کیا جاسکتا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

عوامی انقلاب کی بنیاد

ادب سے قومی تحریک کے بانیوں کی روگرا لائی کوئی سمجھوتی فرگنداشت نہیں ہے۔ یہ فرگنداشت ہمارے وطن کی بہت سی خواہوں کی دستہ دار ہے۔ لیکن کا مستقبل یوں ہی نہیں بن جاتا، قومیں جنھیں سیاسی دائرے سے نہیں بنا کر تیں۔ قوم خیر کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب کوئی ناگہانی غلط نہیں ہے۔ انقلاب کے لئے دنیا کے ہر ملک میں برسوں ادب کے ذریعہ وجود و جد کی گئی ہے۔ انقلاب فرانس کی لڑائیوں کا نہیں تھا اور نہ انقلاب روس کوئی دینی سانحہ تھا۔ اس کے لئے عوامی انصاف کو بہت پیچھے

تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء سے قبل اشتراکیت کے موعود پر کروڑوں مکتا میں عوام میں پھیل چکی تھیں، اشتراکیت کے متعلق روٹی عوام میں جیسے بڑا اعتقاد پیدا ہوا وہ اعتقاد سینکڑوں ادیبوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بدنامی انقلاب کا نام بھی ہو سکتا تھا۔ ۹۱

جس عہد میں ہمدی قومی تحریک نے بال و پر لگالے انقلاب مدنی اسی عہد کا ذخیرہ لیکن تاریخ کے اس عظیم انقلاب سے ہمارے رہنماؤں کے کچھ نہیں کیا کسی ایسی اجتماعی ادبی تحریک کا تصور ان کے ذہنوں میں نہ آ سکا جو اس بات کی ذمہ دار قرار پاتی کہ وہ عوام کے ذہن کو ایک واضح مقصد کے سانچے میں ڈھال دے گی۔ ۹۱

میرے خیال میں عوامی انقلاب کی کامیابی ابتداء اسلام نے کی، دنیا اس سے پہلے عوامی رجحان کی تربیت اور ترقی کی قائل نہ تھی اس کامیابی ابتداء کی اساس ادب اور فصاحت و بلاغت کا نام پر رکھی گئی۔ سب سے پہلا انقلاب قرآن کریم کی فصاحت اور بلند ترین ادبیت کے ذریعہ برسر کار لایا گیا اور دنیا کے اس انوکھے ادبی ذخیرے نے عرب کی زندگی کے طوابع پر تیزی کی کاپی پلٹ دی یہ عین قانونِ فطرت تھا، انسانوں کے مشغوب زندگی میں انقلاب اور کامیابی انقلاب کے لئے ادبی و شعری ہو گئی اور جھگڑوں کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے، قرآن نے فصاحت عرب کو خاموش کر دیا، کہانیت کے سحر سانس نہ ختم ہو سکے، شراہ کی عریان نگاہی دفن کر دی گئی، قیدہ خواہوں کے قلوب اور مخلوق پرستی کو سدوم کر دیا گیا۔ نئے ادب، نئے انداز زبان نئے حسن فصاحت اور جمال بلاغت کی آغوش میں انقلاب پسند اجتماع کو پروان چڑھا یا گیا۔ قدرت کے اسی قانون کے ماتحت ہندوستان کے ادب کی روح انقلاب پیدا ہوئی اور اس کی کوپڑا مگر نے کی ایک کوشش کی گئی جو ہندوستان کی سیاسی انقلابی تحریک میں نمایاں گئی یعنی یہاں کے متوقع انقلاب کی بنیاد ادب اور لٹریچر پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ غلامی اور محکوم کی مجبور یوں اور سختیوں پر!

اردو ہندی کے شاعر نے ماحول کی خود بدیداد اور میں جن کی شاعری نے تحریک آزادی کو کافی قوت بخشی لیکن سیاسی اداوں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں رہا قومی سیاست

کے خداؤں نے ہندوکان ادب سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ ادب سے کوئی محکم سیاسی و ملکی افادیت پیدا ہوئی تو کیوں کر ہوتی۔ ۹۱

انجمن ترقی پسند مصنفین

۱۹۳۱ء میں نوجوانوں کے چھوٹے سے گروپ نے ایک انجمن بنائی اور اس کے مینفیسٹو میں ادب کے نئے مقاصد کی تعین و تشریح کی میرے خیال میں ادیبوں، رشتہ داروں کا یہ نیا تصور نا نوجوان ہندوچہ ۱۹۳۵ء کی لغویوں نے پیدا کیا جس سے ہندوستانی عوام کی توخات کے بالکل خلاف وہ سیاسی آئین ہندوستان کو دیا جو ہمارے مشترک ادب اور ہمارے لئے تجلے کچھ کے لئے نہ ہر بل بل بن گیا۔ یہیں سے اردو ہندی ادب میں سیاست و ادب کا ایک شفاف آمیزہ ترکیب پانے لگا جس نے ادب کی نئی قدموں کی داغ بیل ڈال دی اور عوام کے ذوق و معیار کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے صاف صاف اپنے ۲۱ مینفیسٹو میں اعلان کیا:۔ "ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، رنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پیدا نہ ہو، ماضی پرستی کی خیالات کی دوا نہ تمام کی جائے" اور اس طرح جماعت و فرقہ پرستی کے خلاف قومی اتحاد سے ہٹ کر ایک نیا مورچہ قائم ہوا۔

چند ہی برسوں میں یہ تحریک نوجوانوں میں مقبول ہو گیا۔ انجمن نے نئے کھٹے اور بڑھنے والے پیدا کئے، ادب میں نئے مومنوعات کا اعانہ ہوا۔ ادب کی شکلیں بدلی اور نئے تصور کو پروان چڑھانے کے لئے انجمن کو بہت کچھ بنیادی مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ پرائے سماجی تقورات برہمنی تحریک ایک مرتبہ تھی اس لئے اسے معنی لغت کے طوفانوں سے بھی ٹلنا پڑا، چند ہی برسوں میں یہ سب کچھ ہوا لیکن وسیع پیمانے پر عوام کو متاثر کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے یہ تحریک تو ہی جدوجہد کے اس موڑ پر میرض وجود میں آئی۔ جب ملک ذہنی طور پر رد حقوں میں مبتلا تھا اور عوام فرقہ پرستی کے غلط راستے پر

پڑ چکے تھے۔ اور اس صورت حال کا موقع عمل مثبت نہیں
منفی ہوتا تھا۔

سیاست اپنے نٹ نٹے تجربوں اور دائرہ
میں معروف تھی، ادب کے بے نواؤں کی بات سننے والا کوئی نہ
تھا۔ میر درست ہے کہ بعض رہنماؤں نے انفرادی طور پر
انجمن سے کبھی کا اظہار کیا اور اس کی افادیت کو بھی تسلیم
کیا اس کے باوجود کسی کی مجلس میں یہ نہ آیا کہ انجمن انقلاب،
سیاسی انقلاب کی بنیاد ہے۔ اس لئے اس تحریک کی
ثبت بناوی صاف مثبت نتائج پیدا کرے گی اور اس کے
ذریعہ رجعت و فرار پرستی کو ختم کیا جاسکے گا۔

کچھ ہی برسوں میں نئے نظریوں، ادبی سیاسی روش
حال نے انجمن اند قومی تحریک کے درمیان بھی خط فاصل
کھینچ دیا۔ اور اس طرح قومی لیڈر رشپ نے ادب کو انماز
کے اس نونے کو بھی کھو دیا۔

یہاں تک کہ دو مقابل قوتوں لیگ اور کانگریس
کی سیاسی دفتاروں نے ایک نئے المیہ کا آغاز کیا۔ میرے
لئے یہ فزوری نہیں ہے کہ میں بارہ برس کی المیہ کی سیاسی
تاریخ دوڑاؤں نہ میرا یہ مقصود ہے کہ میں اگلے پچھلے کتابوں
کا شمار کروں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کا درد ناک
انجام کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہے۔ اس انجام کی نشوونما
ہمارے فحش غلطیوں اور سیاست کی بنیادی خامیوں
کا گورہیں ہوئی ہے۔ یہ انجام ہندو مسلمان اور سکھ ہر فرقہ
کی نا عاقبت اندیش لیڈر مشب اور برطانوی سامراج
کی سفاکانہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔

تقسیم سے برسوں پہلے دہنوں میں دو حکومتوں کا انعقاد
گھر کر چکا تھا۔ ہندو کے ذہن میں ہندو راج کا اور مسلمانوں
کے ذہن میں حکومت الہیہ کا، یہ عقود اس غلط تربیت کا نتیجہ
تھا جو دونوں فرقوں کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ اس تربیت
کی بنیاد کوئی بدینہ نہیں تھی۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاسی
ذہن کا عدم بلوغ اس کا اصل سبب تھا۔ عوام تو عوام بننا
کے ذہن پرانی دوائیوں سے آزاد نہیں تھے۔ ان کے ذہن
میں بھی قومیت کا تصور صاف نہیں تھا اگر صاف ہوتا تو
تاریخ کی دہری ہی شکل ہوتی۔

یہاں میں ہندو مسلم کے لیڈر رشپ کے متعلق احترام
اور بے باک گفتاری کے ساتھ دو لفظ کہہ دینا چاہتا ہوں
کہ انھوں نے مصلح اعظم کا لباس تو پہن لیا لیکن اصلاح اور
تربیت عام کے سلسلے میں وہ اپنے یقین اور اعتقاد پر اٹل
رہنے کے بجائے عوامی جذبات کی ندیوں میں بہتے چلے گئے۔ انھوں
نے مضبوط اور سداور و زمینیں بنانے کا کبھی حزم نہیں کیا وہ
صرف دوڑاؤں اور دالوں کے حصول کے لئے عوام کے ناشوری جذبات
کو مطمئن کرنے میں لگے رہے۔ ہیں دہناؤں کی اس کہکشاں میں ایک
ہی سبب سے زیادہ روشن ستارہ ملتا تھا اور اس طرح ملتا تھا جس کی
استقامت بالآخر اور مراد بالعدالت نے اس سے آخری اور
سب سے زیادہ قیمتی قربانی تولی لی مگر اس کو عوامی رویہ نہیں
بہنے دیا۔ اس نے اپنی اور دوسروں کی ششاعوں کو غلط سمتوں پر
پڑنے سے ممکن طور پر روکا لیکن تاریکی بڑھتی ہی چلی گئی۔

اگر تحریک آزادی میں مختلف سیاسی رجحان رکھنے والے
قائدین کا ردِ حریتانہ ہوتا اور تمام انقلابی طبقے اپنی متحدہ
قوت سامراج سے مقابلے کے لئے استعمال کرنے تو اگر مگر نرکی
حکمت گئی نام نہانی جاسکی تھی۔ یہ غلامی اور سیاسی ذہن کی
ناجستکی تھی کہ انہوں ہی نے مکر اور گدے میدان تیار کیا اور عوام
کے ذہن ان کے حلقوں میں محدود کر دیئے گئے وہ اپنے دام سے
آزاد ہو کر رہنا کو نہ دیکھ سکے جو کہیں گاہ میں بیٹھا ہوا ایک دوسرے
کے خلاف تیر چلنے کے لئے اکٹرا رہا تھا۔

سیاست میں عوام کا رول

یہ سادہ لوحی کچھ ہندوستانی عوام ہی میں نہیں، ہر ملک کے عوام کا رول
سیاست میں ایک ہی رہا ہے۔ یعنی آئندہ بند کر کے دعووں
کے چکر میں آجانا جو بلند آواز سے تریاق کے نام پر ہر فرد وخت
کرے آئے سچا گھنا، جو اسقوں کو زیادہ پرچہ بنائے اسے اپنا
رہبر خیال کرنا، جو ان کے جذبات کے خرم میں چنگاریاں جھپا دے
آسی کو اپنا قدرت سمجھنا۔ اور خود اپنی قوت کا احساس بھی نہ کرنا۔
عوام سمجھتے ہیں۔ خریف ہیں۔ سادہ لوح ہیں، وہ اپنے دکھ
کی دوا چاہتے ہیں اندر جی ان کے دکھ کو درد کرنے کا وعدہ
کرے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیتے ہیں۔ ہندو مسلم عوام
دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس سے بڑھ کر سادہ لوحی

اد کیا ہو سکتی ہے کہ سی۔ پی کے ہندوئی مسلمان اس خیال میں
ممن رہے کہ تقسیم کے بعد ان کی کچھ انفرادیت باقی رہے گی۔؟

تقسیم اور اس کا رد عمل

اور جب یہ طوفان آ کر اتر گیا تو بجائے آنکھیں کھلنے کے
ہمیں اندک نظر آنے لگا۔ کسی خزانہ کی حد بندیوں نے ہمارے
آنکھوں پر نئے پردے ڈال دیے اور یہ غیر قدرتی نہ تھا۔ تقسیم
نے ایشیائی سیاست میں ہندو کو نقصان پہنچایا، تقسیم نے
انسانیت کو تقسیم کر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تقسیم ہمارے سرخرو پی
مٹی یا ہم نے اسے رخصتا مندی سے اختیار کیا۔؟

یہ تقسیمات میں نہیں جانا چاہتا لیکن تقسیم کو اس تربیت
کا منطقی نتیجہ جی جی رہتے ہیں مذہب کا سہارا لے کر عوام کو دیتی
مٹی اور پھر جب ایک ایسا موجد آ گیا جہاں پہنچ کر کوئی راہ باقی نہیں
رہ گئی تو ہمارے رہنماؤں نے رخصتا مندی سے اسے منظور
کر لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام الگ الگ خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے
خوابوں کی تعبیر ان تصورات کی روشنی میں چاہتے تھے۔ جن کا انہیں
تعلیم دی گئی تھی۔ مقاصد کے اختلاف نے ان کے خوابوں میں خوفناک
تفاہد پیدا کر دیا تھا اس لئے اگر ان پر تقسیم کا رد عمل ہوا تو غیر متوقع
اور غلط نہیں تھا، ہندو عوام ایک متحدہ ملک کا پسند دیکھتے تھے
تھے، اور مسلم عوام ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے
جس میں پورا بنگال اور پنجاب سما یا پڑا ہو اور جس کا خون ہند
کے مسلم خلیفے محبوبوں کی شریاؤں میں بھی پوری ناز کی وروانی
سے دوڑ رہا ہو۔ ان غریبوں کا کیا تصور تھا؟ ان سے وعدہ ہی
کیا گیا تھا کہ علیحدگی کے معنی تمام ہندوستان کی جدا گانہ
وعدہ انسانیت کے قیام کے ہیں۔؟

لیکن عوام سے قطع نظر نہ رہناؤں نے تقسیم کو جو منشی
منظر رکھا وہ بھی اس کے رد عمل سے اپنے ذہن کو محفوظ نہ
رکھ سکے۔ اتنے خوف ناک طوفان کے بوجھ میں انسان اور
انسانیت جس وفا خاشاک کے مانند بہہ گئی۔ دو لاکھ لاکھ
حقائق کو تسلیم کر لینا چاہئے تھا۔ اپنے غلط اقدامات اور غلطیوں
پر کوئی نظر ڈالنا چاہئے تھی لیکن تقسیم کے بعد بھی خند تیر نہیں
بھری گئیں، سو رہے نہیں توڑے گئے۔ بلکہ اس قسم کا طرز عمل
اختیار کیا گیا کہ گویا جنگ کا یہ اولین مرحلہ ہے؟ طوفان

کے بعد بھی نئے نئے طوفان آتے رہے اور طوفان ہماری رہی
سہی نتائج انسانیت کو بہا لے جاتا رہا۔

مسلم عوام اور ان کی بے بسی

اندان طوفانوں میں ہندوئی مسلم عوام کی بے بسی، مایوسی
اور ذہنی انتشار کی کوئی حد نہیں رہی ان کے لئے کسی نئی منطقی
پیدا ہو گئیں۔ انہیں راہ بنانے والا تو درگنا کوئی بٹکانے والا
بھی موجود نہیں رہا۔ انہیں اپنے گناہ سادہ لوحی کی بہت بڑھ چیت
لو کر کرنی پڑی۔ یہاں وہ کہ بھی اندیشاں سے ہٹ کر بھی، یہاں
رہ کر وہ بہت دلوں میں فاسد جذبات سے آزاد نہ ہو سکے
جنہیں وہ بڑی کسی دلیل اور منطق کے دلوں میں باقی رکھ چکے
تھے۔ اسی تہائی خانہ خرابی اور بربادی کے اسباب وہ اب
بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ تقسیم کے نتائج کو وہ ہم وطنوں کے جبر و ظلم
سے تعبیر کرتے رہے۔ لیکن اس حال کے حلقے زیادہ تر مبنیوطہ
رہ سکے۔ حالات انداس کے بند بچی اور تھانے ان حلقوں کو
جلد ہی بھگلا دیا، وہ آزاد ہوئے اور اس بوجھ سے کدوش
ہو گئے، جن کے احساس کی کڑواہٹ سے دے رہا تھا خارجی اندویش
احساسات و ذرائع انسان کو کبھی آزاد نہیں چھوڑتے۔ جیسے ہی ہمیں
اس بار سے سبکدوشی حاصل ہوئی، ایک نئی کیفیت نے انہیں آگرا
وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرنے لگے۔ ان غریبوں
نے کہیں اپنے ذمہ سے نہیں سوجا تھا اور ماضی کی گراہیوں نے
اس تعلق کو ان کی نگاہوں سے مطلق پوشیدہ رکھا تھا جو ان
اپنی مادر وطن سے ہونا چاہئے تھا۔

یہاں سے ہٹ کر مسلم عوام ان تمام روحانی امور کو
کے رشتے سے کٹ گئے۔ جو صدیوں کے رہن بہن اور
کچھ لاکھ لاکھ کا نتیجہ تھیں۔ گناہ سادہ لوحی کی یہ قیمت
کوئی سمجھتی قیمت نہیں تھی۔ روحانی آسودگی، خارجی ماحول
اور داخلی مزاج کے مسلسل تقاضوں کو ہم پہنچا کر نتیجہ
ہوتا ہے اسے کوئی حادثاتی تحت یا ہنگامی نفرت پیدا نہیں
کر سکتی۔ چنانچہ دونوں طرف تقسیم کے بعد کے احساسات
اس کی کھلی ہوئی تصدیق تھیں۔ نہ جانے والوں کو جیسے ملا
نہ یہاں آنے والوں کو۔

ہندو مسلمانوں کی نئی اجتماعی حیثیت

اگرچہ یہاں وہ گئے بالآخر ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ماں اور ایک خون نے انھیں جنم دیا ہے اور ہندو کی خاک ہی سے ان کا ازلی وابدی رشتہ ہے۔ ملک تقسیم ہو سکتا ہے مگر روجوں کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے کٹ جائیں گے، وہ ان سے اور قریب ہو جائیں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ترقی کرنے کے بعد ان کی نئی اجتماعی حیثیت ہوگی اور وہ اس عظیم الشان قوم کا ایک صالح اور مذی قوت حصہ ہوں گے جو ہر کردار اور رشتہ پر مشتمل ہے۔

اس نئی اجتماعی حیثیت و قوت کا اندازہ کرنا ہندو مسلمانوں کا پہلا کام ہے، بعد ازاں قیاس و تعورات میں اگر کچھ اور وقت برابری کیا گیا تو یہی سہی قوت بھی ضائع ہو جائیگی۔ حالات کے جبر سے تبدیل ہونا یا تبدیل کرنا سب سے بڑی اخلاقی لپٹی ہے، مسلمان جن بلند اصولوں کے ماننے والے ہیں۔ ان اصولوں کی توہین ہے۔ اگر وہ اپنے سینوں میں تھامیں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ایک نئے تزکیہ نفس کی ضرورت نہیں رہا رہی ہے۔ یہ تزکیہ نفس ان کے سر جھائے ہوئے یقین کو از سر نو خدایاب کر دے سکتا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ہر جنجال سے آزاد ہو جائیں اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

اکثریت کی غلامی

تقریباً وہ عمل گوشتوں اور حماقتوں کا ایک سیلاب بھی اپنے ساتھ لایا، ان متعدد بد مذاقیوں میں سے ایک بد مذاقی ہندو مسلمانوں کا یہ احساس بھی ہے کہ وہ اکثریت کے غلام ہو گئے۔ یہ احساس ماضی کے احساس کمتری کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ نیا نہیں پرانا زخم ہے اور اس وقت تک نہیں بھر سکتا جب تک، ان میں روحانی تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس پر یمن سے محبت اور خود اعتمادی کامروہ نہ رکھا جائے۔ یہ ہر ہم کسی طبیب کے پاس نہیں ہے، کس رہنما کے پاس

نہیں ہے۔ یہ ہندو مسلمان شعور اور ادرا دیوں کے پاس ہے جنہوں نے ہزاروں گونج پڑتے ہوئے اعصاب کو تازہ و ترقی بخشی ہے اور آج بھی انہیں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کے افراد تعصب سے پاک ہیں، جس میں ہندو، مسلمان، اور سکھ ایک آواز ہو کر ان فیث کی صدا لگاتے ہیں اور سبوس عوام کی کوئی ہوتی ہمت بندھا رہے ہیں، مسلم عوام کے اس زخم کو سیر لوگ بھی بھر سکیں گے جو کمانوں کے دلوں میں احساس کمتری نے ڈال دیا ہے۔ ملک ایک خطرناک طوفان کو عبور کرنے کے بعد جس دور میں داخل ہوا وہ بھی آندھیلوں کی آماجگاہ تھا۔ نفا یہاں بھی صاف نہ تھی یہ دور بھی تقسیم کے رد عمل کا فتنہ شق تھا۔ جس کی پوری توجہ پیش کرنا اپنے رشتے ہوئے ناموسوں سے خود پروردہ ٹھانہ ہے میں اس المناک تشریح کے لئے تیار نہیں لیکن تقسیم کے ادکاروں کی عمرانی بہر حال ان لوگوں کے لئے درس عبرت بنی رہے گی۔

اس بار کا تو کہنا ہی کیا۔ اس بار والوں نے تو شرتوں کو خود کوڑا پٹھا اور اتحاد کی ہر شکل کے خلاف لڑے تھے لیکن اس بار کی بد مذاقیوں کو نہ جانے کتنی آندھیاں ہمارے بلندیاں کو زمین بوس کر گئیں۔ وفاداری کے مطالبات زبان و تمدن کے رجعت پسندانہ افکارات جدا گانہ و حدانیت کے طعنہ اندیشی کا تعادوم کے میدان کرنے کے لئے خاموش ہو کر اور ایسے کتنے آوازے بلند ہوئے جن کی گونج آج تک باقی ہے۔

وفاداری کی روح

اصل میں یہ نفرت و فتنہ کا آخری قطب بھی جو تقسیم کے کھاتوں سے برآمد کی۔ یہ آوازے لگانے والے اگر مشنریوں سے غور کرتے تو آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ ہند کی مذہبی اصطلاحاتی نیز رنگوں کے باوجود ایک قوم ایسی طبعا موجود ہے۔ جس کے اندر تاریخی اور وطنی نیز رنگی ہے جسے بغیر مسلمان وفادار شہری ہو سکتا ہے اور نہ ہندو اور نہ کوئی دین و دھرم والا۔ انہی مختلف اجزاؤں کی ترتیب و تنظیم پر ایک محنت مند ذہنیت دیکھنے والی متحدہ قومیت کا انحصار تھا جو وطن عزیز کی صحیح اصلاح اور درجہ ہو سکتی تھی لیکن وفاداری کی یہ روح کوئی بے جبر پیدا ہونے والی کیفیت نہیں۔ وفاداری

اس گدا تر طبی کا نام ہے جسے غلو میں صداقت کا جذبہ انسانی مداح میں پرورش کر لیا ہے۔ غلو میں صداقت کی کیفیت مساویوں کی بے ساختہ محبت اور حکومت کے حسن سلوک سے پیدا ہوئی ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ وطن سے محبت محض ایک داخلی اور روایتی کیفیت ہے وہ لوگ ان کے اس انصافی زادہ...! واقف ہیں کہ کوئی داخلی کیفیت خارج کے اثرات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایک چھوٹی سی مثال غالباً اس کو واضح کر دے گی۔

(۱) فرض کیجئے اگر کسی ملک میں زید کی دس نیلیں پیدا ہوئیں اور رفت و ماحول کی ہزار ہا سانگائیل کے بعد ان کی داخلی کیفیت (حب الوطن) کبھی عصری حالات سے متاثر نہ ہوگی تو اس نتیجے کی ذمہ داری نسلوں کی تدریجی ہستی اور ہم شعور کی تھی لیکن کیا رہو ہیں نسل کے لئے لازمی نہیں کہ وہ یا شعور اپنے ساتھ نہ لائے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ جس ملک میں وہ رہتی ہے جس مومنانہ میں وہ سانس لیتی ہے اور اس کے افراد جس ملک کے شہری ہیں اس ملک کے دوسرے بسنے والوں کی حقیقی محبت بھی آپ نہیں حاصل ہے یا نہیں؟ اور ان کا وہ بیگانہ دشمن تشخص جس کے گل بلی پر وہ زندہ تھی وہ بھی محفوظ ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ روحانی رشتہ جو ان کے اور وطن کے درمیان واقفیت کی بنیاد پر ہے ٹوٹ جائے گا اور اس کے بعد وہ گریہ و فریاد کے لئے مجبور ہوگی۔ جیسا کہ ہوا۔

ہندی مسلمان اور کلیچرل وحدت کا مسئلہ

تفصیل کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو پوزیشن ہو جاتی ہے اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، تعریف کا سیلاب، جدا گانہ انتخاب، جدا گانہ حقوق اور دو قومی نظریہ آگے ہر تعلق کو بھا لے گیا۔ اور اب ان کی واضح پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کا ایک موثر اور ذی قدر وجود ہیں۔ فرقہ پرستی اور نہ ہی بنیاد پر اب یہاں کسی کو تیسرے قومی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو اس اجتماع میں شریک ہیں اور جو یہاں رہتے ہیں، ان کا ایک ہی مقصود ہے اور ایک ہی منزل ان حضرات کو چاہئے ہوئے بھی ایک شور و قیامت بپا ہو گا۔

”مسلمانوں کو چاہئے وہ خود کو لاگ نہ دکھائیں اور کلیچرل ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں۔“

ادھر یہ مطالبہ، ادھر صرف ایک جذبہ فرائد!۔ دین ایک خوف زدہ رسیدگا...! کلیچر اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل قومی تعمیر کی ابتدائی منزلوں میں بڑی قیمت رکھتے ہیں۔ حالانکہ جبراً اور بے رغبتی سے لال سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ان پر غور کرنے اور نتائج کاٹنے کے لئے سکون فکر اور خلعت جہد جہد کی ضرورت ہو کر پڑتی ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اضطراری حالات میں جھپٹا لیا۔ اس کیوں ہوا؟! مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ واضح بھی جو تمام عمر متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے رہے تھے وہ قومی نظریہ میں اپنے خواب کی تیسرے ڈھونڈنے لگے یہ ہم میں سے بعض کے لاشعور سے تقاضے تھے جنہیں تعظیم کے ذمہ داری نے نامحدود کی طرح آج بھار دیا۔

آئیے دلائل اس مسئلہ پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ لوگ کس قدر واقفیت پرست ہیں اور کس قدر جذباتی؟!

کلیچر کی تعریف

سیاست کی بازی گزرنے پر تعریف دینے کی کلیچر جیسے ہی لفظ لفظ کو بہم دمزد دے کر دیا ہے۔ جس جہز کلیچر کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

جرسی اور انگریزی زبان میں لفظ کلیچر کے معنی ”تربیت نفس“ کے ہیں اور کلیچر کا کیا دی اشریہ ہے کہ نفس انسانی کو تہذیب دلائل کرے۔ تاکہ انسان کا داخلی و خارجی لشو و نما اس طرح ہو سکے کہ کوئی نہ کسی عنصر غیر متوازن نہ رہ جائے۔ نفس انسانی کے تزکیہ و اصلاح اور خارجی اظہار کے جتنے ذرائع اور نظام ہو سکتے ہیں وہ تمام ذرائع و نظام کلیچر سے وابستہ اور اس کی تعریف میں داخل ہیں۔

اس میں کسی قوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال، رہن ہونے کے طریق رسم و رواج، ماحشی و سیاسی نظام تمام اخلاقی ادارے۔ متنازع تخلیقی تقاضے جنسی رجحانات، جاہلیات نیز موروثی و فوق العادہ روایات (مائی سٹالوجی) اور نسلی امتیاز و عقیدت کے امتزاج سے مرتب ہونے والے زندگی کے اجتماعی طور طریق بھی شامل ہیں۔

ہندو مسلم کلیچر کی وجہ مشترک

لئے گونا گوں رنگ اور خطہ طاق ہیں۔ جن سے تمدن کی

کامل تصویر بنتی ہے۔ ہر تمدن کا ایک محمد ہوتا ہے جسے گروہ تمدن کی تہذیب گردنش کرتی رہتی ہے۔ ایشیائی تمدن کا مرکزی نقطہ جس کے چاروں طرف مشرقی ملک گھومتا رہا ابد اس کی گردش کر رہا ہے وہ ہندی منشیات ہیں جو ”روح“ اور اس کی نیزگیوں کی حامل ہیں گویا ہندو اور مسلمانوں میں سب سے بڑی وجہ مشترک ”روح“ ہے۔ اور یہ وجہ مشترک تقیم کے بعد بھی فنا نہیں ہوئی ہے۔ نہ صرف ہند کے مسلمان بلکہ پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا کلچر بھی ایک ہے۔

ملاحظہ فرمائیے پاکستان کا کلچر از عبدالواحد جادو پتا ”ہم ہیں سے“ و فیصدی چند آبادی کے دلائل ہیں اعلیٰ آقا لی کو تو نے بہر حال ہونے پر غور کیا کیا حقیقت نہیں ہے کہ ہم پاکستانیوں ہی کے آبادیوں اورین کلچر کے جنم دہاتے تھے۔ مگر ادارہ علوم کے راج کے انڈرپیشین اس بار کے معارف۔ گندھار کلکتہ رفرنس کے فنکار تھے اند اگر وہ نہیں تھے تو کسی عرب یا جاپانی ان کے جنم دہاتے؟“

یاد رہے کہ ہمارے کارناموں نے تاریخ عالم میں شہرہ آفاق امتیاز حاصل کیا ہے مگر ہمیں کس طرح ان کے وارث بننے سے انکار کرتے رہے اور وہ ان کے لئے کہ سبب کچھ ہم نے زمانہ قبل اسلام میں حاصل کیا تھا لیکن مصریوں نے اس ہرام سے انکار کیا ہے؟ نہ عربوں نے بعد وفات کی قدیم تہذیب کے قدس سے راز انہوں نے تو اہرن دیندان سے جنگ کو اسلام کا ”شیطان و دھما“ بنالیا ہے۔ اور خود کو نے اسلام کے بعد بھی کبہ کا نام کبہ ہی رہنے دیا اور غیر عرب کو بھی کبہ بھی ترک نہ کیا۔ لیکن یہ علم کونسا ہم ہی نے اپنے آپ کو اسلام کا ”صدقہ“ بنا کر اپنی ہزار ہا سال کے بایہ نام ماضی کی حقیقی ورثہ کو ربا ترک کر دیا ہے۔ اگر اسلام کا کلچر اختیاری ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔ تو یقیناً کلچر مین اسلام کے معنی ہوں گے۔ اسی جہم جہاں پر کامہ خالی ہو۔ اب دنت آگیا ہے کلچر کی تاریخ کے اس صفحہ پر غور کرتے ہیں چھکا راپا میں اندی شکاری ہوئی تاریخ کو

جو دیگر اقوام کے لئے باعث ہزار رشک رہ چکے اور جس کے تخلیق کار نامے آج بھی تاریخ عالم کا سہری باب ہیں پورا پورے سینے سے لگائیں۔

جو قوم اپنے قدیم ماضی کے تسلسل اور اس کے ساتھ اپنے احساس فکر کو کچھ مضمتی ہے وہ قوم اپنے مستقبل کے تفتیق اور اس کے اعتماد کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔

تو گویا کلچر ایک اور بنیادی قدمہ ہوئی کہ قطع نظر اس سے کہ فلاں یا فلاں تاریخی دور کے کارنامے کس مذہب کا کلچر ٹھہ کر سہرا لیا جائے۔ ہر کلچر کی وحدت کے لئے ضروری ہے کہ انے قیام ماضی سے ذہنی تسلسل قائم کرے اور حقائق سے اپنے لئے ورثہ کلچر میں محنت پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کی ارتقائی نوعیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی جداگانہ وحدت

اور اگر مسلمانوں کے کلچر ایک علیحدہ جزوئی شکل بھی ہے اور وہ اس سے روحانی طور پر وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو ایک لادینی جمہوری ریاست میں انہیں اس کی آزادی اسی طرح ملنی چاہئے جس طرح عیسائیوں، سکھوں، اور دوسری ہندوستانی اقلیتوں کو مل سکتی ہے۔ ہر مذہب میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی الگ تہذیبی زندگی ہے یا ہوئی چاہئے۔ اس مسئلہ پر میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کونسا آدرش ہے جس کے سانچے میں ہم ایک تازہ دم قومیت ڈھال سکتے ہیں اور اس کے لئے کس قسم کے قدیم جدید سازمان کی ضرورت ہے۔

”کلچر“ کی بحث اگر ہمیں ایک محدود دور ہی تو درست تھا لیکن بعض ”گنے“ زبان..... کو کلچر کی مینا و قرار دینا۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ اردو زبان کی بنیاد مسلمان خود کو ہندو لگا دھما نیت سے لگے ہیں جسے مسلمانوں کو پہلا کام یہ کرنا چاہیگا کہ وہ اردو سے الفت کرنی چھوڑ دیں۔ (را) آگے چل کر انہیں صاحب نے فرمایا

”اردو زبان ہندو مسلمانوں میں رابطہ و خیال کے تبادل میں ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے چین کی لسانی وحدت کا تذکرہ کیا تھا جس کا مقصود یہ

تھا کہ چین کے مسلمانوں کی زبان چینی ہے۔ اسی طرح ہندی مسلمانوں کی زبان انگریزی ہندی ہو تو غلط نہیں ہے۔ (۳)

آئیے اب ان تینوں باتوں کے ذیل میں اہتمام کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر اجتماعی نقطہ نظر سے یہ غور کریں کہ اس باب میں عام رائے کیا ہے۔ مسلمان کیا جانتے ہیں؟ اور اردو کی سطح پر لیشن کیا ہے۔ ۲۶ برس سے کانگریس کا کیا موقف رہا ہے اور اب ہندی جھوڑی دستور ساز اسمبلی کو اس باب میں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔

(۱) جہاں تک مسلمانوں کی حد اگانہ وحدانیت کا سوال ہے اس کا تصور ہی غلط ہے اور اگر یہ کوئی جہانگاہ وحدانیت ہے تو اس میں صرف مسلمان ہی نہیں، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی اور دوسری قومیں بھی شامل ہیں جو اردو زبان بولتی اور لکھتی ہیں۔ اس میں ہر قوم کے جہانوی اور ملی فزونیہ شریک ہیں اور جہانگاہ مذہبی اور سرخ بھادر سپر مردم بھی اس میں دراجند بھی شامل ہیں اور جہان لال قومی۔ امدادہ تمام ہندو مسلم سکھ پارسی اہود دوسری قوموں کے عوام بھی جو صوبہ جاتی زبانوں کے ساتھ اردو زبان بولتے ہیں۔

(۲) متحدہ قومیت کا تصور محض سیاست نے پیدا نہیں کیا۔ اس کی داغ بیل اسی وقت چڑھی تھی جب مسلمان ہندو میں آئے اور ان کی نئی نسلوں کا خیمہ بھان کی مقدس مٹی سے گن رہے لگا۔ ایرانی اور ہندی نئی قومیت کے سیل نے ایک نئے حسن کو آجا کر کیا۔ ایرانی مصوری اور سستی نے ہندی چیز کا رسی اور سانگیت کے گلے میں باہیں ڈالیں اور ایرانی گل بولے اجنبی کی نقاشی سے جنگلی ہوئے۔ اس میں کاحین و جمیل منظر نال گل ہے۔ یہ تہذیب ہم آہنگی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ آریئل ایرائیو کو جوشن اعلیٰ آریہ وقت اور اس کے پھر سے تھا وہ ایک نئے حسن کی تخلیق کا سبب بنا۔

اور یہ گھلاؤ اور یہ ملاؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ جہاں تک کہ انھوں نے نسلی زبان کی تھلا دی اور ایک نئی زبان کو قبول کر لیا جو نسلی اشتراک و اتحاد کے اشتراعی عمل سے پیدا ہوئی اور دو اس عظیم الشان اجتماع کے قدرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس کے عرصہ میں اپنی فطری جاقیت و قبولیت نے اسے ہندو مسلم عوام کی زبان بنا دیا۔

لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ اردو زبان میں ہندوئی مسکرت کے الفاظ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور یہ تمام ہندوستان میں کسی کی شکل میں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اردو کہئے یا ہندی، ہندوستانی کہئے یا اور کوئی جو بھانام رکھے سمجھے۔ لیکن یہی ایک ایسا رشتہ اکادہ ہے جو سامی قوموں کو ملاتا ہے۔ اور جسے آپ ملک کی قومی زبان بنا سکتے ہیں۔

اردو صرف بولی نہیں ہے۔ جسے نظر انداز کیا جاسکے اردو کی بنیاد پر خود کو مسلمان جدا گانہ وحدانیت کا تصور کرنے کا گناہ بھی نہیں کر سکتے۔ اردو ادب کی قدیم وجہ تالیخ ہندو الفاظ پر داندوں، افسانہ نگاروں، اديشوار کی ذہنی اور مائی کاوش سے خاندان رہی ہے۔ رتن تھہر شرادہ نیم اور چکیت جیسے عظیم الشان شاعر۔

..... اردو نے پیدا کئے اور میں اس وقت جب اس کی کشتی گرداب میں ہے اس کے ناخدا راجھو پتی سہلے غرق آئندہ نرا ن ملے۔ کرشن چندر و شاعر عادل اور بندر ناٹھ راجندر سنگھ سیدی۔ رامانند ساگر اندھن ابدل ہندو سکھ سلمان شراد اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو زبان کا ایک ترقی پسند ادبی

ادب ہے اقبال اور جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر اور ابوالکلام آزاد جیسے حکیم و ادیب اس نے پیدا کئے ہیں۔

اس کی بزم میں سیاہی رنگ کی گناہ اور تہذیبی امتیاز باپ ہے۔ اس کے آسمان پر جوش تارے چمک رہے ہیں ان سے انانیت متور ہے۔ اور ان کے دل انانی وحدت کی جوت سے روشن ہیں۔

اردو سے ترک محبت کا مطالبہ ایک تہذیبی جبر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جسے ہمارا شہر، تجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ان کے زبان و ادب کے ساتھ محبت کرنے سے روکا جائے۔ ان سے کہا جائے کہ وہ سیکور، نذر اللہ اسلام، بنکر چٹری اور شیر خوار اور شاہی جیسے شاعروں اور اديوں کو ایسے دل سے فراموش کر دیں؟

(۷) اردو کو انہی دیوار کوٹھانیں اور نئی طور غلط ہے، ایک گھلا ہوا ظلم ہے، اردو ہندو بان نے فرقہ پرستی کے پناؤ کو کاٹ کر متحدہ قومیت کا ایک گچھا جی سنگم بنایا اور تمام صوبوں کے عوام کو ایک نئی بولی کی لڑیوں میں مٹھ دیا ہے۔ اردو نے مذہب اور فرقہ داری کے دیروزی عبادات کو چاک کرنے میں نمایاں امداد کی ہے اس کی محبت سے دست بردار ہونے کی دستاویز لکھو نا

ہرگز وطن دوستی نہیں۔

لسانی وحدت اور قومیت متحدہ

(۳) چین کی سالی وحدت کی مثال ہندوستان پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے، وہ کئی تہذیبوں اور متحدہ مذاہب کا سرچشمہ ہے۔ جو ایک ساؤ ہزار پروردہ ہر جس سے لاکھوں نئے چھوٹے ہیں۔ وہ ایک لازوال فتنہ ہے جس میں سینکڑوں نے باہم دگر مل کر ایک مخصوص ریشر زیر دہم پیدا کرتے ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اردو ایک ایسی وسیع و مشترک زبان ہے جو ملک کے ہر قریب و بعید حصے میں عوام کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی دلیلیں بولی جاتی ہیں یہی مشترک پنجاب میں اور اسی زبان کا دائرہ آخر مغربی و مشرقی پنجاب سندھ و سرحد، یوپی دہلی اور سی و پی اور بہار و دکن کو گھیرے ہوئے ہے؟

بنگلہ دیش اور اس کے بعض حصے اور دوسرے اثر لے بغیر نہیں ہے۔
بہٹی ایک بین الاقوامی شہر ہے لیکن دہلی اور لکھنؤ کے بعد آج اسے اردو کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔

ان مقامات پر اردو صرف بولی ہی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان مقامات پر اس نے اپنا تخلیقی پرنٹ لگایا ہے ملک کے ان حصوں نے اردو زبان کے بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں۔ اور یہاں سے اردو کے سینکڑوں اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔
بہٹی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عظیم الشان چلشنگ باؤس ہیں جہاں سے بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور جن کے مالک ہندو ہیں۔ اردو کی وسعت اور دلکشی و تاثیر کا نہ ختم ہونے والا مسلمان ہندو اور سکھ ادیب و شاعر ہیں جن کی خوشنویسی اور روحانی کاوشوں نے قومی تعمیر میں سیاست دانوں سے بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ صرف بہٹی شہر کے تجارت کا وسیع علاقہ اردو شعراء اور ادباء کا میدان عمل رہا ہے اور آج بھی ہے۔

اردو کی عظمت کا ذوق

اردو زبان میں بڑا لال اور جذب کرنے کی ایسی قوت ہے کہ ہر صاحبِ ضمیر کو اپنے وجود میں سمیٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں

مچھلے، نفع دہی سنسکرت کے شدید بھی سنسکرت کے لفظ نہیں معلوم ہوتے۔ سامراج، سواج، مدر، اندولن سنسکرتی گورنمنٹی جاگرتی اور دسیوں نے الفاظ آج اردو ہی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ دلکش خصوصیات اور فطری اچلتیں ہیں جن پر رتن نامہ سرشار اور حکمت لونی ہوئے اور شاخِ ہند و شجر اور ادب اور ایک پوری نسل کے نام اس کی خیریت میں نظر آتے ہیں۔ مختصر میں کہ دلائل کی روشنی میں یہ خود کرنا چاہئے کہ آج کل تمام ترقی پسند ہندوؤں نے اردو ہی کو کیوں اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے؟

سیاسی جدوجہد کا متناہ کلچر

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تمام تر سیاسی جدوجہد جس میں اقتصادیں ماحول بھی شامل ہے، کا متناہ کلچر بننے سے بہت تہذیب کا ایک شعبہ ہے جس کی مساعی بھی تمدن کی حفاظت و ترقی پر منتج ہوتی ہیں۔ سیاسی مسائل کو کبھی تمدنی مسائل پر اہمیت نہیں دی جاتی۔

آزادی اور دنیا کے بعض حصوں میں غیر تمدن قابل کو بھی حاصل ہے مگر آزادی ہی تمدن کی آزادی کا حامل نہیں، آزادی کا مقصد کلچر اور کلچل خود مختاری ہے۔ سیاسی جدوجہد کے پُر زور معائب سید اقلی کو طے کرنے کے بعد اب ہم کلچر کی جنت لانے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ تہذیب کی اس نئی جنت کو ہندو جنت اور مسلم جنت بنانے کا لگنا ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارا شاہد اقبال اب تاریخی کے جال سے آزاد ہو رہا ہے۔ اس کی انرجی سنسار پر زور ہے۔ دنیا ہمارے ایک ایک نئی کوئی بڑھ چکے ہیں اور ایشیا کی مایوس و مجبور نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں ہمارے فرض ہے کہ ہم اس آدرش کو پیش نظر رکھیں جو ثقافتی و ادبی اور ترقی پسندی سے مرکب کیا گیا تھا۔ ماضی نے حوائثِ مادیہ پر دیکھے ہیں اسے زمانے کی حاسدانہ نگاہوں سے بھی بچانا ہے اور انسانی تنگ نظریوں سے بھی۔ اور کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ آج کے ہندو مسلمانوں کا کلچر ایک ہے۔ زبان ایک ہے وطن ایک ہے اور وطن کے دفاع کی منزل بھی ایک ہے۔ اگرچہ تاریخ نے مختلف تمدنوں کے دھارے لگا کر ایک دھارہ بنا دیا ہے۔ اس سے

جوشا نہیں کچھ ہوتی ہیں ان کے بہاؤ کے کچھ منفرد رنگ بھی ہیں ان منفرد رنگوں کے بند باندھنا ترقی اور تخلیق کو روکنا ہے۔ نئی کمی قوم کی منفرد و طویل خصوصیات کو بہر ترک کرانے کا ظلم بھی اسل میں جبریتہ تبدیلی ذہب ہی کے خاندان سے ملتی رکھتا ہے۔

صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ان کے ادب کی ترقی
میں تو ہمہ گیر اردو ہی نہیں، صوبہ جاتی زبانوں کی بقا اور ترقی کا بھی خائل ہوں۔ ہمارے ملک کی جتنی تہذیبی خصوصیات ہیں ان کے پٹنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تیلگو، ملیالم، کٹیڑی وغیرہ اپنی مستقل شاعری و ادب رکھتی ہیں۔ اور انہیں نہیں مٹایا جاسکتا تو اردو زبان سنسکرت پر مبنی ہے اسے کیوں کر مٹایا جاسکتا ہے

ایک نئی تحریک

ڈاکٹر کاٹھوگر نرمندری بنگال نے اپنی ایک تازہ تقریر میں قومی زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے اس عقیدہ کو ظہور کیا ہے کہ قومی زبان سنسکرت ہونی چاہئے۔

”علاقوں کی تمام زبانوں کا سرچشمہ مختلف حد تک اور بعض کا بڑی حد تک سنسکرت ہی ہے میری رائے میں یونیورسٹیوں میں سنسکرت کی تعلیم سے نہ صرف علاقائی زبانوں کو بے حد ترقی اور وسعت حاصل ہوگی بلکہ ایک ایسے ہونے مسئلہ کا ایک منفرد حل بھی اچھی طرح مل جائے گا۔

مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسکولوں اور کالجوں میں سنسکرت کی تعلیم کو وسعت دینے کے لئے کل ہندو ممالک پر سنجیدگی سے کوشش کریں تو مختلف علاقائی زبانوں پر سنسکرت کا اثر اس قدر غالب ہو جائیگا کہ بطور غدی ایک قومی زبان پیدا ہو جائے گی جس پر متفق ہونے ہندو اور خاص کر اردو کی طرف اشارہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب ہر شعبے میں علاقائی زبانوں کے حق میں جذبہ بات بیکر رہے ہیں یہ امید مہموم ہے کہ کسی ایک علاقہ کی زبان کو ہندوستان کی

قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا۔

(خطبہ صدارت بین الاقوامی کانگریس یونیورسٹی، ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء)

تاریخ انہی کی طرف جنت نہیں لگا سکتی

یہ ایک نئی صدا ہے اور دوا حد ہے لیکن اکثریت کے ساتھ پرست حلقوں کے دانشوری تقاضوں کو منور ہمارا ہے۔ یہ ایسی صدا ہے جو ان ترقی پذیر دانشوروں کی بلند فواری سے ملتی ہے جو صدیوں کی جان نشانیوں کا نتیجہ ہیں یہ خیال ہمارے تمام متحدہ نظام اپنے عمل کو صرف مسادہ بنادیتا اور تصورات کو ادراک میں مبہم دیکھ کر، تیار ہے جت سے سمجھتے تھے قلمروں۔ یہ ماضی ترقی کا شاہ تیز ہے جس کی نگاہ ہمارے ترقی پسند حال اور ترقی سے آنے والے مستقبل کے تصور کر کے میں نہیں ہے۔

سنسکرت جو علماء اور دانشوروں کی زبان رہی کبھی راجس ہند میں عوام کی زبان نہ بنی، آج اس کے قومی زبان بننے سے کیا اسکا مات ہو سکتے ہیں؟ علاقائی زبانوں میں اس کے ختمے عام ہیں ان کی ہیئت مختلف ہو سکتی ہے اور تمام علاقائی زبانیں سنسکرت پر مبنی بھی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ کیلئے جو کبھی خالص سنسکرت میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں ان کو ملنا دینا مقصود ہے تو یہ ایک جدا گانہ بات ہے۔

موجودہ ارتقاء دور میں جب سماج اپنے قومی دائرہ کو توڑ کر بین الاقوامی حدود تک وسیع ہو رہا ہے۔ برائی تہذیب کے خول میں گھل چکے ہیں اور ایک نئی عالمگیر تہذیب کے خوبصورت چہرے ڈھل رہے ہیں، ہندوستان کو رجعت کے اختیار کرنے میں نقصان رہے گا۔ اس کی پہلی ضرورت ارتقاء سے ہمہ گوش رہنا ہے۔ ماضی کو ماضی وہ اپنے پایہ رکاب حال پر بھی نفاذ نہیں کر سکتا۔

یہ ارتقاء تقاضوں کے خلاف ہو گا کہ لاہور اسال کی قدیم یاچہ سو برس کی پرانی تہذیبوں کا احیا کر لیا جائے سچ بوجھتے تو یہ انداز فکر ہی غلط ہے اگر ہندوستان و پاکستان کے جالیں کو ڈھندو اور مسلمان متحد ہو کر اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لے لیں تب بھی جو تاریخی بننے والی ہے ماضی کی طرف جنت نہیں لگا سکتی۔

قانون کے نفاذ و اجرا پر نظر ثانی کرنی چاہئے امداد سرپرستی کی بنیادی
اینٹ ہی کو درست کرنا چوگا۔

تعمیر کی بنیادی اینٹ

تعمیر قانون کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ قانون پر عوام کا
مضبوط اعتقاد ہو۔ لہذا یہ اعتقاد قانون کے ڈنکے سے پیدا نہیں
کیا جاسکتا۔ یہ قانون بنانے اور نفاذ کرنے والے پر منحصر ہے
جمہوری اندازوں کے اس احساس سے پیدا ہوگا کہ عوام ان کے لئے
نہیں، وہ عوام کے لئے ہیں، قانون کے لئے عوام نہیں، عوام کیلئے
قانون ہے۔ انہیں عوام میں اس طرح مٹا نہیں ہونا چاہئے کہ وہ
حاکم ہیں، اس طرح نمایاں ہونا چاہئے کہ وہ عوام کی خدمت میں
راحت اور تسکین کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی ذمہ داریوں کے لافول
شیعے ہوں گے اور ہر شے میں قانون کی مخالفت قانون سے نہیں اس
اعتقاد کے ذریعہ کرنی ہوگی جو عوام کے داخلی و خارجی ہر تہ کی نتیجہ
ہو۔ نتیجہ اسی وقت برآمد ہو سکتا ہے جب کسی ملک کے جمہور کی
ادارے اخلاقی نقطہ کے ذریعہ عمل آد کریں۔ اور ان ذخیروں سے
محفوظ ہیں جو انہیں اکثری اقتدار کے دام میں بکرا سکتی ہیں۔

ایک ایک گوشہ میں انہیں بے شعوری اور عقل کے جراثیم بھلاک
کرنے کے لئے علم کا آبجیات کے راجا بنا کر رکھا۔ انسانیت بجا انسانی
دفا دادی، حتیٰ سائنسی، عوام حکومت کے تعلقات، شہریت کے
ذرائع، مذہب، مختلف فرقوں کے باہمی ربط و تعلق، فرد پرستی،
فلسفہ مذہبیت و دینی غلامی، رسوم پرستی، جہل و تاریکی، فطری
تہذیبی اقتدار کا خاتمہ، تحفظ تبدیل اور تقیہ امداد اس قسم کے دوسرے
سائنس کا حل ممکن قانون کی گرہ میں نہیں، اعتقاد کی اشیا میں ہے۔

شہید ہنگامی ضرورتوں سے قطع نظر میرے نزدیک
فرق پرستی اور ایسی ہی خط ناک تحریکوں کو پولس اور فوج کے ذریعہ
دبا کر انہیں کامیابی کا ایک عارضی دسلی طریقہ ہے۔ قانون کے
ذریعہ سیاسی و سماجی باجیاں جوڑے دوسرے نہیں ہو سکتیں جب
ملک ان کے شانے کا کوشش قانون کی حدود سے باہر بھی نکلتا ہے
جب تک فرقہ پرستی کے خلاف عوام کو تعلیم نہ دیا جائے تاہم اور
مذہب کا صحیح فرقہ پرستی کے انہیں فرقہ پرستی کی سمیت سے واقف نہ
کرایا جائے۔ اس کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

قانون گرہ عوام کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال سکتا ہے

لیکن ان کے غلط اور مجرمانہ افعال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قانون
مزا دیتا ہے۔ اصلاح نہیں کرتا۔

سنگرمی تحریک یا اسی قسم کی دوسری تحریکی تحریکات کو موثر
اور پائیدار ادب کے ذریعہ عوام کے ذہنوں سے نکالنا چوگا۔
اسی طرح میری آرزو ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ان کی
حکومت کے درمیان سے قانون کی ذات ہٹ جائے۔ اور اس کی
جگہ اعتقاد دے لے۔

اس حقیقت کو ہم فراموش نہ کرنا چاہئے کہ حاکمانہ غرور اور
ذہنی بندلہ، حکومت اور بے چارگی سے پیدا ہوتا ہے۔ جمہوری ملک
کے عوام نے محکمہ ہوتے ہیں اور نہ بے چارہ۔ یہ حکومت خرد اور قانون
ساز ہو اتے ہیں۔ جب قانون کا خدا و ان پر نہ چلے گا ان کے تو قومی
اور وطنی اعتقاد کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ورنہ برائے اور نئے حاکم
میں کیا امتیاز ہوگا۔ اصل میں یہ تصور ہی غلط ہے کہ پرنالے باغی
بام عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ تصور نہ صرف قاتل ہے اور ان کی
عمر بھر کی قربانیوں کو ختم کر دیتا ہے۔

تاریخ میں باغی کی جاذبیت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے
جب کہ باغی نے حاکم کو برکاتی مسائل سے مستحق بنانا یا بغیانہ نالغیہ
نگاہ باقی رکھا ہے۔ کیونکہ باغی حاکم بننے کے لئے باغی نہیں
ہوتا، وہ تو پورے نظام سے بغاوت کرتا ہے اور جب تک
پورا نظام نہ تبدیل ہو جائے وہ باغی ہی رہتا ہے۔ اور بلاشبہ
جب تک سرسودہ کہنہ نظام کی جگہ نیا اور نیا نظام نہ لے لے
اے باغی ہی رہنا چاہئے۔

اگر اس نے نئی حیثیت سے پیدا شدہ مخالف کی جھونک میں
اپنی باغیانہ جاذبیت کو خیر باد کہہ دیا تو پھر اس کی ذات میں وہ
کیا جائے گا۔ باغی کے چلنے والے تو ان لوگوں کے انہوں میں
پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن باغی کی تحریکی فطرت میں بناؤ کا
جذیبہ پوشیدہ ہے اصل دولت تو وہ تویر کی جذبہ ہے
اقلہ صدیوں کے بعد کسی دھند میں ابھرتا ہے۔

”عوام“ جو ہمیشہ اس کا ٹھکانہ رہے ہیں، جنہیں اس نے
بناوت کے انداز سکھائے ہیں اسے پہچانتے ہیں ان کے
نفسانی عمل اور رد عمل سے آئندہ متنبہ کرنا باغیانہ دانشور
کے خلاف ہے۔ حاکمانہ تیور عوام اور حکام کے درمیان
ایک خط فاصل کھینچ دیتے ہیں اور ان کے مزاج میں خوشن

جے تعلق پیدا کرتے ہیں۔

پھر ایک دوسری حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گذشتہ نصف صدی سے زیادہ انھیں ہندوستانی حکام کے خلاف کھینچ دی گئی ہے۔ اس نیکم کے اثرات سے وہ اپنی آزادانہ ہونے میں۔ یعنی جنی اور جانے پہچانے حکام میں اگر کوئی نمایاں وجہ اختیار کر کے کھائی مذکورہ اور بھی ہاتھ سے نکل جائیگا۔ یہ ایک کنڈر خیال ہے کہ حالانکہ تیر شخصیت کے خال و خند میں نئی دلکشی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نئی دلکشی کو بے رونق عوام کی عقیدت و محبت سے کیا تعلق!؟ غریبوں کے افسوس کی موٹی موٹی لہڑیوں اور حالانکہ تیروں کے مابین کوئی نقش مرابنت نظر نہیں آتا۔!؟

لہذا اگرچہ تو ایک صفحہ انگیز عدم توازن!۔ ان متغلا

خطوط سے کسی آزاد و عظیم انسان قدم کا باجروت اور حسین چہرہ ہرگز نہیں بن سکتا۔

اس چہرہ کو بنانے کیلئے نظری اور کتابی تمام تر فنون کو کام میں لانا ہوگا۔ تمام داخلی و خارجی توانائیاں خرچ کرنی ہوں گی۔ دل کے تازہ و شاداب خون سے اس میں رنگ بھرنے پڑیں گے۔ یعنی اپنی روح اس چہرہ کے خطوط میں علی گری بنی ہوگی۔!؟

معتقد کے چہرہ کی تمام رونق فنا کی سیما ہی میں تبدیل ہوگی۔ تب جا کر اس چہرہ پر نور مسکرائیگا (باقی)

ارتقاء

۳۲

زندگی اس محبوبہ ہزار شیوہ کے مانند ہے جو ہر نفس ایک نئے جمال میں جلوہ گر ہونے روپ میں ظاہر ہو، نئے لباس میں مسکرائے۔

آج دنیا تبدیل ہو رہی ہے، گویا زندگی، گویا وہ محبوبہ ہزار شیوہ ان ہونے حادثوں کے غسل کدے سے نکل کر حال کی لطیف و نازک چادر اور ٹھے تعمیر نو کے گوشہ خالے میں جا رہی ہے۔

یہ لطیف و نازک چادر عبوری دور کا عارضی لباس ہے، جب زندگی تعمیر نو کے گوشہ خالے سے ہنسنور کر نمودار ہوگی یہ حال کی حبابی چادر دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل ہو جائے گی۔

جن خیالات کو کل بناوت و سرکشی کا شاہکار سمجھا جاتا تھا آج رجعت پرستی کا اختراع فائقہ ہیں اور

آج جن تصورات کو زندہ و الحاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ حقیقت و بناوت کے سرچشمے کا محض ملتے ہیں!

آنکھ اس مافوق البشر کو دیکھنا چاہتی ہے جو ارتقاء کی منزل پر مقصود معلوم کر سکے۔ کس کا ہر ہے جو اس کے

بطن میں پوشیدہ معجزات کی ہلک بھی سن سکے!؟

سافر

اَمرِ جُوت

(۱) اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اسی تاریک چادر کی تہوں میں
عدم کے خواب سے تانسج جاگی
اسی تاریک چادر میں تمدن مسکایا کھلکھلایا جگمگایا
یہی تاریک چادر خاور تہذیب کا مشرق بنی آخر سر کر لئے لاکھوں
یہی تاریک چادر اور مہم کہ جو انیت نے روپ دھارن کر لئے لاکھوں
اسی تاریک چادر میں سمٹ کر گم ہوئی ہستی
یہی مشرق یہی مغرب

(۲) اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اندھیرے کی اسی دیوار چیں کو
کبھی سقراط کی حکمت نے ڈھایا
کبھی عیسیٰ کے خون گرم و تازہ نے کیا رنگیں
کبھی گوتم کی موسیقی کے سابلوں نے اسے گھیرا
کبھی ضربِ محمدؐ نے کیا ٹکڑے
حُسنِ ابنِ علی کے خونِ ناحق کے تھپڑوں سے کبھی کانپنی کبھی لرزی
فضائیں ایک چنگاری سی ترپنی
اور اسکے بعد - اس کے بعد

چھائی پھر وہی منحوس تاریکی - وہی منحوس تاریکی
اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
اندھیرے کی جبین آہنی سے
(۳) یہ کیسی جوت پھوٹی مسکراتی جگمگاتی
یہ کس کی مسکراہٹ سے بنی اتنا نیت گلشن
یہ کس نے ہند کی تاریک دُنیا کو کیا روشن
دھمی دُنیا ستاروں سے بنی دُہن

ضمیر زندگی میں کروٹیں لینے لگی اک مستقل دھڑکن
 ورق تاریخ نے تیزی سے اُلٹے
 تغیر لے کے ساز و برگ تعمیر جہاں آیا
 بنی آدم کی دُنیا کو سجانے
 دل سقراط و عیسیٰ جھوم اُٹھے
 جبین بُدھ سے بھلی اک نئی جوت
 اندھیرے ہی سے پھوٹا اک نیا سوت
 اندھیرا اپنی ہستی کھو رہا ہے
 اندھیرا نور میں حل ہو رہا ہے
 (۴) نئے دیک کی جوتی مسکرائی
 جہاں کو کر دیا روشن

۳۴

جہاں کو، مانوتا کو، زندگی کو، قلب و جاں کو کر دیا روشن
 سیہ خانے میں اپنا جال لے آئے نئے خاکے
 نئی دُنیا بنانے کی تمنا کے نئے خاکے
 کہ پھر ظالم اندھیرا جنگجو حاسد اندھیرا
 لئے تاریکیوں کے جال آیا
 نگار امن کے دیک پہ ٹوٹا
 کبھی کرنوں کبھی دیک کو لوٹا
 زمیں سے آسمان تک موجِ خوں ہے
 ابھی تک آدمی صیدِ زبوں ہے
 اندھیرا ہی ازل ہے اور اندھیرا ہی ابد کی جوت ہے شاید
 (۵) اگر سقراط کا دیک ہے روشن
 سراجِ ابنِ مریم گر ابد تک بجھ نہیں سکتا
 کوئی جھوٹا اگر شمعِ شہیدِ کربلا کو چھو نہیں سکتا
 تو اے تاریک دُنیا تو اے مایوس انساں !
 بجھا سکتی نہیں ہے کوئی آندھی
 یوں ہی روشن رہے گی شمعِ گاندھی

ہمالیہ کا پیغام

موسیو پال رچرڈ فرانسیسی عالم و فلسفی مشرق کی روحانی اور اخلاقی قدروں سے کافی متاثر تھے۔۔۔۔۔ ویدانتی کلچر نے انھیں اتنا موہ لیا تھا کہ وہ آرہنڈو گھوش جیسی برگزیدہ ہستی کے ساتھ پانڈیچری میں کافی عرصہ تک رہے۔ اس کے بعد وہ ہمالیہ کے ایک برٹ آلود مقام پر کچھ مدت عزت گزیں بھی رہے جہاں انھوں نے ایشیا اور ہند کے حال و مستقبل پر گہرا سوچ و چاہ کیا۔ ان کے یہ افکار ہمالیہ کا پیغام نام اور ہند کے نام سے فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے۔ جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں مکتابی صورت میں چھپ کر بچہ درجہ مقبول ہوا۔

ذیل میں ان کی کتاب کے اولین اوراق کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے جس کے ترجمہ کرنے والے پنڈت پیارے لال مشرا (مرحوم) وزیر تعلیم یو۔ پی۔ جن کی یاد آج بھی سینکڑوں دلوں میں باقی ہے۔

ویدانتی تصورات کی نفاست و انفعالیات سے متاثر ہونے کے باوجود موسیو پال کا فکر منفی اور فرار پسند نہیں ہے ان کے سوچ میں شاداب روحانیت اور نگرانی کی زندگی و تابندگی پائی جاتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ مقتدر ایشیا ہی آنے والے زمانے میں تمام دنیا کے امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس اتحاد میں ہمارے وطن کو بہت بڑا رول ادا کرنا ہے۔ ایشیا کے مستقبل سے ہندوستان کا مستقبل وابستہ ہے۔

ہر چند کہ ان خیالات کا محور زیادہ واضح نہیں ہے پھر بھی اشباقی و ارتقائی کیفیت موجود ہے۔ اس سے زیادہ ہم روحانی مفکرین سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟

میرے پاس ششراجمی کی یہ یادگار محفوظ تھی جسے میں ناظرین تک پہنچانا ہوں۔

شاغر

وہ ساحت قریب ہے۔ وہ مہر مہر گھڑی جب تو نڈا ہو گی
قریب ہے کہ تیری آرزو بڑے، مگر صوفی بھی نہیں جو لوٹے جا یا تیری آرزو
سے بہت زیادہ، بہت ارفع، زیادہ بین، اور ارفع، زیادہ محکم
وہ کسی سے مغلوب نہ ہونے والی آرزو تھی کہ تو بھی اس کی طاقت سے
مجبور ہو گی
یورپ کی قدیم روح کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظر باقی ہے ان پادلوں کے
سمندر میں ایک شہریت ناخدا ہی ہے۔ اور یہ نور، یہ شہریت محکم ہے جس
طرح یہ نہیں محکم ہوئی ہے۔ یا جیسے اک نڈہ لفظ، اور ایک نڈہ لفظ
والی آواز مستوا۔۔۔۔۔ وہ آواز کچھ کستی ہے وہ آواز
ہند سے خطاب کرتی ہے۔ عبارت ماما اس نڈہ کو سن جو ان بلند لوگوں
تیرے لئے آیا ہے۔ جو ہمالیہ کا پیغام ہے۔ یہ آواز مجھے ہے کہ بتی ہے

یورپ اور اس کے مقبوضات کے ساتھ ساتھ یہ رخصت ہو رہی ہے۔ جب جسم بڑھے تو اس کا کوئی عضو کب تک جگہ نہ کر سکتا ہے کہ اسے کی سطح کا ساتھ نہیں ملے بلکہ یورپ کی سلطنت کا ساتھ کھو جائے۔ لیکن اس کا عقیدہ کرنا ایسا ہے کہ اندرونِ حاصل کر اس سے شکوکہ نہ کرنا چاہئے (دنیا کے لئے) نور اور روشنی دے اور یہ بھی شکوکہ نہ کرنا چاہئے کہ کوئی اخلال و انحطاط سے محفوظ رہے۔

جو گزر گیا اُسے خبر یاد رکھو اور جو آئندہ سامنے آئے اسکی طرف رجوع ہونا وہی سوچ جو ایک جگہ ٹھہرتی ہے تو ایشیا کی جانب اُٹھتی ہے۔ گھر کا یہ ایشیا کو جگہ لے رہی ہے۔ وہی آفتاب جو گزرتے ہوئے دن میں مشرق سے غمزدار مغرب کی طرف دروہ کر رہا تھا لیکن اب وہ یہاں نمودار ہوتا ہے اگر صبح صادق کا نظارہ دیکھنا ہے تو ایشیا کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بیزان زمانہ کی دہری حرکت جس نے یورپ سے اونچی ہوتے وقت ایشیا کو چھلکا یا تھا اب یورپ کو جھکا رہی ہے ایشیا کو بڑھانے یورپ کا زوال، ایشیا کا عروج، مسادات کے یہ دو پہلو ہیں اور انہی کے ذریعہ قوم عالم کی تقدیریں کا عندہ حل ہوگا۔ دروازہ کے دونوں کواڑ کھل رہے ہیں۔ یہ دروازہ ہمسار سے مستقبل کا باب آ رہا ہے۔ ایک دروازہ کیسیں ہے دوسرا روشنی میں۔

”مشرق ایشیا“ (دارلہند) تم اس لئے خود کی عادت چھوڑ دو کہ کوئی قوم اور کوئی انسان تمہارے لئے زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی انسان یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جب تک کہ وہ اپنے اپنی ہمدردی کو نہ دیکھے۔ اقوام یورپ کی طاقت کا ایک سبب یہ تھا کہ زندہ یورپی جذبہ ان سبب عادی انداز میں سب میں جاری تھا۔ اب ان کا قہر اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ اس اقبالی جزیرہ اور اس یورپی جلا وطنی میں قاصر رہیں۔

ایشیا کی قومیں زندہ رہیں گی وہ مضبوط انداز اور ہرگز زندہ رہیں گی لیکن صرف اس وقت جب ان سب میں بھی اقبالی جذبہ اور ایشیا کی حب الوطنی کی روح زندہ ہوگی۔

ایشیا والے یعنی ہندوستان، چین، جاپان، فارس، عرب کے شہری تو تھے اس وقت سب جگہ نظر آتے ہیں لیکن ایشیا کے شہری ایشیا کے مرند کہاں ہیں؟

ایشیا کہاں ہے؟

میں ایشیا والے تو ہر جگہ دیکھتا ہوں لیکن ایشیا کہاں ہیں؟

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو اور جن کی کثرت میں دھرت کا احساس ہو، وہ ایشیا جو جن لوگوں کا ہولہ پانچ ہزاروں کی عبادت گاہ اور سات سلطنتوں کی سرزمین ہے۔ وہی سات سلطنتیں ہیں جو کئی کئیوں کی طرح کلر ایک ہوئے والی ہیں۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جو تمام انکار عایدہ اعلیٰ حالات کا ایک گلدستہ ہے۔ کبھی ایشیا شمالی میں اسلامی

ایشیا مغرب میں، یورپ کی ایشیا حزب میں کنفیوئرسس کی ایشیا مشرق میں، دیروں کی ایشیا اسی جگہ رو دھالی ایشیا سب جگہ

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہو وہ ایشیا جہاں نصف ہی نوع انسان آباد ہیں وہ ایشیا جو اس وقت غلام ہے مگر آئندہ آزاد ہوگی وہ ایشیا جہاں ترقی، اقوام مغرب سے طاقت

کے زندہ ہے ہرگز وہ اس لئے آزاد ہوگی کہ محبت سے ان کے سامنے کھینچے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہے؟ وہ جبروتِ مدح میں اس وقت ایک ہے اور جس کو اس وجہ سے مختصر مانا گئے

کہ اس مدح کا ظہور ہو اور اس ظہور سے دنیا پر نور ہو مگر ایشیا کے اتحاد و دنیا کے اتحاد کا انحصار ہے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہے؟ وہ ایشیا جہے قیامت نے ”دارلہند“ کا خطاب عطا کیا ہے۔

اور ہند، تو ایشیا کا دل ہے جس میں اس کا داغ اور جاپان تیرا مضبوط ہاتھ ہے، ان سب سے علیحدہ تم کس طرح زندہ رہو گے؟

بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی قوم کی تقدیر یورپ کی تقدیر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ تمہاری تقدیر بھی ایشیا کی تقدیر سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ تمہارا سوال صرف تمہارا سوال ہی نہیں ہے وہ ساری ایشیا کا سوال ہے۔

یورپ کے لئے ایشیا ایک تعمیر شدہ ننگا ہے اس غرض سے کہ وہ یورپ کا شکار نہ بنے اسے چاہئے کہ وہ یورپ کے

مٹا لے جس ایک ہو جائے آزاد ہو اور اتحاد ایشیا کا سہارا ہے ایشیا کی نئی تہذیب ہمارا پروگرام ہے اور اقوام ایشیا کی انہیں ہمارا

طریق کار ماہر ہند اس معیار کی وسعت کے لحاظ سے اپنی رديخ کا موازنہ کر۔

اور اب تم ماضی کے معنی سمجھو، صدیوں تک تم مردہ محدث

میں زندہ رہیں، غلامی کی تنگ، قبر میں زندہ رہیں لیکن وہ قبر تھا جسے
نئی زندگی کا گہوارہ تھی، جب کبھی بھی دقت آتا تھا تو میرے پیغام پر
نوردار ہوتے۔ انھوں نے تم سے کہا، قبر سے باہر آؤ، لیکن پچھلے دن
رسوئوں کو جن سے تمھارے اعضا کھڑے ہوئے ہیں چپکے دو، اور اپنے
چکر کو ان کی بجا ست سے پاک کر لو۔

انہوں نے تم سے کہا، میرے مدنی آزادی حاصل کر لو، برونی آزادی
حاصل ہو جائیگی۔ لیکن انکی آواز یا تو صدمہ بھرا ہی یا قید خانوں کے درویش
اس آواز کا گھونٹ دیا گیا۔ تاہم تمھاری روح اس آواز کو سن سکتی تھی

دوسرے پیغام نوردار ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ اپنی
ذبحیوں کو بچانے توڑنے کے عمل کر لو، اور کچھ کہتے ہیں کہ اپنا جوا
سیدھا کرو، اور اگر ذکر کو تو اس کا خاتمہ کر دو، اصلاح ہو نہیں تو
خاتمہ، لیکن تمھاری روح اپنی خاموشی میں ایک اور آواز سن رہی ہے
اور یہ آواز کہتی ہے، جنہوں نے نہیں پہلے جگا یا وہ جھوٹے نہ تھے، کوئی
مرد جب تک کھڑا نہ ہو تو بڑھاپہ نہیں نکل سکتا۔ اس دور جدید کے
لئے جو تمھارے سامنے آ رہا ہے۔ تیار ہاں کر دو۔

جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ زیادہ آزادی کی طرف تمھاری مدد ملے
کریں وہ تمھاری زیادہ مصیبت اور بدنامی کا باعث ہے اور جنھوں نے
تمھیں اس کا سبق پڑھایا انھوں نے بغیر جانے تمھیں بنامت کی طرف
پہنچایا لیکن وہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ بنامت میں تمھاری رونمائی کو نیچے
وہ بھی اپنی باری میں تمھیں ایسی جگہ سے جا رہے ہیں وہ تمھیں لے
جائیں نہیں چاہتے۔ سب ہی تمھیں ایک دوسری منزل کی طرف لے جا رہے
ہیں جو منزل نہیں ہے تمھاری تصویر کی حقیقی منزل ہے۔

وہ منزل تمھاری زندگی کی منزل ہے نئی تحریک منزل ہے نئی زندگی
میں نئی ساخت کی منزل ہے اور اس ساخت کے لئے اگر ضرورت ہوئی تو تمھیں
پہلے کھٹائی میں پڑا ہوا کھانا بھی تمھیں پینا ہو گا۔ غرض تمھارے لئے اختیار کا
زمانہ آئے گا۔ وہ انتشار جس سے نئی اصفانہ آزاد دنیا پیدا ہوئی ہے

تم اپنے مستقبل میں خوشی سے داخل ہو جاؤ اگر نہیں جاؤ تو نہایت
داخل کی جاؤ تم اس میں داخل ہو جاؤ لیکن اس طرح نہیں کہ تمھاری
حسرت بھری نگاہ غلامی کی طرف نظر کر دیتی ہے۔

اس بات پر ناراض نہ ہونا کہ تم کیا تمھیں کوئی ایک
شاندار ماضی سے زیادہ بوجھ اندھ کوئی نہیں ہوتا۔ تم اس
میں پابند نہ ہو جاؤ زمانہ حال کی کوئی چیز بھی آنا خراب نہیں کرتی

جتنا کہ مردہ ماضی کی بچی ہوئی خاک خراب کرتی ہے۔

تم کبھی میری تہذیب دنیا کی تہذیبوں میں سب سے
زیادہ شاندار تھی اس سے کیا حاصل؟ جب کہ وہ اب نہیں ہے اور
جو کئے والی ہے وہ ابھی تک نہیں آئی۔ جو تھا، اور جو ہے، میں فرق
ہے، صرف باقی رہ جانے کا نام زندہ ہونا نہیں ہوتا۔

تم کہتی ہو، میرے شاستر میرے راہ نما ہیں اور میرے وید
میرا بنیاد ہیں۔ راہ نما وید مرا ایک زمانے میں کہے جاتے ہیں اور آتما
کے شاستروں کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔

اپنے ریشوں کو نئے سرے سے کھنکھانے کی اجازت دو۔
اپنے عاروں کو نئے داگ لگانے دو

تم، شیو، کی پرستش کرتی ہو۔ جو طاقت اور حیات تازہ کا
دیوتا ہے جو ان تمام اشیاء کو جن کی تجدید ناممکن ہو مانع کر دیتا
ہے۔ کیا تمھاری خواہش نہیں ہوگی کہ وہ تمھاری تجدید کرے؟
یوہ کا حال تو گزرا رہا ہے اور تم چاہتی ہو کہ تمھارا ماضی باقی رہے
وہی طاقت جو ایک کو نکال رہی ہے دوسرے کو بھی خارج کرتی
ہے۔ اور یہ مضبوط سے مضبوط ٹکھوں سے نکلا جا رہا ہے جسے
کوئی ہی نہیں سکتا۔

مستقبل کا عقیدہ اس کو نہیں لی سکتا جو پیشتر اپنی قربانی نہیں
دیتا۔ جتنی عظیم الشان قربانی ہوگی اتنا ہی بیش بہا عظیم ہوگا اگر
تم حیات تازہ کا چاہتی ہو تو اپنے کل ماضی کی قربانی ادا کرو۔

ایشیائے ایک گم شدہ جزیرہ کی چھوٹی سی قوم نے
اپنے سی صد سالہ ماضی کی کسمل قربانی مستقبل کے لئے پیش کی اور
وہ آزاد و مضبوط ہو کر ناریچ کی تازہ صدیوں میں داخل
ہوئی، اسے عظیم الشان قوم آج بھی اپنے ہزار ہا سالہ ماضی سے
نکل!

اپنے غیر مروجہ طریقوں اپنی قدیم ہدایات اپنی روح کو
مستقبل کرنے والی رسول، اپنے ضابطوں اپنے منہ فیصلوں والی ہندی قانون
اپنی آہنی زنجیروں اور اپنی آٹوں سے باہر آ!

زمانہ ماضی میں وہ سچی اور زندہ صورتیں تھیں اور ان میں اتنی
ہی تلک تھی جتنی کہ زندگی میں ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ چھوٹی اور
مردہ دکاؤں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، وہ ایسی کڑواہٹ ہیں جسے لٹش

کا بھی نعرہ ہو۔ یہی کشتی یا نجات، یہی مکمل کشتی یا نجات ہندوستان اور ایشیا کے لئے ہے۔

اقوام اور نسلوں میں تو مساوات کا دعویٰ کرتی ہو اور یہی مساوات خود ذالوں میں بے امنیوں اور کشتیوں کی قوام کی ہر شے اس وقت بنو گی جب تمہارے عزیز واپس میں بھائی بن جائیں گے۔ اور تمہاری بیٹیاں ان کی بہن اور برابر کی حق دار!۔

تمہاری بیٹیاں اور غلامی میں کشتی جاتی ہیں۔ تو تمہارے بیٹے باہر غلام نہا کر کیوں نہ رکھے جائیں! جب دنیا میں تمہاری صورتیں سب سے زیادہ مطلوبیت کی حالت میں ہوں تو تمہاری قوم کی تقدیر بھی یہی کیوں ہو!

مستورات اور ان کی قوم کے مابین ایک پوشیدہ اور قریبی تقدیر ہی رشتہ ہوتا ہے۔ قوم کی حیثیت ماں کی سی حیثیت ہے۔ اور وہ مستورات میں شمار کی جاتی ہے۔ جس قوم میں عورتوں کے ساتھ غلاموں کا سلسلہ ہو تا ہے وہ قوم خود غلام بن جاتی ہے۔

اکثر جاتی ہے جس طرح زندہ رہ سکتی ہو وہ تمہارے جسم کی زندگی نہیں ہیں برعکس برتن کی ہیں، مختلف اعضاء کی تیز تر نہیں رہیں، ان کی تعلیم جوائی اور ملحد کی بنائی ہے۔

اس طرح تعلیم شدہ جسم ہو کر تم کس طرح زندہ رہ سکتی ہو؟ جسم کو آزاد کر اس کے خون کو تمام رگوں میں آزادی اور خوشی سے دو کر دو، اپنی ذات پات کی بندشیں توڑ دو ایک دوسرے میں شامل ہو دو، پھر تم یقیناً زندہ ہو گی جب موت سے حکایت نہ ہو گی

ایک قوم کی حیثیت سے تم اس وقت زندہ ہو گی جب نبی نور انسان کے خلاف گستاخ کرنا ترک کر دو گی۔ کیوں ایک انسان کی تذلیل نبی نور انسان کی تذلیل ہے۔ تم نے انسانوں کو "ہریہ" بنالیا اس لئے جو میرے انسانوں نے نہیں "ہریہ" بنالیا۔ قوی "خود" کا خیال کافی زعماء، صوبہ کے لحاظ سے "خود" کا خیال بھی تمہارے لئے بے حد وسیع تھا۔ تم خودی کے اہمیت کی تنگ خیال ذات کی خودی میں ڈوب گئیں!

بجٹ میں زندگی بسر کرو پھر تم یقیناً زندہ ہو گی۔ اتفاق سارے ایشیا ہی کا وہ نہیں ہے سا کہ ہندو

تاثرات

احمد ریاض

میں بے ثروت تم بے بہت کون پر لئی پیتا مالے
خرمن کو بجلی کا سہارا گلچیں کھلیوں کے رکھو الے
جب نہاؤ ڈوبنے کی کشتی والے ساحل والے
کٹیاؤں کے گھوڑا اندھیر محلوں کے زر کارا جالے
آپ کا تاج و تخت سلامت آپ کے اوج بخت مبارک
راہوں میں دم توڑ رہے ہیں مائیں بہنیں بچے بالے

اب بھی اک پرویز کا دینگے ساتھ یہ ظالم دنیا والے
وقت کہاں لے آیا مجھ کو کیا سوچا کیا دیکھ رہا ہوں
طوفان کے بے مہر تھپڑے ساحل تک کیوں بچاؤں گے
دونوں ہی حسرتوں کا زکنا رکھیں نوچ رہے ہیں

ساقی

وہ ابر اٹھا وہ بوندیں ہیں وہ دل ہوا نغمہ ہارساقی
یہ درِ فضل بہار ساقی نہ آئیں گے ہار بار ساقی
کلی کلی مسکرا اٹھی ہر روش روشن گدرا اٹھی ہے
مجھے خبر ہے گلوں کے پردے میں پل رہے ہیں ہزار کا
یہ مانتا ہوں کہ تیرے ساغر میں زندگی خود جھلک رہی
جہاں کی رقا کر کہہ رہی ہو پرانے شیشے نہ سدا رہے
نظامِ عالم بدل چکا ہوا لٹ چکی ہے بساطِ ہستی
نہ کیوں ستاروں کی ہم گلوں کے کشید کر لیں نہ تر خودی
نہ وہ ستاروں میں نور باقی نہ وہ گلستاں میں مستیاں ہیں

انہیں سے اختر نہیں گے اک دن انہیں سے غنچے کھلیں گے اک دن
دفا کے مار جو تجھ کو پہنار ہے ہیں اشکوں کے ہار ساقی

۳۹ ادھر بھی لا جام کھو لکر ہم ہیں غم روزگار ساقی
جو ہو کے مالوس جا چکے ہیں انہیں خدا را پکار ساقی
گلوں کو جھولا جھلاتی آئی ہو نوعوس بہار ساقی
تری لگا ہوں کو جانتا ہوں نے فریب بہار ساقی
ترے لبوں کے مگر مقابل کہاں میں غم شکار ساقی
بجائے مے کے اتنی سے پھوٹیکا خون کا ایشا ساقی
اگر یہی رنگِ انجن ہو تو کیا ترا اعتبار ساقی
کہ صبح تو ہو چلی ہو کون اب تر کرے انتظار ساقی
تری لگا ہوں میں ٹھونڈ تلہی جو کھو چکا ہے بہار ساقی

کہانی کی کہانی

مورچہ چلے بیٹھا تھا۔ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے تھے۔ ایک بار وہ مولے کا قہر تھا۔ دوسرا لکچر کا شرع تھا۔ ادراپ دونوں ایک دوسرے کی جان کے پیارے ہو رہے تھے۔
پرتو زبیر لا۔ مجھے تمہارے حسین گیت نہیں چاہیں، میرے سامنے جلتا ہوا بارہ مولا ہے۔ میری چھوٹی بہن کی دریدہ عصمت ہے۔ مجھے بریل کی ہوتی مقبول شہزادی کی لاش ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

دوسرے درے سے رحمت خاں نے کہا۔ میں ریاست پونچھ کا مہین ہوں، پھلندری کا رہنے والا۔ پھلندری جیسے میرے دشمنوں نے نبھاری کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے، باقی ہریم لوگ تہذیب کی کھوپڑی تھی۔ اعتبار سے بچائی مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں۔ پرتو زبیر سے میرا کوئی رنگا رنگ نہیں ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

آزاد۔ پرتو زبیر رحمت خاں کے مورچے تھے۔ راج میں نیلم کے ننگے کی طرح چمکتی ہوئی ایک وادی تھی۔ میں بچے وادی میں آگئی۔ بلیکس داں کوئی نہ تھا۔ گھر آجڑے اور بڑا بڑے تھے۔ کھیتوں میں بیل چلے جتے جتے رہ گئے تھے۔ چٹو پربانی کے گھر بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ چرواہاں کہاں تھیں۔ چراغیں اپنے سروں پر اٹھائے انہی ہمگی بلیکس تھکے تھکے ہوئے گھوڑوں کے کوبڑ بڑا ہوں کی ڈاؤر کی طرح اڑی اڑی چلی جاتیں۔ میں ایکلی ہی کٹھری کھڑی داں ایک جیسے کے گناہے دف بجائے گئی۔ اتنے میں رو آدمی را الفضل لئے کہیں سے نکل آئے ایک نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں بڑے خوب صورت گیت سنائوں گی۔ دف پرنا چوں گی۔

وہ اکبری ظالمانہ نہی نہیں کے بولا۔ ہاں ہاں گیت بھی

ایک روز میں نے کہانی کو بڑے خوب صورت کپڑے پہنائے، اسے نشینے کا فر بنایا جس پر کٹھری کاربجوں نے رنگا رنگ نازک بلی پوٹے کاٹے تھے۔ اس کی گردن میں سترخ موتیوں کی تسلی ہی بنائی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اس کے بال سنوارے، اس کے ماتھے پر افشاں چمن دی۔ اس کے پاؤں میں خلخال باندھ دیئے اور اس کے ہاتھ میں ایک دف دے کے اسے اپنی وادی میں بھیج دیا۔

کہانی بہت جلد اس چلی آئی پڑمردہ۔ برلیان۔ حیران۔ دل برداشتہ، اس کا چہرہ زرد تھا۔ بال اکھے ہوئے فراق جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ آنکھوں کا کاجل کا فوہ تھا۔ خلخال بے آواز تھے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا ہوا۔ دباں تو لایا استعمال نہ ہوا کبھی۔ کیا کیا تھا۔ کبھی ماہ میں آنکھیں کھائے تھا۔ سترخ پتے پتے چھوڑا ہوں سے بادشاہوں تک بھی تمہارے دلکش، ردائی، رنگین گیت سننے کے لئے بے قرار رہتے تھے، جلدی کہو۔ دباں ایسا سلوک تمہارے ساتھ کس نے کیا۔

کہانی بولی۔ تمہاری وادی میں آج کوئی میرے بیٹے گیت سن کر لئے تیار نہیں ہے۔ ذل کے کارے چھوٹے چھوٹے فوجی قواعد کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ خود میں جو کس کھڑی ہو کر سترخوں کی طرح بہرہ دے رہی ہیں۔ کاربج کرگوں برے کٹھری کا تانا باننا رہے۔ کسی کو رحمت نہیں ہے۔ میرے خوب صورت کپڑے کو دیکھئے۔ میرے ہونٹوں سے مہلوں کی طرح چمکتے ہوئے گیتوں کو سنئے۔ میرے پاؤں کے نازک خلخالوں کی نفرتی چمکا کر کو سنئے۔ مجھے دباں سے واپس آنا پڑا۔

میں نے کہا۔ تو تم ہی جو جنگ پر گئی ہو۔

کہانی بولی۔ میں دباں بھی گئی تھی۔ ایک پہاڑی درے پر۔

پرتو زبیر مہر لگائے دیکھے بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے دوسرے درے پر رحمت خاں

سنیں گے۔ ابھی پہلی تیری چینی تو سنیں۔

پھر دوسرے آدمی نے بھی مجھے بلایا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اور میان دو دفن کے ماحول میں ایک ایک کاغذ کے پرزے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور چمڑا کر زمین پر گر پڑی اور وہ مجھے یوں اپنی ہیئت تبدیل کرتے دیکھ کر ہرے گھبرائے اور وہاں سے بھاگ گئے۔

اسی کشمکش میں میرا قرن پھٹ گیا۔ اور فحش ٹوٹ گئے اور میرے ماتھے کی آفتاب نوج ڈالی گئی۔ یہ دیکھتے میں اب تمھاری وادی میں کسی نہیں جاؤں گا۔ وہ سر جھکا کے رونے لگی۔

میں بہت دیر تک پریشان رہا۔ وہ بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ آخر میں نے اسے دلا سادیتے ہوئے کہا۔ اچھا میں تمہیں دان نہیں بھیجتا ہوں۔ آج ہمارے نیا تاج محل چل چل کر نکلنے والے ہیں میں تمہیں ریلوے کا کلرک بنا کے وہاں بھیجتا ہوں۔ ہاں مگر حواسے نیا کام ادبے احترام محفوظ رہے۔ وہاں پر بھی شرفائے طبقے سے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ مجلسی آداب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کہیں کوئی ایسی دیسی بات نہ ہو چلے جس سے میرا فظ نام ہو جائے۔

میں نے کہا کئی کو چالیس برس کا ریلوے کلرک بنا دیا۔ نام مل وانکر، جو داروین کے نیک نیک میں کام کرتا ہے۔ جس کے دانت کھنٹی رنگ کے ہیں۔ اور جو جوتا اور نمک کولا کے کھاتا ہے۔ جس کے پانچ بچے ہیں۔ ایک بیوی ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ دو جوان بہنیں ہیں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ بیوی کا ایک بھائی ہے؟ دو ذوق آنکھوں سے اندھا ہے؟ دو جو اسے جہیز میں ملا تھا۔ مل وانکر کا باپ بھی ریلوے میں کام کرتا تھا۔ بچا لائسن بر۔ ادب مل وانکر بھی کام کرتا ہے۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی نیا تاج محل نہیں بنایا۔ تاج محل ہوئے تو کتنا روہ کبھی ایسی سنسٹرل کے ریلوے ٹکڑا میں بیٹھ کے کھانا نہیں کھا سکا۔ اسی لیے میں آج سے تاج محل ہوئے بھیج رہا تھا، جہاں ہمارے نیا آنے والے تھے۔

چوتھا سال چار ہوا تھا۔ نیا سال پیدا ہوا تھا۔ یہ رات بڑی سہانی تھی۔ میں نے کوئی سات بجے کے قریب ہی مل وانکر کو تاج محل ہوئے بھیج دیا۔ اور خود میرے کمرے کے لئے سمندر کے کنارے چلا گیا۔ وہاں بہت دیر تک ٹھہرا رہا اور سیب اور گھونگھوں کو اکٹھا کر کے ان کا مکان بنانا دیا۔ اور پھر اس کے بھر دے پر گزرا۔ وہاں سے پہلی دفعہ وکیل کرتا رہا اور

پھر سمندر کی اک بہت بڑی لہری لڑائی اور میرا گھونڈا ہانگے گئی اور میرے کپڑے بھی گیلے گیلے گئی۔ اور میں کسی طرح منطس دنا دار ہو کر واپس اپنے گھر لوٹا۔ رستے میں ساحل کے کنارے ماہی انہی کشتیوں میں لائیں باہرے بادبان ٹھیک کر رہے تھے، رات کو سمندر میں کھیلنا پکڑنے جاتے تھے، ایک بڑے جانے تھے سے باتیں کے جا رہا تھا۔ ایک جوڑا ریت پر محو افراط تھا پولیس کا سہاوی سرے پر کھڑا اسگریٹ بی رہا تھا۔ دور نما ریل بیٹھے دلا پیٹھ کوڑ کر کسی صد لگاتے ہوئے جا رہا تھا۔ ایک ایک آسان پر سائے ستائے کھل کھل کر نہیں بڑے شہر پر کچرک طرح سے وہ میری ڈلی ہوئی چیل میرے پیٹے ہوئے پانچے اندر ریت میں تھی ہوئی رانی تیسوں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اور میں جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا گھر چلا آیا۔ اور میں ندل میں جا رہا تھا۔ کراہ میں کبھی آتا ہوا لاس میں کمر ساحل کے کنارے نہیں جاؤں گا۔ آج نئے سال کا جنم دن ہے۔ اور آج سب لوگ ہر لباس دیکھتے ہیں۔ میرا دل نہیں بچتے۔

میں نے دروازہ دھکولا۔ اور کپڑے تبدیل کئے اور کھانا کھا کے اور ایک عمدہ سی کتاب ہاتھ میں لے کر سیر پر دروازہ ہو گیا۔ دیر تک اُسے پڑھتا رہا۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ لیکن مل وانکر واپس نہ آیا۔ میں نے سڑکار دل ہی دل میں کہا۔ آج پہلی بار تاج محل چل ہوئے گئے۔ اتنی جلدی کا کچھ کو لوئے گا۔ اتنا سوچ کے میں نے کن پ کو بند کر دیا۔ سی بھادی اور بڑے مزے سے نرم نرم گنگے سے سیر پر پاؤں پھیلائے سو گیا۔ میں نہیں کتنی دیر سو تا رہا۔ ایک ایک سیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جتنی لگا کے دیکھا۔ گھڑی میں تین بج رہے تھے۔ یہ اس وقت کون سی فون کر رہا تھا۔ میں نے غصہ میں جو تنگ اٹھایا اور سخت لہجے میں کہا۔ کون ہے؟ میں ہوں مل وانکر۔

ارے۔ کہاں ہوا ابھی تک تاج محل سے بول رہے ہو میں نے پوچھا۔

نہیں! میں کولاب کے تھانے سے بولی ہا ہوں۔ مل وانکر نے بڑی گھڑی میں جواب دیا۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور بلا ضمانت مجھے ہاؤس کر رہے۔ آپ فوراً آجائے۔

خیر صاحب میں رات کے تین بجے اٹھا اور بھاگا بھاگا تھانے گیا۔ اور آسے ضمانت پر چھڑا لیا۔ پس کا نیکر کٹی ہوئی تھی اور اُس کا منہ سوجا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خروشوں کے نشان تھے۔ میں نے پوچھا۔ تمہیں پولیس نے مارا ہے۔

پھر نیتاجی کو مار پھینائے گئے۔

مالیاں بھائی نہیں

ایڈریس پیش کیا گیا

مالیاں بھائی نہیں

ٹھہر۔ ٹھہر۔ میں نے مل داکر کوٹوک کہا۔ یہ تو تم نے
بتایا ہی نہیں کہ ایڈریس میں کیا تھا جواب کیا دیا گیا۔

مل داکر نے بڑی حسارت سے کہا۔ ایڈریس میں ہی تھا جو لیے
ایڈریس میں چوتھے یعنی آپ بہت بڑے تھے مار خاں ہیں، مگر آپ
نہیں تو ملک دوب جائے۔ قیامت نہ جائے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ
ملک کی باک دہڑا آپ ایسے دھیر و غیر قسم کے دانشوروں کے ہاتھ میں
اور علی حذر القیاس۔ اور جواب بھی اسی قسم کا تھا۔ یعنی آپ لوگوں نے
میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ میں ذرا دل اڑا دی نہیں ہوں۔ بڑے
بڑے مسئلوں کا سرچشمہ بن رہا ہوں۔ ورنہ ابھی تو ملک کے سامنے بہت سے
بڑے کام ہیں۔ ایسے بڑے کام میں جن کے مسئلے بڑے سوچ کا پرکھوتے
ہے۔ اس وقت ملک کے سامنے بڑا صدمہ ہندوستان ہے

ادب میں نہیں باخشا کرنا ہوگا۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کون اتنی بڑی
زمدار کے لئے اتنا پہن سکتا ہوں۔ کہ آپ لوگوں کو میرے اوپر دشواری
رکھنا چاہتے اند ملک میں بڑے اس سے رہنا چاہئے۔ اس کے لئے بہت
مزدوری ہے کہ آپ لوگ شراب نہ پئیں۔ سینا مال میں سیکرٹ نہ پئیں اور
بارہ بجے کے بعد کبھی لڑکھ کر سوجائیں۔ ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا اور
برلن کا طرح یہاں بھی کیونکہ ہمیں چلنے کا۔ اس لئے سرمایہ داروں
کو چاہئے کہ وہ گورنمنٹ کا ساتھ دیں۔ اور میں مزدوروں کو متنبہ
کرنا اہل۔ کہ وہ ہڑتالیں نہ کریں۔ پیداوار کو بڑھائیں۔ اس موقع
پر مجھے سے نہیں گیا۔ میں نے اپنی سیٹ سے چھل کر کہا۔ میں آپ سے
ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ سب لوگ میری طرف گھور گھور کر دیکھتے
گئے۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کہا۔ نیتاجی۔ میری تنخواہ چالیس روپیہ ہے۔
ایک آدمی ہوا۔ چالیس روپے والے آدمی کا علاج میں کیا کام۔
اسے باہر نکال دو۔ اسے باہر نکال دو۔ بہت سے روساء
اک دم چپے۔

میں نے کہا۔ نیتاجی۔ آپ مزدوروں کے بڑے حامی بنے مگر
آج آپ کو علاج میں ملنے کی خدمت ہے۔ یونیورسٹیوں سے لائسنس
ڈگریاں حاصل کرنے کی فراغت ہے۔ بے لایق قسم کی کانفرنسوں میں شرکت

نہیں۔

پھر کیا بیٹوں سے بچواتے رہے ہو۔

وہ ہوا۔ ہاں بڑی شریف بیاں تھیں۔ بڑی خوب صورت

سائیریاں پہنے تھیں باوجود شراب میں دھند تھیں۔

میں نے کہا۔ تم تھانے میں کیسے پہن گئے۔ میں نے تو ہمیں فوج ملی
ہوئی بھی تھی۔

مل داکر بولا جی تو۔ آپ نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں
انے دوچار ایسے سائیریاں کو لے جاتا۔ وہاں مل گیا تھا۔ پہلے تو وہ لوگ
مجھے اندر رکھتے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ میرا بس بہت شاندار تھا۔ یہ
نیکر تھیں۔ جو تھانے کے قریب لوگ بھی بہت اچھا لباس پہنتے ہیں،
یہ آپ نے کیا کیا۔ اگر آپ مجھے وہاں بھیجنا ہی تھا تو کوئی شرف ہی دیا ہوتا کہ
عمومہ سائنسدانوں کا لباس۔ یا کھڑکیاں لٹکاتا اور۔ یا دھوئی۔ اور جڑ
جیٹ اور سر پر رک شفاف سیا کا ڈھنگی ٹوپی۔ آج کل یہ دلیریں بھی خوب چلتی
ہے وہاں۔ منسا ہے کسی زمانے میں اس دلیر کو داں گھسنے نہیں دیتے تھے۔ مگر
آج رات کو تو داں اس لباس کی بہت عزت تھی۔

میں نے کہا۔ تم اپنی بات سنو۔
مل داکر بولا۔ پہلے تو ان لوگوں نے میری دستخط طبع شکل تیار
پراختس کیا۔ مگر جو میری سیٹ تک تھی۔ اور جب میں پہنچا تو میں
وقت نیتاجی میں سٹر میں چڑھتے آ رہے تھے اس لئے ٹھہرے مجھے اپنی
پریشانی میں زیادہ دیر تک نہ رکھا۔ اس کی نگاہ نیتاجی پر گئی اور میں
مال کے اندر چھوڑا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے منہ پر دو دوڑے
پہلے سے بیٹھے تھے۔ ایک پارسی جوڑا تھا۔ ایک بھارتی۔ دونوں شراب
پی رہے تھے۔

دیر نے آگے مجھ سے پوچھا۔ آپ کیا پیتے گئے۔

میں نے کہا۔ ٹھنڈا پانی۔

وہ بڑا کم سکھ کر گردن اچھی کر کے اپنی مال بوسنوارتا ہوا
چلا گیا۔ وہ دونوں جوڑے میری طرف دیکھ کر بڑی حسارت سے
مکمل گئے۔ پھر انھوں نے گون گون کر کے ایک میں اینڈ ہاؤس کے منڈکی
طرف دیکھا۔ جہاں سے ایک نیا غریبہ ہوا تھا اور جہاں سپید و سرخ
لوہیاں ہوا ہوا ہوا تھا انھیں نقص فرما رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دو دو گروں کے
سوا بالکل نکلی تھیں۔ اور بار بار کھلے گھمائی پھرتی تھیں۔ ابھی دانش
شروع ہی ہوا تھا کہ نیتاجی اندر داخل ہوئے اور ایک دانشمند ہو گیا
اور غصہ میں بندہ سے ماترم کا لہر گرجا اٹھا۔

کرنے کے لئے وقت ہے۔ آپ کو دیوے کے ایک غریب کلرک کی زندگی دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ ڈراوونٹ کے لئے میری کہانی سن لیجئے۔ ۱۹

دیکھئے۔ میں ابھی آپ کو بتانے دیتا ہوں۔ میرا نام مل مانگو ہے۔ میں داندین نبر ایک پر..... دو چار آدمیوں نے مجھے جاؤ۔ پیٹھ پیٹے رہو۔ دو چار آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میں نے صبح کر کہا۔ نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنی کہانی منانے کے لئے بیٹھ چکے ہوں۔ میرے گھر میں بچے بھوکے ہیں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ جن کے گھر میں بچے اور میری خواہ جالیں بیٹے ہیں۔ میں تو نیا جی کو اپنی کہانی فرزند سناؤں گا وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ اس پر بڑا مل تھا۔ اور میری بیوی پر جو دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے خیمے میں آکر اسے خوش خوش اور دو ایک خوش آدمیوں نے مجھے مارا بھی۔ پولیس آگئی۔ اور افسس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور کولہ کے خیمے میں لے گیا۔

میں سر ملا کے ہنسنے لگا۔ تو تمھاری کہانی دیاں بھی گئی تھیں سنی۔

مل داندین نے خیمے میں آکر مجھ سے کہا۔ آپ نے مجھے دیاں بھیجا ہا کیوں تھا۔ دیاں کے قسمت ہے ان باتوں کی۔ آپ نے خواہ مخواہ مجھے ان کے پیش و آرام میں ملنے دلانے کے لئے بھیج دیا۔ مگر اُس سے کچھ ہوا نہ توڑی ہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے بد مزگی پیدا ہوئی۔ پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔ جب میں دال سے باہر نکلا لاچار ہوا تھا۔ سب لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اور میک میں کے بیٹہ نے اک نیا ہوا میں دھن شروع کیا تھا۔

مل داندین نے سر ہلا کے کہا۔ اب میں دیاں کو بھی نہ جاؤں گا اور وہ میری طرف پیٹھ موڑ کے الگ بیٹھ گیا۔ روئے ہوئے بچے کی طرح۔ میں بہت دیر تک کھڑا رہا۔ کچھ کچھ میں نہ آیا۔ اب کیا کروں اسے کہانی بھیجوں۔ آخر سوچ سوچ کے میں نے نسخوں والا لباس تیار کیا۔ اور آئے کہانی کو پیش کیا۔ میں نے کہانی کی ستواں ناک کو ٹوکا دیا اس کے سر پر ہونٹوں کو سیٹھ کر دیا۔ اُس کی بے داغ تیوری پر ایک بہت بڑا مٹا لگا۔ اور اُس کے سر پر ایک لمبے پتندے والی کوئی ٹوپی بٹا کر اُس سے کہا۔ جاؤ۔ جہاں پر تھے تھے بچے کھیلے ہیں اور بے فکر اور

معصوم دوجس سرگرتی ہیں۔ یہ تلاق ہوئی تھی دنیا تمھاری پیاری پیاری کہانیاں سن گئی۔ اور نہ مٹی میں پھر سے پرستانوں کی بہار آجائے گی۔ جاؤ۔ سوئے جاؤ۔ تم دیکھ کی طرح ناچو، ماری کی طرح ڈنڈی بجائو۔ اور بندر کی طرح ناچنے بچوں کی دنیا میں نہیں کے فوٹے اچھا دل دو۔

مسخرہ انا گھر سے کا جھول سمٹا تھا اور مجھ سے رخصت ہوا اور کوئی پانچ چھ دن تک واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا خلاف معمول اب کے کہانی ہی ہوگئی۔ میں تو اتنی ہی کہانیاں نہیں لکھا ہوں اب کے کہانی کو کیا ہوا جس قدر سی ہوگئی۔ ابھی تک آئی نہیں۔ ہفتہ ہونے کو آیا۔ اتوار کے بعد جب میں ترقی پانچ مہینوں کے جلے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ کسی نے دروازے کی گنڈی کھٹکھٹائی۔ میں نے دیکھا۔ مسخرہ ہے۔ لیکن کوئی ٹوٹی غائب ہے۔ ناک کوئی نہیں ہے۔ ہڑوری سے ستا غائب ہے۔ گدھے کی جھولی نہیں ہیں کبھی ہے بلکہ سچا ہوں والا لباس نیلے دروازے پر کھڑا لٹ رائٹ کر رہا ہے میں نے ڈر سے ڈر سے دروازہ کھولا۔

کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ میں نے کہانی سے بوجھا۔ مسخرہ میرے سامنے نشت پر بیٹھ گیا۔ رائٹل کو تمام کے بولا۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ کیوں کیا ہوا۔

مسخرہ چپ رہا۔ بہت دیر کے بعد بولا۔ اب کے میں بہت خوش تھا۔ سوچا تھا۔ خوب خوب لوگوں کو ہنساؤں گا۔ شیش کے قریب ہی مجھے سات آٹھ سال کا بچہ مل گیا وہ میری طرف بڑی دھکی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاس جا کے کہا کہانی سنو گے۔ بڑی اچھی کہانی ہے میرے پاس۔

وہ بولا۔ میرے پاس کہانی سننے کا وقت نہیں ہے۔ کیوں کہ میرے باب مر چکے ہیں۔ اور اب میں دیاں میں شترے کی گولیاں بیچتا ہوں۔ میری ایک جھولی میں ہیں بھی ہے۔ اُسے دیکھو گے۔

وہ مجھے شیش سے باہر لے گیا۔ ایک کونے میں ایک بچی پر تھی اور جب چاہا ہاتھ بھلائے بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ بولا۔ جب ہم لوگ کراچی میں تھے تھے قوت کو بڑی اچھی اچھی کہانیاں سننے تھے۔ اب ہمارے پاس کہانی سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ شترے کی گولیاں لو گے۔ ایک آنے میں چھ۔ ایک آنے

ہیں چھ۔ ایک آنے میں چھ۔ پھر وہ کوک کے بولا۔ اگر تم اپنا لباس مجھے دیدو۔ تو میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے سنسرے کی کوپیاں خریدیں گے۔

میں وہاں سے بھاگ نکلا
وہاں سے نکلی کر میں بھی میں گھس گیا۔ چند لوٹے تینگ بنا چھ تھے۔ میں نے کہا۔ میں نہیں رنگا رنگ تینگوں کو اونچا بیٹے اونچا اڑانے کا طریقہ بتاتا ہوں۔ یہ طریقہ میں نے زعفران دھیں کی پرک سے تیکھا تھا۔ زعفران دھیں کی پرک۔

میں بہاں تک کہنے پایا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکا بول اٹھا۔
بڑے سیاں کیوں ہمارا وقت خراب کرنے ہو۔ ہم لوگ تینگ بناتے ہیں، تینگ اڑاتے نہیں ہیں۔ وہ دوسرے بچے ہوتے ہوں گے۔ ہم لوگ اگر شام تک بچاس تینگ نہیں بنائیں گے تو بھوکے مر جائیں گے۔ تم بہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔

میں وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ اولیک گھر کے اندر گھس گیا۔ باہر دروازے پر تالا تھا۔ لیکن میرے لئے کیا روک ٹوک تھی۔ میں گھر کے اندر گھس گیا۔ کیوں کہ گھر کے اندر سے برابر چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اندر جا کے میں نے دیکھا کہ ایک کانا بچہ ہے۔ شکل سے چار سال کا ہو گا اور وہ ایک دودھ پتی بچی کو پیٹ رہا ہے۔

میں نے اسے کہا۔ بچے بچوں سے پیار کرے تو جیہاڑے بیٹے نہیں ہیں۔

یہ روتی ہے۔ بچے نے جواب دیا۔

یہ کیوں روتی ہے۔ میں نے پوچھا۔

یہ بھوک ہے۔

اس کی ماں کہاں ہے

ماں کا داخلے لگتی ہے

باپ کہاں ہے۔

باپ بھی کا رخانے گیا ہے۔

ماں اس کو کارخانے کیوں نہیں لے گئی۔

ماں کام کرتی ہے۔ ماں کا رخانے لگتی ہے۔ یہ بھوک ہے۔ میں بھی

بھوکا ہوں۔ یہ روتی ہے۔ میں اس کو مارتا ہوں۔

میں نے کہا۔ اسے مارو نہیں۔ دیکھو پھر ہم تمہیں بڑی چھی

کہانی سناتے ہیں۔ ایک تھا بادشاہ!

بادشاہ لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ لڑکے نے کہا

تم سے کس نے کہا۔ میں نے پوچھا۔
پاپو کہتے ہیں۔ بادشاہ اچھے نہیں ہوتے۔ وہ بھوکا رکھتے ہیں۔

اچھا تو ہم تمہیں بریوں کی کہانی سناتے ہیں۔ وہاں بھوک نہیں ہوتی۔ بریوں کا دس بڑا سدر ہے۔ وہاں بڑے سدر مکان ہوتے ہیں۔ وہاں پر شہزادہ دودھ کی نہیں ہوتی ہیں۔
آہا ہا۔ دودھ۔ ہمیں دودھ ہی تو چاہئے۔ لڑکا اچھل پڑا۔
تم کہانی تو سنو۔

نہیں۔ ہمیں دودھ دو۔ ہماری بہن دودھ مانگتی ہے یہ دتی ہے۔ ہم اسے مانتے ہیں۔

اور اس بریوں کے دہیں میں اک دن پریم کا راجہ
ہمیں پریم کا راجہ نہیں۔ دودھ چاہئے۔ پریم کا راجہ نہیں سنئے
ہم۔ دودھ۔ دودھ۔ دودھ۔

لڑکا زور زور سے رونے لگا۔ اور اپنی ننھی بہن کو پیٹنے لگا
میں جلدی سے وہاں سے نکلی آیا۔ پھر وہاں نکلی کر میں بہت سی چھوٹی برکیا۔ بہت سی لنگیوں میں۔ بازاںوں میں۔ گلی کوچوں میں۔ بھرتیوں میں، جنگلوں میں۔ شہروں میں۔ دیہاتوں میں کسی بچے نے میری کہانی نہیں سنی، وہ بے بریشان ہو چکے ہیں۔ بڑے ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی ہنسی کھلائے بھول کر طرح طرح کرنا شروع کر رہی ہیں۔

نواب تم۔ سامعی کا لباس پہن کر کیوں آئے ہو؟
وہ بولا۔ اس نے کہا کہ اب میں لڑکا بنانا چاہتا ہوں۔ اس ہنسی کے لئے لڑکا بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے منہ نہ کھین میں ایک کسان ہے۔ اس کا نام ہے۔ وہ اس ہنسی کے لئے لڑکا ہے۔ اور میں نے یہ منہ کہ اندر نشیا میں ایک نور الدین کا کٹن ہے۔ اور وہ اس کے لئے لڑکا ہے اور میں نے یہ کہنا میں لڑکا ہوں۔ ہمارے والد اس کے لئے لڑکا ہے۔ اور میں نے منہ کہ برآمدور طابا اور ہند چینی کے گھنے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کے لئے لڑکا ہے ہیں۔ میری بھی اس ہنسی کے لئے لڑکا گا۔ اب میں ان کو بہت رقا تو نہیں بنانا چاہتا۔ بنانے والا آخر وہ بھی نہیں بنانا چاہتا۔ کمزور احتجاج کرنے والا۔ کلرک بھی نہیں بنانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اک بولٹی کس کا توں کی گولی بنا دو۔ اور مجھے وہاں بیج دو۔ جہاں انسان، انسان پر ظلم کے خلاف لڑ رہا ہے۔

سویرے سویرے

کبھی تو میری زندگی کے اُفق سے چھٹنگے یہ بُرِ حمل، خونیں اندھیرے
 شب تار کے تلخے آنچلوں سے کہانتک نہ برسیں گے نوری سویرے
 غریبوں کی کٹیا ہو یا قصرِ شاہی یہاں بھی دھندلے وہاں بھی اندھیرے
 یہ دُنیا ہے یاں چین لینے نہ دینگے سماجی درندے رواجی لٹیرے
 گزرنے بھی دے یہ غبارِ منظم بکٹنے بھی دیں یہ سلسلِ اندھیرے
 بڑی دیر سے منتظر ہیں ہمارے گلابی اُجالے شہابی سویرے
 چل اپنے لئے اب نئی راہ ڈھونڈیں کرس کیوں لحاظ رواجِ زمانہ
 یہ دُنیا کی رسمیں نہ تجھ سے نہ مجھ سے یہ دُنیا کے بندھن تیرے نہ میرے
 مجھے اپنے دامن کی پہنائیوں میں جگہ دے بھی دو اب رو پہلی اُجالو
 میری جستجو میں ہے ظلمت جہاں کی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اندھیرے
 وہ یوں روح میں ڈوبتے جا رہے ہیں وہ یوں میرے احسانِ بچھا رہے ہیں
 ہضامیں دبے پاؤں سولج کی کرنیں بکھر جائیں جیسے سویرے سویرے
 زمانے نے لی کیسی کروٹ یہ حشری یہ کیا ہو گیا مسکراتے دلوں کو
 جو انساناں کبھی تھے امینِ محبت وہ انسان اب بن گئے ہیں لٹیرے

۴۵

مضطر اکبر آبادی غمِ زمانہ

خیالِ امروز، فکرِ فردا، غمِ محبت، غمِ زمانہ
 عجب تماشا سا بن گئی ہے چین میں تعمیرِ آشیانہ
 گزر گیا دورِ بند شو کا سمٹ گئی گردشِ زمانہ
 جمالِ ساحلِ نظر سے او جھل اُدھر بھی خال اُدھر بھی خال
 حقیقتِ مرگِ زیستِ بر کیوں لکھ رہا ہوں لکھنے والو
 نہ اب، وہ دورِ بریقہ اریٰ اشکباری آہِ وزاری
 اگرچہ میں خوش دلی سے سہارا زمانہ کے نازِ حیا
 یہی مری مختصر حقیقت یہی مرا مختصر فناء
 کبھی فناء نہ خا حقیقت کبھی حقیقتِ فناء نہ
 جو آشیانہ کبھی قفسِ تھا دی قفسِ آشیانہ
 ہوا مخالفِ بھونہ میں کشتیِ سپینا سب، ڈوب جانا
 حقیقتِ مرگ بھی فناء حقیقتِ زیست بھی فناء
 کس کا نام آگیا زباں پر کہ ہم گئی گردشِ زمانہ
 مگر مجھے ہر قدم پہ مضطر فریب دیتا رہا زمانہ

خواجہ غلام التبدین

مشرع تعلیم حکومت بی

منہب کا اثر اخلاق و عادات پر!

کی انسان دوستی میں زمان اور مکان کی حدوں کو توڑ کر ایک عالمگیر قوت بن جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج بہت سے لوگ اس طرح کی، بہترین قوت ہیں۔ گو یا ہندوستان کی تہذیب کی خاص قوم، کسی خاص نسل، جماعت یا مذہبی گروہ کی خاص ملکیت ہے۔ جس میں بعض نام کی چیزیں زیر کسی شامل ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ تہذیب کا گروہ نہیں کہے جاسکتے۔ اگر آپ انسانی خون کو اس کے اجزائیں تقسیم کر سکیں تو ان میں سے اس کے زبردست گروہ کو جدا کر سکیں۔ خوب صورت و ریشم کے ٹکڑے کا ناما بانا نا لگ کر کے دکھا سکیں، ادب کی شیرینی، اثر اور قوت میں سے مختلف جماعتوں کا حصہ الگ الگ نکال کر رکھ دیں، اگر آپ یہ سب کچھ کر سکیں اور خون، خون ہے، نغہ، نغہ ہے۔ ریشم، ریشم ہے۔ ادب، ادب ہے، اس وقت آپ ہندوستانی تہذیب کے بھی حصے بخرے کر سکتے ہیں۔ اور اس کو خالص اور پورے بنانے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔

خیر، کہنا یہ تھا کہ جن تہذیب کی *صنمیں* (جینس) اور تاریخ اس قسم کی ہو، اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ غرب کا اثر قبول نہ کرے؟ خصوصاً جب مغرب کی تہذیب ایک حاکم قوم کی تہذیب بن کر آتی تھی۔ عربی کلاسیک شہور قول ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے راستے پر چلتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن یہ ایک دم نہیں ہو گیا بلکہ اس کی ایک دلچسپ تاریخ ہے جس کی تفسیل کا موقع نہیں۔ ابتدا میں انگریز تاجروں اور مشیرین کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہندوستان اس وقت اپنی تہذیب کو بہت بلند سمجھتے تھے۔ اور مغرب سے آئے ہوئے یہ لوگ، جن کی

ہندوستان پر مغرب کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک مناسب موقع ہے کیونکہ ابھی ہم حال ہی میں مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں مادہ جو اس سیاسی کشمکش کے جو ہندوستان اور برطانیہ میں ہوتی رہی، مغرب نے ہماری تہذیب اور تمدن، ہماری زبان اور ادب، ہماری ذاتی اور قومی سیرت پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تقریروں کے اس سلسلے میں اس اثر کے مخالف پہلو آپ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میرا کام آج یہ ہے کہ مغرب نے ہمارے اخلاق و عادات پر جو اثر ڈالا ہے اس کا تجزیہ کروں۔ زندگی کو بنانے اور عمر کے ساتھ چلانے کا ایک سہرا اصول یہ ہے کہ ہم اچھی چیزوں کو اختیار کریں اور بُری چیزوں کی طرف سے منہ موڑیں۔ اب جب کہ آزادی نے ہمارے سامنے ترقی کے راستے کھول دیئے ہیں اور ہم ایک نئے تمدن اور نئے سماج کو بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ بے لاگ طریقہ مغرب کی میراث کی جانچ کریں اور اس میں جو اچھی چیزیں ہیں، انہیں کھلے دل سے اپنالیں۔ ہماری ہندوستانی تہذیب کو اس بات پر ماننا ہے کہ اس کا دامن مختلف اثرات کو قبول کرنے کے لئے کھلا رہا ہے۔ اور اس نے ہمیشہ ان کو ہم آہنگ کر دیا کہوشن کی ہے۔ اس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں سے اچھی چیزیں لیں اور ان کو سمو کر وہ جین ہم آہنگی پیدا کی جو ہر تاج محل کی شکل میں نظر آتی ہے۔ کہیں تان بین کی موسیقی میں جھلکتی ہے کہیں گیترا و ناٹک کی جھلکی میں جلوہ دکھلاتی ہے۔ کہیں انگریزی کلاسیکی تہذیب کا رد یہ اختیار کرتی ہے۔ کہیں یگورڈو قبائل کی شاعری میں دل تار پڑتی ہے۔ کہیں ہنگامی شاعر کی انگریزی نظموں اور جواہر لال کی مین الاقوامی سیاست میں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ پورے ہندوستان کا

چڑی گوری تھی، اندھیری کالاس، کھارنا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب ہم سے الگ تھی۔ انھیں کچھ عجیب اور مضحک سے معلوم ہوتے تھے۔ اگر آپ اٹھا کر نہیں اور انیسویں صدی کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ کہاے لکھے والے اندھاشاران کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ میں سیاسی قوت آتی گئی، اندھ ملک کے حالات سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس تبدیلی سے ساری صورت حال ہی بدل گئی۔ ان کا لباس جبے دھنگا بھجاتا تھا، اب تہذیب اور شان کی علامت بن گئی، ان کی زبان، حکومت کی زبان بنی، اور اس کی عقل کو نامکمل سمجھا جانے لگا۔ جیڑی کانٹے سے کھانا، جسے ہمارے بزرگ برا سمجھتے تھے، اب فیشن میں داخل ہو گیا۔ چال و دھال و نشست و برخاست، رہنے بسنے کے دھنگ نئے نئے بننے میں دھنچکے شروع ہوئے۔ اور شخبہ زندگی میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے انگریز تہذیب کی نقل شروع کر دی۔ وہ اس کی نقل ہری جوتے تک اس قدر چکا چوند ہوئے کہ انھیں اس کے مقابلے میں اپنی چیزیں گھٹا اور فضیلت معلوم ہونے لگیں۔ ان میں سے بعض کی کب سے بڑی اور بڑی چیزیں کے زمانے ان کو مر دگر انگریزی اس طرح بولیں کہ نادان قادی انھیں تازہ ولایت اور آکسفورڈ کی پیداوار سمجھے، ان کے تپلوں کی کر مر اور انے بزرگوں کی تلوار سے زبادہ تیز ہو، کپڑے لندن کے سٹے ہونے اور پیرس کے ڈھلے ہونے معلوم ہوں۔ اسے سبیل چول کے طریقوں اور آداب نشست و برخاست میں بھی انھوں نے اپنی تہذیب کی روایات کو چھوڑ کر، مغربی طریقے چوائے دیگر ماحول کی پیداوار سمجھے، بغیر سوچے سمجھے، بغیر تنقید کے اختیار کر لے جس وقت انیسویں صدی اپنے آخری سال گزار رہی تھی، ہندوستان کی تعلیم یافتہ لوگ مری پیشہ جماعت مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

لیکن اس دور کی بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اپنا لباس اور وضع قطع بدل لی بلکہ دھاتی قومی خصوصیتوں کو، اپنی قومی خودداری کو، اپنی عزت نفس کو بھلا بیٹھے، اپنی ہر چیز کو حق اور مغرب کی ہر چیز کو برتر سمجھنے لگے۔ دراصل غلامی کا انگریز قوم کی میرٹ اور خلاقی دھادات پر ہمیشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ایک آزاد خود مختار ملک میں وہ لوگ عزت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں جو ملک کی خدمت اور صلاح کی سیوا کرتے ہیں۔ سائنس، ادب، فلسفہ، آرٹ وغیرہ میں نام پیدا کرتے ہیں۔ انھیں کوڑے اعزاز اور عہدے ملتے ہیں لیکن ایک غلام ملک میں ان چیزوں کی کوئی خاص پوجہ نہیں ہوتی۔ وہاں برائی ناموری اور سرداری ان لوگوں کے لئے ہے جو حاکم قوم کا آزاد کار بننے ہیں۔ ان کے مفاد اور اغراض کی خدمت کرتے ہیں، محکوم قوم کو دبا کر رکھتے ہیں اس کی مدد کرتے ہیں اور خوشامد، جھوٹ اور ناحق کا ساتھ دے کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ حکومت ایسے لوگوں کی دل سے عزت نہیں کرتی۔ لیکن اپنی غرض سے انھیں آگے بڑھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس حکومت نے مدتوں، گامذہبی جواہر لال، موتی لال اور لاجپت رائے، سی۔ آر داس، ابوالکلام، اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور محمد علی جوہر میں بند رکھا، ان کے ساتھ سیاسی اچھوتوں کا سلسلو کیا اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو عہدے اور اعزاز دئے جو لیاقت، دیانت داری اور ذہنی نشانی قوم پرستی اور سیاسی سوچہ بوجھ میں ان کے پائے بھی نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن میں نہایت سخت اصول پرستی، دلچسپی اور اشار کی صلاحیت نہ تھی۔ ذلت کے آسان اور آرام دہ راستے کی طرف پھسل پڑے اور اس زمانے میں پہلے تعلیم یافتہ انگریز کی خزان طبقے میں خوبصورت اور با اصول لوگ کم دریاں الوقت زیادہ پیدا ہوئے۔ ان میں قومی خودداری کے بجائے خوشامد سچائی کے بجائے مصلحت پرستی، مبادری کے بجائے خوف، قومی ضرورت کی لگن کے بجائے خود غرضی کی جڑیں بکڑ گئیں۔ ان کو عوام کے ساتھ یک جہتی کا احساس نہیں ہوا اور خود کو ایک الگ ذات سمجھنے لگے اور بجائے خفا کا دکھ درد ڈھیلے اور ان کا بوجھ بھگا کرنے کے خود اپنے حلوے ماڈلے کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ مغرب کے انڈیا کا ایک ترین پہلو ہے۔

لیکن شروع سے ہی اس تحریک کی مخالفت بھی ملک میں موجود تھی۔ جو مختلف شکلوں اور مختلف وجوہ سے ظاہر ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں بھی بعض گروہ چلے گئے جو کسی دوسری اپنی تہذیب اور اپنی روایتوں کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان میں خاص طور پر متقابل ذکر مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت تھی جو مغربی تہذیب اور عیسائی مذہب کے پرچار کو ایک دوسرے سے وابستہ سمجھ کر چاہتے تھے کہ

مسلمان انگریزی تعلیم، انگریزی زبان اور انگریزی نوکریوں سے بالکل الگ ہیں۔ اگر آبادی نے اپنی شاعری میں ان کو اپنا کاپڑ بھٹکنا، گا، اڑایا ہے۔ جو سرب کی اندھی تقلید میں گرفتار تھے۔ اور نذیر احمد نے اپنے ناول میں اوقات میں اس تحریک پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے۔ لیکن اس کے خلاف جو زیادہ گہرا اور با اثر رد عمل شروع ہوا وہ ہماری سیاسی سید کی کامیاب پہلو تھا، اور اس نئی تحریک کی قیادت، جس کا مقصد ہندوستان میں اپنی خود ارادی سید کا قیام تھا، کا مذہبی، ٹیکوٹ اور قبائلی لے کی۔

ان تینوں چار شخصوں میں کوئی بھی سرب کا مخالف اور اس کی ہر چیز سے بیزار نہ تھا۔ انھوں نے خود بہت کچھ سرب سے حاصل کیا تھا، اور وہ اس کی اچھی اور بنیادی چیزوں کی قدر کرتے تھے لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ کوئی قوم ذہنی اور تہذیبی غلامی کی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی۔ اپنی خودی کا، اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کو جرأت اور روشن خیالی کے ساتھ سرب کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس پر جو ناقص عناصر ہیں ان کو شکنا چاہیے جو اپنی ہر چیز میں اپنی کو اپنی تہذیب میں شامل کر لینا چاہتے۔ ٹیکوٹ نے ہندوستان کو، اس کی تہذیب اور آرٹ کے خزانوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے اخلاقی اور روحانی اصولوں کی یاد دلائی اور سرب کو انسانیت اور محبت کا پادشہ بنا کر ہندوستانوں میں از سر نو قیام کا احساس پیدا کیا۔ گاندھی جی نے ان کامیاب غرضوں کے خلاف جہاد کیا جنھوں نے ہندوستانی سیرت کو کمزور اور ان کی قوت عمل کو مشکل کر دیا تھا انھوں نے لوگوں کو پیش پرستی کے بجائے سادگی، لایچ کے بجائے تاج سبوا کا سبق دیا۔ ان کی تحریک کا مقصد تھا کہ لوگوں میں ایسی سیرت پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں اس کی فضا میں اس نے سیرت، اور اس کی حفاظت کر سکیں۔

اقبال کا عقیدہ تھا کہ جب تک کوئی فرد باجماعت اپنی خودی کی گہرائیوں میں تدبیر کوئی کی کسی آب و ہوا میں نہیں پیدا کرتی وہ کمزور اور بے اثر رہتی ہے۔ غلامی، تقلید و رسوائی کی حالت نے ہندوستانوں کو بے بس بنا دیا تھا اقبال نے انھیں خود اعتمادی و سرب کی تحریک دی۔ انھیں اس بات کا فہم ہے کہ ہندوستان نے اپنی تہذیب، اپنی آواز کی کاموں کو گر دہن میں غلامی کی بنیادوں پر لی ہے اور ان کو شکایت سرب سے نہیں بلکہ ہندوستان سے تھی۔

معلوم کے ہند کی تقدیر کو کہہ دیا۔ بے جا کہ کسی ملک کا باطن نہیں ہے جان بھی گریو، بدن بھی گرد غیر۔ انھوں نے کئی نامکام ہے، یہ ہیں چہ یورپ کی غلامی پر فضا مند ہوا تو!

مجھ کو تو لگا تھا ہے چہ یورپ سے ہے یورپ سے نہیں ہے اس لیے ہم اب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ جب اپنی خوشی اور عقل کے مطابق سرب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، انگریزی ادب اور انگریزی فکر کی دولت سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے ڈھنگ، سائنس اور ڈاکٹری کے جدید آلات اور ریاضیات، مکان، لباس، خوراک، سیر و تفریح میں نئے راستے، سفر کرنے کے طریقے، اور صنعت و حرفت کی نئی شینیں، ان سب نے ہماری خیالات اور عادات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے مثلاً تہذیب کا جدید لوازم ہل کی طرف رجحان، موٹر میں ہوا کی جہاز، ڈاک ٹارگٹ کا رخا، چلنے والی مشینیں شامل ہیں۔ دوسری طرف علاج کے نئے نئے ڈھنگ اور سرجری کے نئے نئے آلات، تیسری طرف ملک کی سہولت اور سربانے کے ساتھ ملنے اور خوشی طرف انھار، چھٹی پہلو کیا ہیں، گراموفون، ریڈیو اور سینما، خبر کے ذریعہ لوگوں کی تعلیم و تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے سب ہمارے زندگی میں لپکے ہیں اور اس کا صرف آنا ہی مطلب نہیں کہ وہ ہماری مادی و معاشی کا جزو بن گئے ہیں۔ بلکہ ان سے ہر ایک نے ہماری خیالات اور عادات پر اثر ڈالا ہے اور ان کو نئے نئے بیٹے بن چکا ہے۔ جو آدمی بل کا ٹری کو چھوڑ کر پیشہ خیر کرتا ہے وہ صرف غلط کوئی تیز می سے نہیں کرتا بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کے منطقی اس کا نقطہ نظر بھی بدل جاتا ہے، اخبار سے دنیا کے حالات بھی باخبر ہوتے ہیں اور اکثر اس کی ذہنی آزادی بھی چھین رہے ہیں۔ ریڈیو اور سینما، اس کا دل بھی بھلاتے ہیں لیکن اکثر اس کی تخلیقی قوتوں کو کم کر کے اس کی تفریح کو کشمکش بنادیتے ہیں۔ یہ سب شرم بھی ہوتے ہیں اے اور سرب، لیکن، بدقسمتی سے اب تک ان چیزوں کے ساتھ غلامی کے رشتے کا زہر بھی ملا ہوا تھا۔

اب ہم اس اثر سے آزاد ہو کر ان کو اپنی تہذیب کی قوت اور دولت میں شامل کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ہم اس معاملے میں تنگ نظر کی کام نہیں کریں گے، ہندوستان کی تہذیب ہمیشہ بڑھتی اور مستحکم رہی ہے۔ اور اب اس زمانے میں جب بین الاقوامی میل جول بڑھ گیا ہے ہم اپنی پرانی ردائیاں کو ترک نہیں کر سکتے ہیں بلکہ درندہ دہان و دانی ہو کر (دہا بارت آل انڈیا ریڈیو مہمیں)

ایک پرتو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لئے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی مجھ خواب ہوں گی وہ سرگیں غم فروزا نگہیں
ہر اک شجر سو گیا ، زمیں پر لطیف کرناں کج حال پھیلے
ہر ایک شاخ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں باہیں !
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریب صبح بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکر امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیل سے ایک پرتو ابھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تپتا سے کھینچتی ہیں مائل ہو کر
یہ شب کی حسرت بہ دوش متی ہو چھوڑ دیتی ہے آرا کر ؟
دیوار محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے
حسین امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے

سلام مچلی شہری

غزل

آج کل جس سے کچھ شکایت ہے یاسمیں بیخ ہے ، سرو قاصد ہے
شاد مائی زندگی معلوم پھر غم زندگی کی حسرت ہے
مجھ کو دیکھو ، سچو ، پھلو پھلو آئینے کی بھی کیا ضرورت ہے
انہیں اُجڑی ہوئی نگاہوں سے گلستانوں کی زیب و زینت ہے
یہ غزل کچھ نہیں سلام ! مگر ہم نئے شاعروں کی جرات ہے

کچھ فسانہ کچھ حقیقت !

بہت سے معنوں بھی افسانے ہوتے ہیں لیکن افسانہ معنوں سے مختلف ہے۔ معنوں میں منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے، جذباتی ارتعاش کی جگہ نگری ارتقاء ہوتا ہے۔ تزیینی ہتھیار افسانہ پر انداز بھی اختیار کرتا ہے لیکن اس کا اخوں مختلف ہے، وہ منطقی اور علم کی کرامات دکھاتا ہے۔ کچھ افسانہ پر انداز ایسے بھی ہیں جو شاعرانہ اظہار خیال سے جذباتی ترغیب کا بھی سہارا لیتے ہیں لیکن اگر زیادہ انداز ہی کو رہنما بنا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بددیانتی ہے چونکہ معنوں کا کام دفنی طور پر متاثر کرنا نہیں ہے۔ اس لئے جو جس معنوں کی قسم کی خطابت ہو جس کا حقیقی تقریر پر درشاہی ہے۔ معنوں وہی معنوں ہیں جس کی عبارت کی تمام انہیں جزو درملومات سے تار و گئی ہیں اور جس کے گامے ٹی سر من مطلق کا ہاتھ ہو۔ پھر بھی یہ جس کی معنوں کو اچھا نہیں بنا سکتی ہیں۔ تاہم تنیکہ اچھا لکھنے والا صاحب سلوب نہ ہو اور اس میں زبان کی اتنی قدرت نہ ہو کہ وہ اپنے خیالات کو دفاحتی تصور میں ڈھال سکے۔ دراصل یہ کام نون کار کا ہے اس لئے اچھا معنوں کو نہیں ہو سکتا جو فن کا نہ ہو۔ پھر بھی آپ معنوں کو افسانے سے پہچان لیتے ہیں۔ خواہ آپ جانے کا یہ سلسلہ ہو یا نہ ہو کہ آپ معنوں نگار نے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے یا واقعی اپنے ذہن کو دوسرے کے ذہن سے منگوا لیا ہے ان الفاظ کے علاوہ اگر آپ معنوں کی تعریف کرنا چاہیں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ معنوں کا ایک بنیادی خیال ہوتا ہے جس کی دفاحت اور تشکیل میں درہمیت سے خیالات کی مدد لی جاتی ہے اور جب اس خیال کی تشکیل ہو جاتی ہے تو وہ معنوں ختم ہو جاتا ہے۔ ہر معنوں کی پہچان صرف جزا طرز پر ہی نہیں ہے۔ بڑی منطقی، بڑا فساد بیانات، منطقی تسلسل کی کمی، مرکزی خیال سے ہٹ کر دوسرے

افسانے کی تکنیک پر انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں ہیں۔ اور ان تمام کتابوں نے افسانے کی میت پر کافی زور دیا ہے۔ لیکن شواہد تو یہ ہے کہ افسانے کی تکنیک نئے مواد سے ہم آہنگ ہو کر ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کلاسیکی انداز میں افسانے کی تعریف اور اس کے قواعد و منوالط متعین بھی کر دیں تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ تمام افسانہ نگار جن کے قواعد و منوالط یونانیوں نے بنائے تھے آج کچھ اس طرح بدلے نظر آتے ہیں کہ اگر آپ کلاسیکی معیار پر جانچ کر کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی بے بسی ہوگی۔ ڈرامے کو لے کر آج اس کی صورت یونان میں کچھ بھی تو لکھنا ہے کچھ کرنا ہے۔ جب یورپ میں احیا و علوم کا زمانہ آیا تو کلاسیکی تحریک کی وہں میں یونانی ڈرامے کے بہت سے قواعد کو برتنے کی کوشش کی گئی لیکن رومانوی ادیبوں نے اس کی سخت مخالفت کی پھر تو ڈرامہ زمان و مکان اور اصل کی وحدت سے کچھ آزاد ہو گیا جب وہانیت سے حقیقت نگاری کا دور آیا تو ڈراما سائنسی مباحث کا ترجمان بن گیا۔ آکسن اور برنڈر شاہید ہوئے۔ بیوی و مردی میں یہ متغیر ہو کر مختلف نزعات کا حامل بنا رہا لیکن ان تمام تقییرات میں کوئی نہ کوئی چیز ثابت اندہ پائیدہ ضرور رہی ہے۔ آپ ڈرامے کو افسانہ نہیں کہتے ہیں خواہ وہ صرف پڑھنے ہی کے لئے کیوں نہ لکھا جائے آپ پانچ ایکٹ کے طویل ڈراموں کو ناول بھی نہیں کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے کی کوئی نہ کوئی خارجی میت الہی ضرور ہے جو باوجود تبدیلیوں کے ابھی تک اپنی جگہ برقرار ہے اور اب اسی میت کی بنیاد پر دوسری معنوں سے متاثر نہ کر لیتے ہیں انہیں معنوں میں افسانے یا کہانی کی بھی ایک خارجی میت ہے، اور اس خارجی میت کو فاضل نگار افسانے میں بہت ضرور دیا ہے۔ وہ خارجی میت کیلئے ہے کہانی کی ابتدا اور انتہا اگر بات اتنی ہی ہوتی تو

خیالوں کو اہمیت دینا یہ تمام چیزیں ایک مضمون کو ناقابل قبول اور نہ بڑے جاننے کے لائق بناتی ہیں، حالانکہ مضمون سب سے زیادہ آزاد صنعت ہے، آپ اپنے مضمون کو لکھ سکتے ہیں۔ نظریہ اضافیت کو سمجھا سکتے ہیں، مغرور شاہنشاہی سے بحث کر سکتے ہیں اور صفحات کے اسٹیج پر بکرے سے بھوکھنیز بریگی کر سکتے ہیں۔ اگر دم اچھے بڑے مضمون کو پہچان سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کہانی کو پہچان نہ سکیں۔

پہلا بیان۔

کہانی کسی مرکزی خیال کی ترجمان نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ مرکزی موضوع (THEME) کے ارتقا کا نام ہے۔ اس بیان کے تحت کہانی کے لئے کسی بنیاد سے بنائے ہوئے پلاٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے سے مرتب کئے ہوئے پلاٹ میں ایک مصنوعیت پائی جاتی ہے۔ موضوع کا منطقی ارتقا اپنا پلاٹ خود بنایا کرتا ہے لیکن یہ ماننا بڑے گناہ دہی تخلیق کے موقع پر کہانی کے ارد سے تھانی سے کابلٹ ضرورتیں ہوجاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کاغذ پر آنے کے بعد اس پلاٹ کی ہریت بدل جائے۔ اس سلسلے میں چند اور باتیں قابل غور ہیں۔ کہانی میں زندگی کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے اور زندگی کبھی بھی مرتب نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کا اختتام ہمیشہ ڈرامائی انداز ہی میں ہوا کرتا ہے پھر کہانی کے اختتام پر کسی ڈرامائی کیفیت کو تلاش کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اگر یہ ڈرامائی کیفیت خارجی ہے تو یقیناً یہ ایک عیب ہے لیکن اگر داخلی ہے تو اس سے کہانی کا لطف دو بار لاہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر بالعموم زندگی کی دو متضاد طاقتوں کو پیش کرتا ہے۔ یا پھر بہت سے متضاد عناصر میں کسی ایک عنصر یا جذبے کی سمت تلاش کرتا ہے متضاد عناصر کے ٹکراؤ سے زندگی کا احساس تیز ہوجاتا ہے۔ یہ ٹکراؤ خواہ آخر میں ہو یا کسی اور جگہ کہانی کو دورے سے قریب لاتی ہے لیکن اس چیز کو کہانی کی بنیادی خشت نہیں بنانی چاہئے ہے کیونکہ کہانیاں سچے سچے تاثرات کے ذخیرے سے بھی تخلیق کی جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ تاثرات ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرا بیان

کہانی کے لئے کسی کردار نگاری کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بیان میں بھی حقیقت ہے کہ کہانی صرف فن کار

کے ذاتی شاہد سے بھی بن سکتی ہے۔ وہ صرف کسی واقعے کی تصویر کھینچ سکتا ہے، یا کسی پہلے سے باہر کم کی غیر شخصی داستان بھی بیان کر سکتا ہے۔ مثالی طور پر کرشن چندر کی اپنا اور اکبر سر کو لیجئے۔ یہاں ریل گاڑی یا سب سے پہلی بیان کرتی ہے جس کے بیان میں کوئی خاص آدمی اور کوئی شخصیت نہیں ابھرتی ہے۔ صرف بربریت کا مظاہرہ میں کے جیسے طنزیہ انداز میں فن کار کا داخلی و ظاہری وجود ہے۔ آپ سے کہانی ملنے پر مجبور ہیں لیکن اس قسم کی کہانیوں کی مثالی ہمارے بحث کے لئے مفید نہ ہونگی۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے کہانی کی مختلف قسموں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کچھ کہانیاں لکھی جاتی ہیں جو تخلیقاتی ہیں جتنے پران کہانیوں میں کردار کی اہمیت بالکل معنی ہوتی ہے۔ کچھ کہانیاں صرف فن کار کے انداز نگار کا ہوتی ہیں لیکن ایسے موقع بھی کر سکتے ہیں کہ کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے کیونکہ دور کی ریکریٹ ایک کہانی کے کیڑوس پریش آسکتا ہے۔ برائی کہانیاں اپنے اس موضوع کو کچھ اس طرح بناتی ہیں۔ تحریر نگار کی طرف کیڑوں کا ریل ہوا، تریڈ اپ کے نیچے کردار کو کیڑوں کی طرح بنی کہانیاں اس موضوع کو دوسری طرح بناتی ہیں، وہ برے کردار میں خوبوں کے لئے ڈھونڈتی ہیں، برے کردار کے سماجی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ منہو اور بیداری اسل دیل میں تے ہیں،

۵۱

عصمت نفسانی، محبوں پر برہمی اسباب کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن کرشن کے یہاں کردار کی اہمیت بالکل معنی دہی ہے۔ کرشن کچھ اس طرح سوچتا ہے۔ شخصیت کی تکمیل یا ترقی آسایش اور غربت کے گونا گوں کیفیات ہی کے بعد ممکن ہے۔ ایک وہ شخص جس نے نہ تو بیٹ بھر کر رکھا تھا یا ہے اور نہ دل کھول کر محبت کے اس کے کردار ہی کیا، کرشن اس طرح سے شخصیت کی تکمیل پر زور دیتا ہے۔ وہ موجودہ شخصیتوں سے کم بحث کرتا ہے بلکہ ان کے تخلیقی امکانات، اور شخصیت کی بھرپور تکمیل کا ایک خواب پیش کرتا ہے۔ وہ کالو کھینچی پر کہانی نہیں لکھ پاتا ہے کیونکہ کالو کھینچی نے تو عشق ہی کیا ہے اور وہ بیٹ بھر کر رکھا تھا کھا یا ہے۔ کرشن چندر کا بالکل اچھا انداز ہے جہاں وہ برائی حقیقت نگاری سے اپنے کو الگ کر لیتا ہے۔ کرشن کو اپنے کردار کی منفرد خصوصیات ہی ستاتی ہیں وہ اپنے کردار کے ان احساسات اور تجلیات کو پیش کرتے گشتا ہے۔ جو اظہار کی برکت سے محروم ہے یہ کرشن اس شری اور عدوان کو اچھے طرح نباہ لیتا ہے کیوں کہ اس کے اسلوب میں غربت اور گداز ہے لیکن کہیں کہیں پر اعلان کا موقع بھی دیتا ہے۔ پھول سرخ ہیں اس کہانی کو لیجئے۔ اندھے

کہ پھول سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کا ڈانٹنا شعری سے جا ملتا ہے
 پڑھنے والا دیکھ سکتا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ شاعر جواب دے سکتا
 ہے لیکن فائدہ گار کرنے کے ذرا وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ وہ
 کے سماجی اور سیاسی شعور کی معنوی میل میں کیا خیال رکھنا بہت ضروری
 ہے کہ ہم اس کی ذہنی سطح سے اوپر پرواز نہ کریں۔ ذہنی سطح پر رہ کر
 بھی ہم اپنی ناول کی حقیقت پیش کر سکتے ہیں۔

تیسرا بیان

کہانی کے لئے کچھ بھی ضروری نہیں ہے یہ صرف ایک شعری
 تصویر ہے جو غیر منطقی ہے، اس کے چوکھٹوں کا درست ہونا بھی ضروری
 نہیں ہے۔ اس دعوے کو اس بیان سے تقویت مل سکتی ہے کہ گوئیار،
 بلاٹ اور اسی قسم کی تمام چیزیں صرف موضوع کے ارتقا کو پیش کرتی ہیں
 اس لئے ان کی حیثیت منطقی ہے۔ لیکن جن چیزیں لا شعوری رویہ پیش کرتی
 ہیں گڑھے آتی ہیں۔ ہر ادیب اپنے ہی لا شعوری رویہ کی نقل کرتا ہے وہ
 تخلیق بھی کرتا ہے تو اپنے ہی تخیل سے کام لیتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں
 مقصد کا اظہار نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ بے ترتیبی میں بھی ایک مقصد لپٹا
 ہوتا ہے لا شعوری رویہ کے کھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ لا شعور کی دنیا ایک

۵۲

پڑوسر پرستی ہے جس کا نہ کوئی کنارہ ہے اور نہ ساحل۔ یہ انشائے معنی
 ہے اور جب انشاء کو ایک خارجی جسم دیا جائے تو وہ جرت میں تبدیل
 ہو جاتا ہے۔ انشاء کو قائم رکھنے کی اس سے بڑی اور کیا کوشش ہو سکتی
 ہے۔ صحت ہی کو شاعری سمجھا جاتا تھا ان شہزادوں کو بھی شاعری کا کافکا
 سمجھنے لگے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان شہزادوں میں شاعری کا راسخ
 موجود ہے لیکن بلاغت کے وہی مواقع بتائے جاتے ہیں جہاں قصے
 کے مختلف پہلوؤں کو فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ
 چلتا ہے کہ نہ صرف کام کو دونوں کرنے کی صلاحیت ان قصوں کی
 خوبی کی حامل ہے بلکہ مطالعہ نفسیات اس سے زیادہ اہم ہے اور یہ
 مطالعہ نفس قصے والی شہزادوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ ایسے شعری
 کے مقابلے میں میر حسن کی شہزادی کیونچھی ہے، اس کا جواب ہی مطالعہ
 نفس اور فطری انجانہ ہے۔ میر حسن نے واقعات اور نفسیات کی جارت
 پر زور دیا ہے۔ شہزادی ادھر کینز کے کردار میں کو منفرد حیثیت
 سے پیش کیا ہے۔ تیسرے ایسی ادخلیت کو شہزادوں میں اس قدر اہم
 کر کے پیش کیا ہے کہ وہ قصے کی خارجیت کو دھندلا دیتی ہے۔ کوئی
 بھی ڈرامہ، کوئی بھی ناول یا کہانی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی

جب تک کہ مصنف نے خود کو شعوری طور سے الگ نہ کر لیا ہو۔ وگرنہ
 نور مونس کی تخلیق ہی اس لئے کہ لکھے کہ اپنا قصہ نظر انداز اپنی
 شخصوں کا دل حقیقت کو دوسروں کے سامنے پیش کرے پھر اسے جا
 دیا کہ اردن کے دربار میں ملافت کرنے کی کیا ضرورت ہے جب
 ایک شاعر کسی قصے کی تخلیق کرتا ہے تو اس کی پہلی توجہ موضوع کے ارتقا
 پر رہتی ہے اس نے قصے کو منظوم عبارت میں کیوں پیش کیا؟ اس کا جواب
 یہ نہیں ہے کہ وہ شاعر کی ناکا چاہتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اپنے اندر اتنی محبت
 محسوس کرتا ہے کہ نظم میں نشر کا سزا پیدا کر دے یا پھر وہ منظوم حسیثیت
 سے پیش کرنے کا بھانپنے کے زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ کوئی منظوم ڈرامہ
 کوئی تہی منظوم قصہ، شیعہ اور اسی قسم کے دوسری تخلیقی کوششیں
 صرف موضوع ہی کے مقتضیات پر مبنی جاسکتی ہیں۔ قصا حب
 بیان اور زبان تو بد میں دیکھی جاتی ہے۔ اگر اس تخلیق میں دوچار
 لکھوے شاعری کے اچھے ہیں اور شاعر موضوع کو نہیں نامہ سکا
 ہے تو ہم اس کی پوری کوشش کو ناکامیاب سمجھیں گے۔ بے تجربہ ہیں
 چنانچہ یہ انشاء بہت میں بھی قائم رہتا ہے۔ میل سی کہانیوں
 کو کہانی نہیں مانتا ہوں تا دیکھا انشائیں کوئی (PATTERN)
 نہ دکھا جائے۔ اس کی کوئی خصوصیت نہ دریافت کی جائے۔
 اور اگر (PATTERN) اور سمت پیدا کیا جاسکتا ہے تو یہ انشا
 ٹرے گا کہ یہ ایک شعری کوشش ہے۔ جس میں صرف ناول حقیقت
 کی کوشش کی جاتی ہے اور جب یہ شعری کوشش ٹھیکری تو پھر کوئی وجہ
 نہیں معلوم ہوتی کہ ان کہانیوں میں کہانی بن کیوں نہ دریافت کریں
 کیوں کہ ہر شعری کوشش کا ایک مضبوط ڈھانچہ بھی ہوتا ہے۔ اگر انشا
 کو حقیقت سمجھ کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر حقیقت بھی
 محض بحث میں جاتی ہے۔ یہ انشا کرکس کا ہے مصنف کا یا کسی خاص طبقہ کا
 اگر صرف مصنف کا ہے تو وہ اپنے انشاء سے دوسروں کو کنز شاکر کا چٹا
 ہے۔ یہاں پہنچ بھی نہیں ہوتا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنے انشاء کی تصویر ہی
 نہیں کھینچ رہا ہے بلکہ وہ اپنے اس طرح نظر سے متاثر بھی کرنا چاہتا
 ہے جو انشائیں ان کی تخلیق میں حصہ لے رہا ہے۔ ایسے ادیب کے موضوع
 اور فن دونوں ہی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخری بیان

کہانی کی ایک ناجوہیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی کہانی کہانی
 نہیں کہی جاسکتی۔

قنوطی شاعر

بلوغ کوئل

سسکتی شب کی گھنی سیاہی میں کون آنسو ہمارا ہے ؟
یہ کس کی دھڑکن ہے جس میں ارمان ہوئے ہوئے بلک رہے ہیں ؟
یہ گیت کیسا ہے جس میں آنسو ہیں ، سرد آہیں ہیں ۔ موت کی سی نسر دہی ہے ؟
یہ کیا ہوا ہے کہ اس کی پلکیں زمین پر ذروں کو کن رہی ہیں ؟
ہوئیں شاخوں میں سرسراہی ہیں دور تک تیری ہے تارے بجھے ہوئے ہیں
خفا کے سینے میں چھپی سی ہنسی تھرک رہی ہے ۔

سسک سسک کر بھاری ہے ،
میں اک اشارہ ہوں اپنے خالق کی زندگی کی سیاہیوں کا
میں کج تک ایک عروہ دل کے لبوں پہ نوحہ کناں رہی ہوں
ہوئیں اک دوسری سے بہم یہ پوچھتی ہیں !
یہ کون ہے جو ؟ یہ کون ہے جو ؟

کبھی وہ لمحے تھے جب یہ انسان
چلا تھا بارہ حیات پر مسکراتا ، ہنستا سچیلے گیتوں کے پھول لے کر
اور اپنی پلکوں پر آرزوؤں کے تارے تھامے یہ سوچتا تھا
گلن سے آتے گی وہ بری جو حسین آنکھوں سے جگمگا دے گی اس کی ہستی
اسے مسرت کی مسکراتی حسین کلکوں کے مار ہنائے گی محبت کے گیت گاکر
جوان انگوں کو لگدگما دے گی مسکرا کر

۵۴

گروہ ہنستا بکھر چکا ہے
کہ جیسے غم کی سیاہیوں نے جیل تارے بگل لئے ہیں
اور اب یہ مفہوم ، نیم مردہ سلگتا انسان تڑپ رہا ہے
حیات کی سب سیاہیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر کو تاریکیوں کا مسکن بنا رہا ہے

کوئی اسے کاش یہ بتا دے
کہ زندگی کی بھرتی موجوں میں نغے نغے کروڑوں تنکے بھٹک رہے ہیں ۔
کروڑوں تنکے حسین سینوں کا خون پیتے ہیں ، اپنی آہوں کے گیت سناتے ہیں ، زندگی گزرتے ہیں
کروڑوں تنکے زہن کے سینے پہ بار بار کرتڑپ رہے ہیں
کوئی اسے کاش یہ بتا دے
دبا جلا لو ، غمور گئے مسکن کو پھونک ڈالو ،
اٹھاؤ پلکیں کہ زندگی میں جگمگاہیں بھی ہیں ، روشنی بھی ہے نکشیں بھی ،
افتح کے ماتھے پہ جھلملاتی ہوئی شعاعیں بھی ناچتی ہیں

مگر وہ جھلا کے پر گھڑی یہ مپکارتا ہے ،
مجھے نہ چھڑو ، مجھے نہ چھڑو ،
تنبیں ہر ایک ہوں زندگی کی مسرتیں ، مسکراہٹیں اور چاند تارے
میں اپنی امید کا دیا تک بھانپا ہوں
اور اب تو شاید میں زندگی کا دیا بھی اک دن مجھا کے رکھ دوں !!
ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۴۹ء

فلم لائن اور منشی پریم چند

(منشی پریم چند کے خطوط ہندی کی مشہور ناول نگار جنید رنگار کے نام)

کیریر چٹھیاں فلاں پتہ پر بھی بنا۔ بس بوریا بکبا سنبھالا اور چل
کھڑے ہوئے۔ میں نے تمہارے جواب میں ایک بڑا سا
(DETAILED) مفصل خط لکھا تھا وہ شاید مردہ
چٹھیوں کے دفتر میں بڑا ہو گا۔ (میں نے شاید تبھی لکھا ہے کہ)
مجھے ممبئی کی کمپنی ملارہی ہے۔ کیا صلاح ہے؟ فیجے تو کوئی ہرج
نہیں معلوم ہوتا اگرچہ (شخواہ) ۸۰۰ سولے سال دو سال کر کے
چلاؤں گا مگر ابھی میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ ان کے دو تار چکے
ہیں۔ پر سادھی کی صلاح ہے۔ آپ ممبئی یہ جائیں "تمہاری بھی اگر
بہی رلے ہے تو میں نہ جاؤں گا۔ جو ہرجی کہتے ہیں ضرور جائے
اور طویل مفصلی بھی کہتی ہے کہ ضرور چلے۔ زندگی کا یہ بھی ایک تجربہ ہے
آخر وہ فلم لائن میں گئے ہیں۔ وہاں سے انہوں نے کھانا۔

میں جن اداؤں سے آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں
آتا۔ یہ بروڈوسرجس ڈھنگ کی کہانیاں بناتے آئے ہیں اس
راہ سے جو بھر نہیں ہٹ سکتے ابتداء کی کو یہ تقریبی قدروں سے تقریر
کرتے ہیں۔ سنسنی ہی میں ان کا ہوتا اس ہے راجہ رانی ان کی منتزیا
کی سازش، نقل الوانی۔ بوسہ بازی، یہی ان کے خاص ڈھنگ تھا۔
میں نے سنا جب کہانیاں لکھیں تبھی تعلیم یافتہ سراج بھی دیکھنا چاہے
لیکن ان کو غلامی سے ان کو گولڈن کو شہر ہوتا ہے کہ بھلے یا نہ بھلے۔ یہ سال
تو پورا کرنا ہے ہی ہیں قرض داس ہو گیا تھا، قرض بٹاؤں کا۔ مگر آؤ
کوئی فائدہ نہیں۔ گودان ناول کے آخری صفحے باقی ہیں۔ ادھر
ہی نہیں جاتا دجی چاہتا ہے یہاں سے چھٹی پا کر اپنے پڑا نے
اُسے پر جاتیوں۔ وہاں دھن نہیں مگر سکون ضرور ہے۔ یہاں

پیارے جنید را

تمہارا خط قین اشطار کی حالت میں ملا۔ تم سے صلاح کرنے کی
مذرت آپری ہے۔ ابھی ذباؤں کا۔ جب آؤ گے تب
ہی اس کے متعلق باتیں ہوں گی۔ مگر تمہیں کیوں
ہمہمہ کی حالت میں رکھوں؟

ممبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے ملارہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کرنا
(.....) کی بات ہے۔ ۸ جزا روپیہ سال۔

میں اس دستخط (حالت) کو پہنچ گیا ہوں جب میرے لئے اس کے
سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ با تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے
ناول کو بازار میں بیچوں۔ میں اس معاملے میں تمہاری رائے ضرور
سمجھنا ہوں کمپنی والے حاضر کی کوئی قید نہیں رکھتے ہیں۔
جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے لکھوں، ان کے لئے جاری بائچ
سوسیٹیر پوٹیا کر دوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک سال کے لئے

چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد کچھ ایسا کنڈیکٹ
کروں گا کہ میں ہمیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں
اور راجہ بائچ فرا روپیہ مل جائے گا۔ اس سے جاگیر اور تین
دو تونٹے میں چلیں گے اور بیرون کاسٹنگ کٹ جائے گا پھر
ہماری دونوں کی چیزیں دھڑلے سے نکلیں گی۔ لیکن تم یہاں
آجاؤ گے تب کوئی رائے ہوگی۔ ابھی تو میں دوڑا رہا ہوں۔
اس کے بچوں بعد ایک دوسرے خط میں پریم چند جی نے جینید
کا رکھ لکھا:-

بھلے آدمی مکان چھوڑا تھا تو ڈاکے سے اتنا تو کہہ دیا ہوتا

لے جے شکر مرزا۔ ہندی کے مشہور شاعر ہندی کے مشہور مصنف

ماہنامہ ایشیا فردی ۱۹۴۹ء

تو جیہی پڑتا ہے۔ زندگی بر باد کر دیا ہوں۔
ان ٹھہا ایک سلم بکلا تھا نہ دور اس کا ذکر کرتے ہوئے
ایک خط میں لکھا:-

مزدور نہیں پسند نہ آیا۔ یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے
ایسا کہہ سکتا ہوں۔ نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک
روٹاں جا رہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے۔ میں اس میں بہت تھوڑا سا
ہوں۔ مزدور میں بھی میں اتنا دلہا آیا ہوں کہ نہیں کے برابر، فلم میں ڈاکٹر
سب کچھ ہے۔ ٹیکہ دکھا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں ڈاکٹر کٹر
کی حکمرانی ہے اور اس کے راج میں اس کی حکومت نہیں چل سکتی
حکومت مانے تبھی وہ رہ سکتا ہے وہ ٹیکہ یہ کہنے کی جرأت نہیں
رکھتا کہ میں غلام کے رحمان کو جانتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے اس
کے خلاف ڈاکٹر کٹر دور دے کر ٹیکہ کے کہنا ہے میں جانتا ہوں۔

جنتا آیا جاتی ہے۔ ادھر یہاں جنتا کی مصلح کرتے نہیں رہے ہمارے
کھولا ہے۔ دھن گمانا جلدی غزن ہے۔ جو کچھ جنتا مانے کی وہ ہم دیں گے
اس کا جواب یہی ہے۔ اچھا صاحب ہمارا اسلام لیجئے ہم گھر جاتے ہیں۔

دہی میں کر رہا ہوں۔ ہنسی کے آخر میں کاشی میں بندہ نادول
لکھ رہا ہوں گا اور مجھ میں کچھ نئی ٹکاس سیکھنے کی بھی مصفت ہے۔
نظم میں میرے من کو سکون نہیں ملا۔ سکون ڈاکٹر کٹر کو بھی نہیں
ملتا۔ لیکن وہ ادھر کچھ نہیں کر سکتے۔ جھک مار کر پڑے ہوئے ہیں
میں ادھر کچھ کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگا رہی کیوں نہ ہو اس لئے
چلا آ رہا ہوں۔ میں جہاں سے جتا ہوں اس میں آدھ شش داو
(آؤں لایم بقور پند ہی) گھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے اس میں
تقریبی مصفت نہیں ہوتی۔ میں تب کم کرنا ہوں۔ مجھے آدمی بھی
لیجے ہے جو نہ ہندی جانیں نہادو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے
انہیں کہانی کا خلاصہ بھیجنا پڑتا ہے اور کام کچھ نہیں جتا۔ میرے
لئے انہی دہی پڑائی لائن مرنے کی ہے۔ جہاں لکھا۔

میرا جیون یہاں بھی دیا ہی ہے جیا کاشی میں تھا کسی سے دوستی نہ
کسی سے ملاقات۔ ٹاکسی دوسرے کمال اٹیڈیو گئے گھر آئے ہندی کے دوجا پڑا
کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ بس آخروں فلمی دنیا کو استغنی دے کر پریم
چند جی کو لوٹ آنا چاہا اور اس کے بعد کچھ نیلاہ دن وہ اس دنیا میں نہیں رہتا
(ہنس سے اخوند)

جستِ غبار

باقدر رضوی

۵۶

نوع انسان کو تباہی سے بچا سکتے ہیں
رؤ ہستی میں جو بے فیض ہیں مانند غبار
گلشن دہریں ہیں رنگ پریدہ لیکن
دور کرنے کے لئے پست و بلند ہستی
آج جو مصلحتاً منہ کو سیٹھے بیٹھے ہیں
جن کی نظروں میں ہے مستقبل روشن کاسرور
بغض و نفرت سے یہ دنیا ہے جہنم کنار
ہم زمانے کو رُ راست پہلا سکتے ہیں
ابر رحمت کی طح چرخ پہ چھا سکتے ہیں
ترخ کونین پہ سونا سا چڑھا سکتے ہیں
ہم تہ تیغ و سردار بھی جا سکتے ہیں
کل وہ آفاق میں اک دھوم مچا سکتے ہیں
تقد جہاں تک وہ مسترت سے ٹٹا سکتے ہیں
مہر و اُلفت اسے فردوس بنا سکتے ہیں

پوسٹ ماسٹر

ایگزیکٹو ڈپٹن (۱۹۹۰ء سے ۱۹۸۳ء تک)

روسی افانہ نگاری کے ارتقائی دور میں ان کا ایک نئے میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ایک شاعر تھا اور اس کا شمار یورپ کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ دراصل روسی اور افانہ نگاری میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ سب سے پہلے چٹکن نے اپنے ملک کی افانہ نگاری میں ایک نئے قسم کی باز مراد کی تاریخ جو جدید روسی حقیقت نگاری کی بنیاد بنی، وہ اپنے افانوں میں عام آدمی سے بڑے پیار اور ہمدردی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ چٹکن انقلابی تھا لیکن وہ پہلا روسی افانہ نگار تھا جس نے افانہ نگاروں کا نظریاتی عنصر کا ساتھ دیا اور اس کا نام دے وہ لیٹناتری پند تھا لیکن اسے یہاں لیٹناتی عنصر دھندلا سا ہے جو روایت کے خوبصورت شاعرانہ لباس میں جھلکتا ہے اور اپنے اندر کے دل میں عام آدمی کے لئے ہمدردی فرو پیدا کر دیتا ہے۔

”پوسٹ ماسٹر“ چٹکن کا ایک بڑا مشہور افانہ ہے۔ اس افانے میں ایک میزبانی چوٹی لڑکی کو دیکھ کر پچھلے عیش و عشرت کی خاطر اپنے عاشق کے ساتھ بھاگتا ہے اسے کچھ پورا نہیں کراس کے اس فعل کے اس کے بڑے پائے باپ۔ ایک عام آدمی۔ کی آنکھوں میں آنسو ٹپکتے ہیں۔

عادل

۵۷

چٹکن کی اس کہانی سے روسی کہانیوں کے تجربہ کار ایک سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جو رنگین، ہائاتی، داستانی، گارشین جیٹوف اور گورکی کی کہانیوں پر مشتمل ہوگا۔ چٹکن کے علاوہ روسی افانہ نگاروں کی کہانیوں کا ترجمہ بھی دشوا متر عادل ہی نے کیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کی خوبصورتی اور دلکش کا تعلق ہے۔ روسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کے قابل مہلتے تھے۔ آتے کہانی کی جھیلی کشتی میں تفریق کی طور پر کسی آجانی جہاز لیکن اس مجبوری کے باوجود عادل نے ان کہانیوں کی طرح کو بھانپنے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو ادب کے تخلیقی جذبہ کو صحت و استحکام کے سلسلے میں دھکیلنے کے لئے یہ بنیاد ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ادب خاص کر روسی ادب کو زیادہ سے زیادہ اردو زبان میں منتقل کریں تاکہ ہم اسے نو تخلیقی ادب میں صحت مند عکس صر پیدا ہو سکیں۔

”ادارہ“

صرف اس کا ترجمہ کرتوں سے بچائے رکھتا ہے۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں، میں اپنے ناظرین سے خبر یہ پوچھتا ہوں کہ آخر اس ”ادارے“ کے جس نام کے شہزادہ دیا رسی کے لئے زندہ دلی سے ملتا ہے، فراموش کیا گیا ہے؟ یہ فراموشی کسی قید خانہ میں سترے قید کی ایک عیادت کے مترادف نہیں ہیں؟ دن کو چھ دن رات کو۔ سافر ایک ٹھکانے والے سفر کے دوران میں اپنی رازی جمع شدہ جھللا ہٹاؤ کو فکرت کا نشانہ پوسٹ ماسٹر کو بنا دیتا ہے۔ کیا موسم ناقابل برداشت ہے۔ شکرین خوف ناک ہیں۔ کو چران کندھے کی مانند ڈھیل ہیں؟۔ ہر حرکت کے لئے پوسٹ ماسٹر کو قصور وار ٹھہرا جاتا ہے۔ چوٹی فر کر کے افانہ پوسٹ ماسٹر کی رہائش گاہ میں قدم رکھتا ہے وہ پوسٹ ماسٹر

کون ہے جھلا جس نے ہماری ناک کی سڑکوں کے پوسٹ ماسٹروں کو کبھی دکھا ہوا، اور ان کے ساتھ تو تو میں میں نہ گی ہو؟ جس نے صفحہ کے یکدم لمحے میں وہ خوش کتاب نہ مانگی ہو تاکہ اس کے نادار جب برتاؤ، گستاخی اور لاہر دلی کی بات اپنے اپنے اثر شرمکات یا راج کرتے ہو کون ہے جو انھیں نسل انسان کے اچھوت یا اتنا ذلیل نہ سمجھتا ہو۔ جتنے کراچ کل کی مردہ حکومت کے ششی یا کم از کم جنگلات سمور کے پٹیرے ہو لیکن آؤ ذرا انصاف سے کام لیں۔ آؤ ذرا ہم خود ان کی جگہ لے کر دیکھیں شاید تب ہم ان کے پاس سے زیادہ احتیاط سے رائے قائم کر سکیں گے۔ پوسٹ ماسٹر کیا ہے؟ چند محسوس درجے کے سرکاری ملازمین میں ایک شہید محسوس ہے

کو اپنا دشمن سمجھ لگتا ہے۔ اگر پوسٹ ماسٹر نے بہن بلانے جہان کو جلدی سمجھیں میں کامیاب ہو جائے تو وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ لیکن اگر سونے اتفاق سے گھوڑے نہ ہوں؟۔ خان خدا! کیسی کبھی نہیں کسی کسی دھمکاناں میں بھی ہے پر برساتی جاتی ہیں۔ بارش کی دھڑکیں سے گھر میں بھاگ دوڑ کر رہے رہتے ہو کر کیا جاتا ہے۔ چہیتے ہوئے طوفان اندھا کٹھن ہونے پائے میں وہ بارش پڑھتی (ENTRANCE) میں چلا جاتا ہے۔ تاکہ لوگ کچھ کے لئے اپنے برصغیر علاقہ کی تاریخ کا راز دیکھیں کچھ سے بچ جائے گا کیونکہ یہاں تک کہ بریل آج بھی ہے۔ کاپتا ہو پوسٹ ماسٹر گھوڑوں کی آخری دو دوڑیاں اس کے لئے کر دیتا ہے۔ جن میں بڑے یا بھی شامل ہیں جو سرکاری ہر کام کے لئے مخصوص تھیں۔ جبریل شکر یہ کابیک لفظ کچھ بوجھ گاڑی میں ساتھ رکھ دیتا ہے۔ پانچ منٹ بعد ہی غصی گھنٹوں کی جھلکا رہی دیتی جاوے ہر کام مازہ گھوڑوں کے لئے اپنا حکم نامہ سر پر چمک دیتا ہے۔ اگر وہ ان تمام باتوں پر غور کریں تو ہمارے دل گھٹے سے نہیں جھلکتی ہمدردی سے بھر جائیں گے چند ایک لفظ ادا۔ میں نے بیس سال سے زائد عرصہ تک روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہے۔ میں خرب تریب بھی ڈاک کی رٹوں سے واقف ہوں۔ میں کو جو انوں کی کئی نسلوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کوئی پوسٹ ماسٹر اپنی نہیں نہیں میں پہچانتا نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں مغرب اپنے سفر ناموں کے عجیب غریب نمونے کو چھپوا دوں گا۔ اس وقت میں موت پہی کہوں گا کہ جو میری طرح پوسٹ ماسٹر عوام کی نظروں میں اس قدر تلخ ہے میں نہایت جھوٹے دنگوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سرکاری ملازمین جن کی برائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر سب سے پہلے لوگ ہیں جو فطرتاً بہرہ و ہذا اور ادباً ہی کارگزاریوں کا عملہ مانگتے ہیں غول پرل دہانے مفاد کی خاطر حد سے زیادہ لالچی ہیں۔ ان کی گھنٹوں سے بعض سفر کرنے والے مشر فاعلانہ انداز کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ بہت سی دیکھ اور ڈاک ہا میں معلوم ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں میں اسے سرکاری کام پر جانے والے چھوٹے دنگ کے سرکاری ملازم کی گواہی پر ترجیح دیتا ہوں۔

اس کا اندازہ تو آسانی سے ہو سکتا ہے کہ پوسٹ ماسٹر کی معزز جماعت میں میرا شمار دو ستوں میں ہوتا ہے۔ پانچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی یاد مجھے شہ کی عمر سے ہے۔ ایک دفعہ حالات نے ہم دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور یہ کسی کہانی ہے۔ جس میں اپنے قابل الفت ناظرین

۵۸

کو اسی وقت سنا ناچتا ہوں۔

۱۸۱۷ء میں کچھ عرصے میں مجھے۔ کی حکومت کے دنوں میں ایک ڈاک کی مشین پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا جو اب ناقابل سفر ہو چکی ہے میرا تہ بہت چھوٹا تھا۔ میں ڈاک گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور گھوڑوں کا دلیرانہ انداز کر رہا تھا۔ اسی لئے پوسٹ ماسٹر میرے ساتھ تکلف سے پیش نہیں آتے تھے اور بلا اوقات جس چیز میں مباح سمجھتا تھا وہ مجھے چھوڑ کر کے چل کر باہر لے جاتی تھی، جب کبھی پوسٹ ماسٹر میرے گھوڑوں کو کسی بلند مرتبہ شریف زادہ کی گاڑی میں جوت دیتا تو میں بوجھان اور بد مزاج ہونے کی وجہ سے اس کی کینگی ادا دے دیتی تھی پر غضب ناک ہو جاتا اسی طرح گورنر کے دستروان پر جب تیز فیم خدمت گزار بھی نظر انداز کر دیتا تو اس کے روتے سے مانوس ہونے کے لئے مجھے کافی دیر لگتی اب مجھے یہ بات زیادہ خطرات کے مطابق ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر شمال کی طور پر ریت کی قدر ہوتی چاہئے تھے مرقہ کا قاعدہ سے کھائے کوئی دوسرا قاعدہ مثلاً عقل کی قدر ہوتی چاہئے راج کر دیا جائے تو ہمارا کیا خسر ہو؟ کیسے کیسے جھگڑائے ان کھڑے ہوں لوگوں کو کہیں معلوم ہو کر پہلے کسی کی خدمت کرنی چاہئے؟ لیکن پہلے میں ہی کہانی کو سنالوں۔

آس دن گرمی تھی۔ کی چوٹی سے تین وزرٹ کے فاصلے پر بارش کی لوندیں پڑنے لگیں اور ایک منٹ بعد بارش کی بوجھار نے میری جلد تک بھگو گئی۔ جب میں چونک کر پہنچا تو میں نے پہلی احتیاط یہ کی کہ جلد از جلد اپنے کپڑے بدل لئے۔ اور دوسری یہ کہ چائے لائے کا حکم دیا۔ پوسٹ ماسٹر چلایا۔ "دو دنیا اسکا دارا دوسرے کو دے اور کچھ کریم لے آئے" ہر الفاظ سن کر ایک جودہ برس کی لڑکی ادٹ (PARTITION) کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور بھاگ کر دیوڑھی میں داخل ہوئی۔ میں اس کے حسن کی تاب نہ لا سکا۔

دیکھا یہ بخار سی پڑی ہے؟ میں نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ تیری ہی بیٹی ہے جناب۔ اس نے ہنر و سادہ انداز سے جواب دیا۔ اور کتنی چالاک لڑکی ہے۔ یہ کتنی تیز طرار چھوٹی سی چیز ہے اور اپنی غریب ماں جیسی۔ پھر میرا ہوا نہ راہ دار کی تعلق کرنے لگے جیسا کہ ادا میں ان تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو اس کی حیرت انگیز بے داغ آنکھیں کھل کر دیا اور کو آراستہ کر رہی تھیں۔ تصویر پر ایک مغول خیریت بیٹے کی کہانی سن رہی تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک معزز دیوڑھا آدمی اور ایک شب خواب کی گولی اور ڈرائنگ گل دیکھنے اپنے بے قرار

لخت ہٹ کر اودار کر رہا تھا۔ جسے مرنے ہی نہ تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ وہ اپنے باپ کی دعا میں اور اپنے پیسے کی تحلی حاصل کر لے۔ دوسری دفعہ زور زور زور زور زور میں اس نے جوں آدمی کی بدھ میں زندگی کی تر جمانی کر رہی تھی کہ وہ ایک بزرگے باس جھوٹے دھنیا اور بے شرم عورتوں سے گھرا ہوا بیٹھا ہے۔ اگلی دفعہ اس نے جوں کو جواب دیا ہر جکا تھا۔ ٹاٹ کے کپڑے اور سر پر ایک آدھی ٹوپی پہنے اور سو دھڑوں کو خود اک دینے۔ اور ان کی خوراک میں حصہ ہٹائے ہوئے دکھائی تھی۔ اسی کے چہرے سے عزم اور مذمت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخری تصویر اس کے دہن کے اندر کی نمائندگی کرتی تھی۔ سبز بوڑھا آدمی پہلے کی طرح وہی دلکش گادن اور وہی شب خواب کی ٹوپی پہنے ہوئے اس سے ملنے کے لئے بھاگا جلا آرہا ہے۔

دفعہ اول خیر بٹیا گھنوں کے بل بیٹھا ہے۔ پس نظریں مادر جی ایک مڑا ہٹ کر ادھر ادھر کر رہا ہے۔ ہر تصویر کے پیچھے میں نے خرس زبان میں اشعار لکھے جو موضوع کے شایان تھے۔ یہ سب کچھ آج بھی میرے ذہن میں سی طرح باقی ہے جسے کوکل ہندی کے لکھے اور رنگ برنگی جھاروں دلا بستر اور دوسری چیزیں جن سے میں اس وقت گھرا ہوا تھا جن میں چشم بقصد سے اب بھی اس پوسٹ ماسٹر، اس بچاس برس سے اوپر، نمازہ جلد لے اور طاقت ور آدمی کو ایک لباس رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے دیکھ سکتا ہوں جس کے اوپر تین دھندلائے ہوئے فیٹوں کے ساتھ تین گتے ٹکے ہوئے تھے۔

میں نے ابھی اپنے پیسے کو جان کا حساب چکا یا ہی تھا کہ دُنیا سدا دار مٹاتے ہوئے لوٹ آئی۔ وہ تھی غوثہ گر جھیر بر دوسری بار ایک سرسری نظر ڈالتے ہی مجھ پر تھی کہ اس نے مجھ پر کیا اثر ڈالا ہے اس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جھکائیں۔ میں لوگ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے جوابات میں میں نے قسم کا جواب نہیں تھا، ایک ایسا کس شخصیت کو بے نقاب کر رہا تھے۔ جسے زندگی کا تھوڑا سا تجربہ تھا۔ میں نے اس کے باپ کو شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ دُنیا کو میں نے جانے کا ایک بار دیا۔ اور ہم دونوں تھوڑی ہی دیر میں اس طرح گپ شپ کرنے لگے۔ گویا ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے گھوڑے کافی دیر پہنچتی جوتے جا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں پوسٹ ماسٹر اداس کی پہلی سی رخصت ہو جاؤں۔ آخر کار میں نے خیر باد کہی۔ اُس آدمی نے نیچا اچھے سفر کی دعا دی اور اُس کی جیبی مجھے گاڑی تک چھوڑنے لائی۔ میں ڈیوڑھ میں

ڈھک گیا۔ اور اس سے بوسے کی غیر باتش کی۔ ٹوڈیا مان گئی۔ میں ہسٹ سے بوسے گن سکتا ہوں۔

”اُس دن سے جب کہ میں پہلی بار اس شرارت میں طاق ہوا تھا لیکن اُن میں سے ایک بھی تھی۔ یہاں اور اتنی خوش گوار یا دیر سے دل میں نہیں چھوڑ گیا۔

کئی برس گزر گئے۔ اور حالات ایک بار پھر مجھے ڈاک کی ٹرک پر انھیں مقامات پر لے گئے۔ مجھے پوسٹ ماسٹر کی جیبی کی یاد آتی اور اُس سے دوبارہ ملاقات کرنے کے خیال سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا، لیکن شاید پوسٹ ماسٹر بدل گیا ہو اور دُنیا غالباً اب ایک شادی شدہ عورت ہوگی۔ یہ خیال بھی میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ شاید اُن میں سے ایک سر جکا ہو اور میں دلی میں ٹکراؤ لیتے ہوئے چوکی کے قریب ہوتا گیا۔ گھوڑے ڈاک گھر کے پاس آکر ٹک گئے۔

میں نے گھر سے داخل ہوتے ہی خود دفعہ اول خیر بیٹے کی کہانی کی تر جمانی کرنے والی تصویروں کو سچا لیا۔ میرا دل بستر اپنی پرانی جگہوں پر پڑے تھے۔ لیکن اب کپڑوں میں بھول نہیں تھے۔ اور اُس پاس کی ہر چیز نرل اور لاہر والی کی داستان سنا رہی تھی۔ پوسٹ ماسٹر ایک بیٹری کی کھال کا کوٹ اوڑھے ہوئے تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ جاگ پڑا اور بے سچ سے اٹھ بیٹھا۔

”وہ اسمیں راسٹر نہ تھا۔ لیکن وہ کتنا بوڑھا ہو گیا تھا جب وہ میرا پروانہ راہ دار کی نقل کرنے میں مشغول تھا۔ تو میں نے اس کے سفید بالوں، اس کے ایک عرصے سے بے حجامت چہرے کی ٹھنڈوں، اس کی ٹھنکی ہوئی پشت کو دیکھا۔ اور اس بات پر حیران ہوئے نیز درہ سلا کہ کس طرح تین چار برس میں ایک طاقت ور انسان کو ایسا عرصہ سید شکستہ ٹوٹا کر بنانے کے لئے کافی ہیں۔ کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ میں نے پوچھا۔ ہم پرانے مٹنا سنا ہیں۔ بوڑھے آدمی کو گھٹے پن سے جواب دیا۔ نے شک۔ یہ ایک جلتی ہوئی نرک ہے۔ یہاں سے بے شمار سفر گزر رہے ہیں۔“

”تمہاری بیٹی تو اچھی ہے؟“ میں نے سدا جی رہا۔

”بوڑھے آدمی نے تھوڑی چٹ خالی۔ خدا جانے اُس نے جواب دیا!

”شادی ہوگئی ہے میرے خیال میں۔“ بوڑھے آدمی نے لبا لبا ہر کیا گویا اس نے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ اور منہ ہی منہ میرا

پروانہ راہ داری پڑھتا گیا۔

میں نے اپنے سوالات مندرکڑیے اور کچھ چائے منگوائی۔
شوق تحقیق میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ مجھے امید تھی
کہ شراب کا ایک قطرہ میرے روست کی زبان گھول دے گا۔
یہ نامی نہیں تھا۔ جو گلاس میں نے اسے پیش کیا پوچھے
آدمی نے اسے لینے سے انکار نہ کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ نرم نے
اس کے روکے تن کو دوڑ کر دیا۔ دوسرے گلاس کے بعد وہ گھل
کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے پہچان لیا یا یہ کہا کہ اس نے پہچان
لیا ہے۔ اور میں نے اس سے ایک سہائی سنی۔ جو مجھے دیکھتے معلوم
ہوئی۔ اور جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔

”اچھا تو آپ میری د دنیا کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ آہ!
دونیا۔ دنیا! ایسی لڑکی تھی وہ! جس کی دوا دھر سے گزرنے
کا اتفاق ہوتا وہ اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اور کوئی بھی
اس کے خلاف ایک سخت لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ خواتین اسے
تھکے دی کرتی تھیں۔ کوئی اسے لال رو مال دیتی۔ کوئی کانوں کی بالیا
دھر سے گزرنے والے (GENTLEMEN) شریف زلفے
اس پرانے سے کہ انھیں ڈرنا سہجہ چاہئے۔ جان بوجھ کر ٹھہر جاتے
لیکن دراصل صرف اس لئے کہ اسے ٹھوڑی دیر اور دیکھ لیں
مسافر گنتا ہی راضی ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا اور جھج
سے نرمی سے بات کرتا۔ دوا سوچتے تو جناب؟ نامبر و در بنیم
لے جانے والے سوار تک اس سے آدھ آدھ گھنٹہ بات کرتے
سائے گھر کا بوجھ اس کے کانچوں پر تھا۔

کیا صاف کرنا ہے؟ کیا تیار کرنا ہے؟ آسے ہر جز کا خیال
رہتا۔ اور میں بوڑھا بائیں جو تھا، اس کی کافی قدر نہ کر سکتا۔ اس
سے کافی مسرت حاصل نہ کر سکتا۔ کیا یہ لاپسی دونیا سے پیار نہیں کرتا؟
تھا۔ کیا میں اس کی پیشی کو دل سے نہیں چاہتا تھا؟ کیا وہ میرے
ساتھ خوش نہیں تھی؟ نیز انسان اپنی قسمت سے نہیں بھاگ سکتا
جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے۔

میں اب پنج کردہ مجھے اپنی بد قسمتی کی تفصیل سناتے لگا۔ تین
برس پہلے پشوراک ایک خاتم کو جب پوسٹ ماسٹر ایک نئے
روزنامے پر لکھیں گھنچ رہا تھا۔ اور اس کی بیٹی روٹ کے
پیچھے اپنے لئے ایک نیا ذراک سی رہی تھی، ایک گاڑی آکر تہ کی
لہہ ایک سرکاستین چوٹی والا مسافر ایک بڑا فوجی کوٹ پہنے اور

۶۰

گھلے کا مدگرد ایک گلوبند لٹے کرے میں داخل ہوا اور اس نے
گھوڑوں کا مطالعہ کیا۔ خاتم گھوڑے باہر نکل کر جا چکے تھے۔ یہ
سن کر مسافر نے آواز دہرایا گاڑی بند کر دی وہی والا تھا کہ دنیا جیسے
واقعات کی عادی تھی۔ اوٹے کے پیچھے سے بھاگ باہر نکل پائی اور
اس نے بڑے تحمل سے پوچھا کہ کیا سائیکو کھانا نہ نہیں کرنا
دنیا کی آمد کا حسب قول اثر ہوا؟ مسافر تھکا ہوا گھوڑوں کا انتظار
کرنے پر راضی ہو گیا اور اس نے کچھ سہرنگوایا جب اس نے اپنی گلی بالور ٹوٹی
آنا دیکھ کر گھنڈ گھول دیا اور اپنا پاؤٹ جھٹکا کہ جسے الگ کر لیا تو وہ
ایک گھوڑے جم اور چھوٹی چھوٹی برقعوں والا کسی فوجی رسالے کا فوجانہ ثابت ہوا
وہ آکر ملے ایک چھوٹی گریس پر مشہد گیا۔ اور پوسٹ ماسٹر۔۔۔۔۔
اور اس کی بیٹی نے ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا۔ سہجہ جن دیا گیا
اس آشنا میں گھوڑے بھی آگئے تھے۔ اور پوسٹ ماسٹر نے حکم دیا
کہ انھیں کچھ کھلانے بغیر خود اس سفر کی گاڑی میں جوت دیا جائے
لیکن جب وہ محسوس داپس لوٹا تو اس نے فوجانہ آدمی کو بھونکی کی
حالت میں بیخ پر لیٹے ہوا پایا۔ وہ بیمار لگ گیا تھا۔ اس کا سر مٹھا ہوا
تھا۔ اس کے لئے سفر جاسی رکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیا
کیا جاسکتا تھا؟ پوسٹ ماسٹر نے اناستاز سے دے دیا اور یہ طے
بایا کہ اگر گریار آدمی کی حالت اگلی صبح تک بہتر نہ ہوئی تو ڈاکٹر کو بلا
کئے لئے کسی کو شہر بھیجا جائے گا۔

اگلے دن سوار کی حالت بدتر ہو گئی۔ اس کا ذکر گھوڑے
برسوار ہو کر ڈاکٹر کو لائے شہر گیا۔ دونیا نے میرے سین بھگوتی
ہوئی تھی اس کے سر پر بانڈھی۔ اور اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر کوسٹائی
کرنے لگی۔ جب تک پوسٹ ماسٹر وہاں رہا۔ بیمار آدمی کرنا رہا
اور اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ تاہم اس نے ہتھو
کے دو پیالے پی لئے۔ اور کراپتے کراپتے کچھ لچھ لچھ لائے لاکھ دیا۔
دونیا اس کے پاس سے نہ اٹھی۔ وہ بار بار کچھ بولنے لگی
اور دونیا اپنے ہاتھوں سے تیار رکھتے ہوئے لیٹ کر رہی ایک
مراجمی اس کے پاس لے جاتی۔ بیمار آدمی اپنے ہونٹوں کو تر کرتا
اور جب بھی وہ مراجمی واپس دیتا۔ وہ اظہار تک نہ کئے لئے
دونیا لاکھ لاکھ اپنی کندھوں کی گلیوں سے دبا دیتا۔ لچھ کے وقت
ڈاکٹر آگیا۔ اس نے مراجمی کی تضحی دیکھی۔ جس میں زبان میں
اس سے باتیں کیں۔ اور دیکھی زبان میں اعلان کیا کہ مراجمی
آدمی کو صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ اور وہ چند ایک

درخواست کی کہ جناب والا کو اطلاع دی جائے کہ ایک بوڑھا فوجی اُن سے ملنے کی خواہش کرتا ہے، سائینس، جو درخت پر ایک جوتا رکھ کر اُسے پالش کر رہا تھا۔ جواب دیا کہ اس کا نام سورما ہے اور گیارہ بجے سے بیٹھ کسی سے نہیں ملتا۔ پوسٹ ماسٹر چلا گیا اور مقررہ وقت پر واپس آگیا۔ مینکی شب خرابی کا بارہ اور سر پر ایک شیشہ دھک کی ٹوٹی ہوئی پینے والا اس سے ملنے کے لئے باہر آیا۔ کیوں بے تحاشے کیا جائے؟ بوڑھے آدمی کا دل کھول اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں صرختا کہہ سکا۔

”جناب والا۔ خدا کے لئے۔ ہر باری کر کے۔“ مینکی نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی مینکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پوسٹ ماسٹر کا ہاتھ پکڑا۔ اُسے اپنی مٹا لنگوٹ میں لے گیا اور کچھ سے دروازہ بند کر دیا۔ جناب والا، بوڑھے نے بات جاری رکھنے ہوئے کہا۔ ”جو جھکڑے سے گزریا وہ کھو گیا، وہ گم ہو گیا۔ کم از کم سری غریب د دنیا کو تو مجھے داپس دے دیئے، آپ اس لڑکی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ اُسے ملا جس تباہ تو نہ کیجئے؟ اب پھٹلے کیا ہوتے، جب جڑیاں چھانگنیں کھیت، تو جڑیاں آدمی نے سرسہ ہو کر کہا، میں نے تمھارے حق میں برا کیا ہے۔ اور مجھے تم سے معافی ضرور مانگنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل میں لاؤ کہ میں دنیا کو چھوڑ دوں گا۔“

یہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رہے گی، وہ تمھارے پاس واپس کیوں جائے؟ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے گزشتہ حالات کو بھلا چکی ہے۔ جو کچھ ہو گیا ہے، اُسے وہ باہم کبھی نہیں بھلا سکے گا۔ پھر اس نے بوڑھے آدمی کی آستین میں چپکے سے کچھ ڈال کر دروازہ کھولا پوسٹ ماسٹر نے جانے کی طرف پھوٹا اپنے آپ کو گلی میں پاپا۔

بڑی دیر تک وہ بے حس حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کی نظر اپنی آستین میں ایک لپٹے ہوئے کاغذ پڑی۔ اس نے اُسے باہر کھینچا اور پاس پاس بڑبڑ کے چند..... مڑنے سے ہوئے۔ نوٹ کھولے۔ ایک بار پھر آنسو۔ غم و غصہ کے آنسو۔ اُس کی آنکھوں میں بھرا آئے۔ اس نے نوٹوں کو توڑ کر ایک گیند بنایا۔ انھیں زمین پر بڑے مارا۔ انھیں دھڑکاتے رہنے دیا اور بنا رہا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور جانے کے بعد وہ نکلا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ اور

اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اب نوٹ دہان نہیں تھے، ایک خوش پوش جوان آدمی اُسے قریب آئے دیکھ کر ایک گاڑی کی طرف لپکا اچھل کر اندر چلا گیا۔ اور چلا جائے چلو، پوسٹ بیٹے اُسے پکڑنے کی کوشش نہ کی اس نے کہا اُردو کر لیا کہ وہ والیج جا کر دوبارہ نوکری کرے گا۔ لیکن اُس سببی میں آئی کہ کیا کرنے سے بیٹے اُسے اپنی خوب دُنیا سے آخری مرتبہ مزد مل لینا چاہئے، اس امید کو دل میں لے کر وہ دونوں کے بندھن کی کٹی جائے۔ پالش پر پہنچا لیکن سائینس ٹینک کراس سے کہا کہ اس کا مالک کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُسے نکال باہر کیا۔ اور اس کے پیچھے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ پوسٹ ماسٹر تھوڑی دیر باں کھڑا رہا۔ اور پھر اُس نے اپنا راستہ لیا۔

اُسی دن شام کو وہ چرچ آئی اٹھ کھڑا (CHURCH OF ALL SAINTS) کے گھر چلا گیا۔ پوسٹ ماسٹر نے بعد لٹینا سرٹ پر چل رہا تھا کہ ایک خوبصورت گاڑی اُس کے قریب سے تیزی سے گزری۔ اور اُس نے اُس گاڑی میں مینکی کو پہچان لیا۔ گاڑی ایک سرسبز مکان کے دروازے پر ٹکی۔ اور فوجی ڈورڈر سیر ہونے پر چڑھا۔ پوسٹ ماسٹر کے ذہن میں ایک ستر خیز خیال دوڑ گیا۔ وہ واپس پڑا۔ اور جوان کے پاس جا کر اُس نے پوچھا۔ بھائی یہ گھوڑا کس کا ہے؟ کیا یہ مینکی کا تو نہیں؟ تو ٹھیک کہتا ہے۔ کو جوان نے جواب دیا۔ لیکن مجھے اس سے کیا بات ہے کہ تمھارے آگے مجھے ایک رقم اس کی دنیا تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور میں دانا گیا لیکن یہ بھولی لیا کہ وہ رہتی کہاں ہے؟

دارے ٹھیک ہیں۔ دوسری نمری پر۔ لیکن بھائی تو رقم لے کر دیر سے پہنچا ہے، وہ اُسی کے پاس خود پہنچ گیا ہے۔ دیکھ کر وہ انھیں، پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔ ہر باری، جو تم نے یہ بتا دیا لیکن مجھ سے جو کہا گیا ہے۔ مجھے ضرور کرنا چاہئے۔ اور یہ کہ گزشتہ مکان کے اندر داخل ہوا اور سیر ہوں پھر چڑھ گیا۔

دروازہ بند تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ تک یہ انتظار میں گزرتے۔ قفل چل گیا کئی نے رینگھائی اور دروازہ کھل گیا۔ اُس نے پوچھا۔ کیا او دنیا سیدو نونا، یہاں ہتی ہے؟ ہاں میں ہتی ہے؟ تو خیر تو کوئی نے جواب دیا؟ تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ پوسٹ ماسٹر جواب دیتے ہوئے اندر چل دیا۔ بخیر، بخیر، لڑکی اس کے پیچھے چلائی اور دنیا سیدو نونا کے پاس ملاقاتی ہیں۔

لیکن اس کی بات پر کوئی وجہ بخیر پوسٹ ماسٹر کے بڑھ گیا۔ پہلا

گروں میں اندھیرا تھا۔ لیکن تیسرے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے تک پہنچا اور رنگ گیا۔ خوبصورتی سے سجائے ہوئے کمرے میں مینسکی سوچ میں گویا ہرجا بیٹھا تھا۔ دنیا جہرید ترین فیشن کے کپڑوں میں ملبوس، اس کی کمری کے بازو اس طرح بیٹھی تھی گویا ایک نئی کلاسیکی ٹیڈی بونٹ خاتون۔ وہ اپنی چمکی ہوئی آنکھوں کے گرد اپنے بالوں کے کالے گھونٹوں کو لپیٹی ہوئی ہنسکی کٹھنی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کی ماس تھ۔ حسین بھی نہیں دکھائی دے گی۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتا ہوا رہا۔

یہ کون ہے؟ اس نے سر اودھائے بغیر پوچھا۔ پوسٹ ماسٹروں نے کہا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا۔ اور ایک نوجوان مگر خالص پروٹسٹم سے گڑبڑی نیکی گھبرا کر اسے اٹھانے کے لئے دیکھا۔ پھر بوڑھے آدمی کو دروازے میں دیکھ کر اس نے دو دنیا کو چھوڑ دیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔

”مجھے کیا چاہیے؟“ اس نے دانت پیس کر کہا، تو ایک ڈاکو کی طرح میرے پیچھے پیچھے کچھ کچھ رہتا ہے؟ کیا تو میرا گلا کاٹنا چاہتا ہے؟“

نکل جا، یہاں سے۔“ اور اس نے بوڑھے آدمی کے کوٹ کا کالر اپنی کلاقت و روشنی میں پکڑ کر اسے دھکا دے کر سڑک چوں پر پھینک دیا۔ بوڑھا آدمی پانی چاہنے پر ہلش کر لوٹ آیا۔ اس کے دوست سے اسے رپٹ کھانے کا مشورہ دیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر نے ٹھوڑی دیر بعد چاؤ مایوس ہو کر پانی اچھڑا دیا۔ اور کسٹمیش کو کچر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن بعد وہ پشیمیر سے چلا آیا اور داپل اپنی چوکی کو لوٹ آیا۔ جہاں اس نے اپنے ذرا لعلن دو بارہ سنبھالی لئے۔

اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا یہ تیسرا سال ہے جو میں دنیا کے دیگر گزرا رہا ہوں۔ اور اس کی طرف سے یا اس کی بابت ایک لفظ نہیں سنا وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے، صرف خدا ہی کا خلیفہ ہر قسم کی باتیں واضح ہوتی ہیں وہ سب سے پہلی لڑکی نہیں اور نہ ہی وہ سب سے آخری لڑکی ہوگی، جیسے ایک حرام مزادے مسافر نے اغوا کیا۔ پتھر اور مراد اپنے ساتھ رکھا اور پھر اسے زندہ کر دیا۔ سینٹ پیٹرک میں اس قسم کی بے شمار زوجان موجود نظر آتے ہیں۔ آج ریشم و کتاب میں ملبوس اور کلیم انہیں ملے کے (Taverns) گندمی عورتوں کے ساتھ گلیوں کا گڑا کرکٹ صاف کرتے ہوئے پاؤں اگے کر تھوڑی دیر تک کمرے میں گھومنے کو شاید دو دنیا کا انجام بھی دیا ہی ہوگا۔ تو تم گناہ کلمہ نہیں رہ سکتے۔ اور تمہیں یہ خواہش بھی ہوگی کہ کاش وہ مرگئی ہوتی۔

یہ کہانی تھی جو میں نے اپنے دوست بوڑھے ماسٹر کی زبانی سنی ایک لمبی کہانی جس کا سلسلہ کئی بار آنسوؤں کے ٹوڑے یا جھپٹے اس نے میری طرف کی دلا دینا چار سبب کے دفا دار کردار تین تین کی طرح اپنے کوٹ کے کپڑوں سے دکلش انداز سے پوچھ دیا۔ یہ آنسو کی حد تک شراب کی وجہ سے بھی نکل گئے تھے جس کے باعث کلاس س نے کہانی سنانا کے دوران میں حلقے سے اپنے اتار لئے تھے، لیکن پھر بھی پوچھ کر ان کا گہرا اثر پڑا۔ اس سے رخصت ہونے کے بعد دیر تک میں بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو بھول نہ سکا۔ ٹری دیر تک میں بچاری دو دنیا کی بابت سوچتا رہا بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جب میں — کے قحبہ سے گزر رہا تھا کہ مجھے اپنا دوست یاد آگیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوکی جو اس کی نگرانی میں تھی، اب ہٹا دی گئی ہے کیسے جب میں نے یہ پوچھا کہ کیا پوسٹ ماسٹر اب تک زندہ ہے یا نہیں تو کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ چنانچہ اسی جانی پانی جگر جانے کا ارادہ کر لیا۔ چند گھنٹوں کے کرائے پر، لے اور ان کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

خزاں کا موسم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سپر بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جھنڈا دار کھیتوں کی جانب سے خشک ہواں رہی تھی، ورنہ خزاں سے گھمراہی ہوئی ان سے سرنے اور پیلے پتے چھینتی ہوئی — میں گاؤں میں اس وقت پہنچا جب سورج ڈوب رہا تھا اور میں ڈاک کی چوکی کے سامنے ٹوک گیا۔ اسی دروازے سے ... جہاں ایک بار دو نیانے مجھے چڑھا تھا۔ ایک کوئی دیہاتی عورت نکلی جس نے میرے سوالوں کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ بوڑھے پوسٹ ماسٹر کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے، اور اس کے گھر میں ایک شراب کشیدہ کرنے والا آگیا ہے اور وہ خود اس شراب کشیدہ کرنے والے کی بیوی ہے۔ مجھے اپنے مصروف سفر اور ان سات دہائیوں پر جو میں نے بے کار خرچ کر دیے تھے، انوس ہونے لگا۔

”وہ کس چیز سے مرا؟“ میں نے شراب کشیدہ کرنے والے کی بیوی سے پوچھا۔

”شراب، جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ دنیا کہاں گیا ہے؟“

”گاؤں کی ہر ماہی بیوی کے پاس،“

”کیا مجھے کوئی اس کی قبر تک لے جا سکتا ہے؟“

”ہاں۔“ کیوں نہیں اور نیکی! اپنی کوئی ننگ کر چکا ہے تو ان صاحب کو قبرستان لے جا اور انہیں پوسٹ ماسٹر کی قبر دکھائے،

یہ الفاظ سن کر بیٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک کانادا
سرخ بالوں والا لڑکا بھاگ کر گھر سے نکلا۔ اور مجھے کھاؤں سے
باہر لے گیا۔

”کیا تم پوسٹ اسٹرک جانتے تھے؟ میں نے چلتے چلتے پوچھا
”بے شک میں جانتا تھا۔ خدا اس کا بھلا کرے! اس نے
مجھے سرکنڈوں کو کاشنا سکھایا۔ وہ سرائے سے باہر نکلتا اور ہم
پچھلے سے اُسے یہ کہتے تھے ”دادا جان! دادا جان! ہمیں کچھ خریدا
دو“ اور وہ ہمیں آخری دقت بھی دیتا۔ وہ سارا دقت ہم سے نقلیتا
رہتا تھا،

”کیا مسافر بھی ایک اس کی بابت باتیں کرتے ہیں؟“
”نہیں، ان دنوں زیادہ مسافر نہیں آتے۔ نیا لٹ کبھی
کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ لیکن اس کے پاس تیرہ لوگوں کے لئے
دقت نہیں ہوتا۔ پھر کبھی اس بارگزیوں کے موسم میں ایک خاتون
اس طرف آتی تھی۔ اور اس نے سچ بچ بوڑھے پوسٹ اسٹرک
باسے میں پوچھا۔ اور وہ اس کی قبر پر بھی لگی۔“

”وہ کس قسم کی خاتون تھی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ لڑکے نے جواب دیا
”وہ تین ننھے بچوں اور ایک آیا اور ایک کالے رنگ کے
ننھے کو ساتھ لئے چھ گھنٹوں والی گاڑی میں آئی۔ اور جب اُسے
بتایا گیا کہ لڑکا پوسٹ اسٹرک پر چکا ہے تو وہ بھونٹ بھونٹ کر
روتے لگی۔ اور بچوں سے کہنے لگی۔ ”تم آرام سے بیٹھو۔ میں
قبرستان جاتی ہوں۔“ میں اُسے لے جانے کے لئے اپنے آپ کو

۹۴

پیش کرنے لگا تھا، کہ وہ خاتون کہنے لگی۔ ”میں خود رانستہ
جاتی ہوں۔ اور اُس نے مجھے چاندی کے پانچ ہوپک دیئے
— ایسی ہیریاں خاتون تھی وہ؟“

”ہم قبرستان پہنچ گئے۔ نصف زمین کا ایک ٹکڑا تھا
باڑہوں سے خالی۔ جس پر لکڑی کی ملبیوں نے ننھے ڈال رکھے
تھے۔ اور جس پر اور کسی دقت کا سایہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں
میں ابا ابا قبرستان بھی نہیں دیکھا تھا۔“

”یہ رہی بوڑھے پوسٹ اسٹرک قبر لڑکے کے رب کے ایک
ڈیو پر کوڑے ہوئے کہا۔ جس کے اوپر ایک پیل کے نیچے والی
کالے رنگ کی صلیب ابھری ہوئی تھی۔“
”کیا وہ خاتون یہیں آتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں جناب۔“ ذہنکلا جواب دیا۔ ”میل سے دور سے دیکھ
رہا تھا۔ وہ یہاں لوٹ گئی اور بری دیر تک لٹی رہی۔ پھر وہ
واپس گاڑی میں لگی، اس نے پادری کو بلوایا اور اُسے کچھ نقدی
دی۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دی۔ لیکن مجھے اُس نے چاندی
کے پانچ ہوپک دیئے۔“ وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔

”میں نے بھی اُس لڑکے کو پانچ ہوپک دیئے۔ اور مجھے
اپنے سفر پر ان سات روپوں پر جیس نے خرچ کر دیئے ذرا
بھی انوس باقی نہ رہا۔“

”کتاب پبلشرز فیلڈلے میڈی کے شکرے کے ساتھ زیر طبع کتاب
”روسی ادب کی ایک کہانی“

مولانا ابوالکلام آزاد

متواتر روایات

”انسان کدما غمناقی کی راہیں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی
عقاد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح بکلا نہیں کر سکتی ہے جس طرح
تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ
نہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں وہ انھیں زنجیر
کی طرح محب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ ہر عمل، ہر نقطہ نگاہ جو اسے

خاندانی روایات اور تبدیلی تعلیم و محنت کے ہاتھوں لگ گیا ہے اس کے لئے ایک
مقدس شے ہے۔ وہ اس روشنی کی مخالفت کرے گا۔ گھڑے چھوئے کی حرأت
نہیں کرے گا۔ یہاں اوقات موردنی مقام کی بکلا تھی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم
اور مگر وہ پیش کا اثر بھی اُسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔ تعلیم دفاع پر ایک نیا
دنک چڑھا دے گی لیکن اس کی بنا دے گا اند نہیں اترے گی۔ بناوٹ
کا اندیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متواتر روایات ہی کا احوال کام کرنا چاہیگا،

ماہنامہ ایشیا فردی ۱۹۹۹ء

زاوے!

قرہاشی

بھٹک رہے ہیں ابھی کارواں غریبی کے لرز رہی ہے جیسے آسمان و اُنجم کی
ترس رہے ہیں خوشی کیلئے ہزاروں دل ابھی لبوں..... کو اجازت نہیں تُمہ کی

ابھی تو ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں گلشن پر ابھی تو خار بھی پھولوں پُسرکراتے ہیں
ابھی چمن ہیں خراب جہاں رنگ و بو ابھی تو مہر کا ذرے بھی مُنہ چڑاتے ہیں

ابھی نظامِ قتیلِ تبسمِ زر ہے ابھی ہوس کی نگاہوں میں ہے تنومندی
ابھی حکومتیں اخلاص پر نہیں قائم نصیبِ طبقہِ عمال ہے برومندی

ابھی ہمارے شب و روز ہیں الم بردوش ابھی غریب کی کُٹیا میں ہے اندھیرا ہی
ابھی تو راجِ دُلا رے نہیں کبے کل ہیں ابھی عزیز ہے اُن کو یہ دکھ بسیرا ہی

ابھی ہمارے ارادے ہیں برپاشگست نہ آسکے گی ہمیں راسِ ظلمتوں کی بہار
ابھی تو بھوک کی بستی میں ایک پلچل ہے ابھی عوام کی دُنیا ہے درخورِ آزار

ابھی بہارِ اسیرِ خزاں رہے شاید

حیات اور جراحتِ نشان رہے شاید

فانی کے نظریہ حیات کا اثر ان کی شاعری پر

ایک برسے فن کار کا درجہ پائے گا۔ جس نے زندگی کو پورے طور پر اپنا
ہر ممکن رخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہو اور جس کی تخی تخلیق میں زندگی
کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے بے غما
کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس میں زندگی کا ہر سایہ، ہر حرکت اور ہر
رنگ نظر آئے اور جس میں ایک دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی مخلوق کے
دل کی دھڑکن پہنچنے سنائی دے۔

آرٹ کے اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر فانی کے کلام
کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ انھوں نے اپنے نظریہ حیات کے اثر سے
جن موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ نہایت محدود تھے اور
زندگی کا کوئی زندہ اور وسیع حقیقی عالم سامنے پیش نہیں کرتے
فانی کے موضوعات شاعری کے مسئلے میں جاما ذہن سب سے
پہلے ان کے محبوب ترین موضوع غم کی طرف متعلق ہوتا ہے۔ شاعری میں
رج و خم کا بیان ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ انسان ان نوع میں حوادث محسوس
کرتا ہے جن میں گداز ہو، درد کی کنگ ہو مگر غم نفع کی زندگی نہیں ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان ہنسنا کم اور رونا زیادہ ہے۔ اگر
کوئی توپھوں اور آندوں کا ایک ترازو میں تولے تو آندوں کا پلڑا بھاری
رہے گا۔ یہ بیان زندگی کا نہ صرف ایک کائنات پر پیش کرتا ہے بلکہ انھیں
بھی ہے۔ یہ بیان حقیقت سے قریب تر ہو جائے گا۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ

فانی اردو کے ایک اکمال مگر بد نصیب شاعر تھے انھیں پنج شہر کا
بندہ بندھا تھا۔ ان کی شاعری میں وہ محک دمک اور وہ خود گنار کی وہ خود
تساری تو نہیں ملتی جان کے بعض اہم عسروں کے یہاں نظر آتی ہے لیکن
اس میں تخی خوبوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کی طرز ادب میں پرکاری اور اسالیب
بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور کسی قدر گہرائی بھی
گہرائی اس لئے کہ انھوں نے فکر اور جذبہ کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش
کی اور دیگر لائق اس لئے کہ وہ خالص شاعری کے قائل تھے۔ اور اس خارجی
آب و رنگ یا شہریت کو ضرور خیال کرتے تھے، جو شہر میں جیتی ہوئی
اور رنگین پیدا کرے، جس میں ایک تیسری حق ہو جو شہر سے والے کو شہر
کر سکے۔ ان شاعرانہ محاسن کے باوجود فانی کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی
اور انھیں وہ قبولیت عام پیش نہ آئی جس کا وہ اپنے کو مستحق سمجھتے رہے
ہوں تھے۔ فانی نے زندگی کو محض ایک دیوانہ کا خواب سمجھا اور اس سے
گریز کیا۔ زندگی نے ان سے انتقام لیا۔ مگر شاعری نے بھی ان سے
دفا نہ کی، جس کا کہ فانی نے زندگی میں سہارا لیا تھا۔ فانی کی اصل کاٹھا
کارا رنگیلا ہے؟ آپ اس سوال کو کسی عنوان سے اٹھائیے۔ جواب صرف
ایک ہے۔

فانی کی اس ناکام سبیل کا راز ان کے نظریہ حیات میں مضمر ہے
فن کار کا زیادہ بنگاہ اور نظریہ حیات اس کے فن کا اساس ہوتا ہے
اس نظریہ میں جتنی ہم گیری، جتنی وسعت اور بندگی ہوگی اسی
قدر اس کی عظمت زیادہ ہوگی۔ اور اس میں بالگیر قبولیت و راسخ
آفرینی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ آرٹ کی دنیا میں ہی فنکار

ملے وہ دھڑکن ہے جسے فرق اپنے مخصوص نواز میں سننا گیت کہا ہے
مے انگریز کے مشہور شاعر شیپلے کا کہنا ہے کہ۔
ہمارے تیسری ترین نئے وہ ہیں جو ہمیں غم کی یاد
دلاتے ہیں۔

لے اک مٹہ ہے سمجھنے کا نہ بھانے کا

زندگی کا ہے کوہ خواب ہے دیوالے کا

عالم ایجاب اک مجموعہ انداد ہے
اختلاف رنگ و بو سے اجنب آباد ہے
ہم اپنے رنج و غمش کے پیمانے سے دنیا کے رنج اور غمش
کو نہاتے ہیں۔ بختِ نعلین اس قدر سے آزاد ہے۔ انسانی زندگی
میں غم اور غمش اس طرح پوست ہیں کہ ان کو علیحدہ پہننا سب کو کہہ کر
تلا نہیں جاسکتا۔ اس نوع کی تعلیم کا خیال ہمیشہ ان دعاؤں میں
پیدا ہوتا ہے جو خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنے ہیں اور عمل کی دنیا سے
کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جن کے نزدیک تحصیل سب کچھ ہے تجربہ کچھ
نہیں۔ جو زندگی کے جدیات سے گریز کرتے ہیں۔

فانی کے فلسفہ غم سے متعلق نفاذوں نے طرح طرح کی نکتہ
آفرینیاں کی ہیں۔ کوئی انہیں غم زدہ انسانی قرار دیتا ہے، کسی نے اسے
شخصی ناکامیوں کا نتیجہ مانتا ہے کوئی اسے موجودہ ماحول کی پیداوار
بتاتا ہے جس میں احساسِ شکست اور غم نے طغیان کیا ہے۔
کسی کے خیال میں جب شاعر کی انفرادیت زمانے کے آئین و
قوانین کو سرمہ در دل کو، ماحول اور سماج کو اپنے عجیبے جوئے تیروں
کاٹنا نہ بڑھاسکی تو وہ اپنی انفرادیت کے خلاف غمِ نبادت مندرجہ
ہے اور اس کا گلا گھونٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنے ہی گریبا
پر زور دیتا ہے اور خواہشِ مرگ تو ہی تر ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک خبر جانب دار نقاد کے دل میں کچھ
دوسرے پیدا ہوتے ہیں۔ فانی کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا
ہے کہ ان کی زندگی کا وہ دور جو اثرات قبول کرنے کے لحاظ سے
سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ نہایت خوش حالی اور فارغ البالی
کا تھا اور انہیں نجبت و اخلاص کی وہ تلخیاں نہیں جھیلنا پڑیں
جن کی بدولت زندگی میں تلخی یا جھلکا ہٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں
ایک معقول آبائی ورثہ ملا ہے انھوں نے دونوں ہاتھوں سے
لٹایا۔ بار بار اُدھی تھے، جہاں رہتے جانِ محصل بنے رہتے
احباب کے چمکے رہتے یا شروشاہری کی تھیں اس طرح گرم
رہیں کہ اکثر کاروبار بھی بھول جاتے، لکھتے اور آگے کو نہ مانتے
قیام میں نہ مینجھتوں۔ کابھی سنسنی نہ رہا، اس کے بعد متا بلانہ
زندگی نہایت خوش گوار اور کامیاب گزری۔ مزاج میں علم و دُرُوت

کے ساتھ ساتھ خود نالی اور خود داری بہت تھی، طبیعت میں
مکلف اس قدر تھا کہ ملے کے گھرے میں بھی شرفانی پہنے بغیر نہ
آتے تھے جس شخص کی زندگی میں یہ حالات بھی ملے ہوں اور جس
کا سیرت میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں۔ اس کے منہ سے ہر لحظہ
علم کا بیان اور خواہشِ مرگ کی تنواریں دس دس حیرت ہوتی ہے
یہ حیرت ہمیں تیر کے سلسلہ میں نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کے اشعار
پر جو کہ ہم جس قسم کی شخصیت کا تصور کر سکتے ہیں وہی تیر کی شخصیت
تھی، لیکن فانی کے سلسلے میں اس بیان میں ایک کم زوری ہے۔ ہم
ظاہری حالات سے بطور کلیاس کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں
کہ یہ کلیاس ہمیشہ درست ہو اور پھر ان کی شخصی زندگی میں
کایچ انداز و رویوں لگا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فانی کو ایسی ذہنی
کش مکش اور شخصی ناکامیوں سے دوچار ہو یا اثر ہو جن کا دور میں
کو صحیح علم نہ ہو اور جنہوں نے فانی کے مزاج میں ایک سو گوارا کیفیت پیدا
کر دی ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر فانی کا غم
ان کی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں کا نتیجہ تھا تو اس کا اثر ان کا ناگوار
کے آخری دور میں ملنا چاہئے، جبکہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکتے
تھے کہ ان کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے جاری رہا یا فقیروں کا لیکن

فانی کے یہاں غم کے بیان کا ارتقا جتنا بلند تھا فانی کی (جو کہ
جہیل دور قدیم کلام کے ممکن پُر دور مستقبل ہے) پہلی خوں میں غم کا
بیان جو ملتا ہے وہ تنہا فیہ اور دلین کی تبدیلی کے ساتھ اکثر دشین
غزلوں میں آخری غزل تک پایا جاتا ہے۔ کلامی ان ہوں اور
یک رنگ کو دلچ کر کہ ان کے انوی اعتبار سے شبنہ ہوتا ہے کشاید ان
کے تقووت کی طرح غم بے ہوشوں بھی عقل کا آفرید ہے اور غالباً یہی
وجہ ہے کہ تیر کے اشعار ہمیں دل پر بس طرح بچو کے لگاتے ہیں
اور جس طرح ان کے لہجوں میں گدڑا زور درو کی کنگ لپٹی ہے وہ
فانی کے یہاں مفقود ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی
شاعری تمام تر بے اثر ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن
میں گدڑا نہ بھی ہے اور بھی ہوئی انشیرت اور اثر آخری بھی ہے۔
ایسے اشعار کی تعداد کم ہے۔ ان کم تعداد اشعار کا نمونہ حسیلی ہے

ملے یہ حالات ماہر القادری، میکش اکبر آبادی، حکیم مختار احمد پوری
نائب دہلوی اور محمد سبطین بدایونی وغیرہ کے مضاف میں میں
ملے ہیں۔

میں نے فانیؒ کو جی دیکھی ہے بغض کائنات

جب مزاج راہ کچھ برہم نظر آیا مجھے

عشق کی وہ لطفانیں، حسن کی وہ نراکتیں

ہائے وہ زندگی جواب خواب و خیال ہو گئی

آج ہم ہی سکے زندہ آنسو ... ان کے آگے جو بار بار آیا

اک فنا سن گئے، اک کہہ گئے ... میں جو رو یا سکر اکڑہ گئے

اللہ سے سکون قلب اس کا جس نے دل لاکھوں توڑ دیے

جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آب کبھی برہم نہ ہوئی

فانی کے یہاں نہ تو سماج کا دکھ درد ملتا ہے اور نہ اس کی

بڑیوں کے ٹھٹھے کی آواز سنائی دیتی ہے ... ان کا غم انفرادی ہے

اور شاعری میں جملہ رٹ کے وہ فائل تھے اس میں سماج کے دکھ

ور کے بیان کا زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ زندگی کب موت بنتی ہو

اور موت کب زندگی؟ یہ آپ کو زندگی کی زندگی میں بچے ہی مل

جلے گرفتاری کی شاعری میں اس کی تلاش کی مثال ایسی ہے جیسے

کہ غالب کی شاعری میں سیاسی سہارے کی گنتی کے چند شاعر

اور کشمیر برتین رہا جوئوں کے علاوہ ہم کو کبھی بھی فانی کی شاعری

میں، اسے ناول کا عکس نہیں ملتا جس میں احساس شکست اور

غم بے عمل زیادہ ہے، جس میں ابھی باتیں ہی ملی دراصل ہنر پریشان

رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر سے جو شعر کو شعر کا مقصد

سمجھتا ہو اور اسے فانی کی نیلے پر کسی طرح تیار ہو، ہم سماج کی شعوری

و کاسی کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور شعرا و ادب میں سماج کی

شعوری اس کا سانس کے سلسلے میں ایک ہم نکتہ قابل غور ہے، دو تو

کی سردہری، فلک کی ستم رانی اور زمانہ کی قدر ناماشناسی اور شاعری

کے ایسے موضوع ہیں جن پر ہر اردو شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن

ان موضوعات پر جس نوع کے اشعار ملتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا

ہے کہ یہ سب روایتی اشعار ہیں۔ جنہیں محسوس کر کے نہیں کہا گیا اور

پھر اساتذہ قدیم کے یہاں تو ایسے اشعار کے لئے ایک جواز بھی

ہے۔ لیکن دور حاضر میں اس قسم کے اشعار کی حیثیت محض رد و

ہے۔ جبر و سودا کا زمانہ یقیناً پریشان حالی اور آشفتنہ سامانی

کا تھا۔ وہ زمانہ ضرور ایسا تھا کہ انفرادی سکون اور اجتماعی چین

لے نہ لے جیلے آل اہم سرور کے مسنون اور شاعری میں فانی

کی قدر و قیمت سے ماخوذ ہیں۔

دو دن مضبوط تھے۔ ایک پورا معاشرتی اور سیاسی نظام

درہم برہم ہوسکا تھا، مگر نئے نظام کے جنم لینے کے آثار رسد

نہ ہوتے تھے۔ وہ دور احساس شکست اور غم کے عالمی تھا

تھا۔ آج اگر کوئی شخص سودا کے اہل روزگار اور موجودہ

زمانہ میں فرق نہیں محسوس کرتا تو وہ نئی قدروں سے عدم

آگہی کا ثبوت دیتا ہے۔ آج زمانہ کے تیوریہ ہیں کہ محمولے میں

شاہین سے ٹکرانے کا عزم دو حوصلہ پیدا ہے۔ اس دور کی

شاعری انے عہد کی نہایت ناقص تر جانی کر لے گی اگر وہ

محض یہ بیان کرے کہ زندگی کی زندگی میں زندگی کی موت کب بنتی

ہے اور موت کب زندگی! اگر اس کی نگاہ صرف دوزخ میں تکتی

ہوئی جنت تک نہیں اودے دیکھنے سے قاصر ہے کہ انسانی عزم و

حوصلہ اور جدوجہد کس طرح اس دوزخ میں سمٹی ہوئی جنت کو

سرا یا جنت بنانے کی فکر میں تنہم ہے۔ دور حاضر کا شاعر ادب

اگر اپنی فنی تخلیق میں عصریت کی طرح بھونکنا چاہتا ہے تو اسے

محض ذہنی، مادی اور سیاسی کس کش اور خلفار کے بیان پر کٹنا

کر کے ان زبردست قوتوں اور محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہئے جو

سماج کی زیریں سطح میں بوری ستر دہرے صوف کا رہیں جن سے

اک نئی دنیا کی تعمیر ہو رہی اور جن کی بدولت زندگی کی نئی معاشرتی

قدریں اور نظریات پختہ اور مستحکم ہو رہے ہیں۔

فانی کے کلام میں غم کا موضوع کس راہ سے آیا ہے ایک دلچسپ

سوال ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ فانی کے غم کی

فہمیت کیا ہے۔ غم کے مواقع پر غم گین ہونا یا غم میں آنسو بہانا ایک

فطری بات ہے۔ اسی طرح پیمانی غیر فطری بات نہیں کہ انسان ضبط غم کا

حوصلہ پیدا کر لے۔ بڑے سے بڑے صدر کے کوئل پر ہسہ لے اور

زبان سے ان تک نہ کرے، لیکن غم کا دوزخ کے نئے نئے کسے غم میں

گھلنا اور غم میں نشاط کے تمام پہلو تلاش کرنا خلاف فطرت و ذہن

ہے جسے ہم ایک نفسیاتی بیماری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی انسانیت

کا اثر تھا کہ فانی خوشی میں بھی غم کے پہلو کرید کرید کر رکھ لے تھے۔

بھولوں کی نظر ناز و رنگ دیکھی ... خلق کی دنگد ز حالت دیکھی

قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر ... دوزخ میں سوئی ہوئی جنت دیکھی

ملے وہ بدگیاں کہ مجھے تاب رنج و زحمت نہیں

مجھے یہ غم کہ غم جب دواں نہیں ملت

علم میں نشاط اور تخلیق نشاط .. علم حجت احساط و تصدیق نشاط
 غم کا ہے جسم جسے کہتے ہیں جو .. ہستی کو ہے غم کے دم کو توئی نشاط
 جو بار و نیست بنی خطرناک ہے ہستی ہی پائیدہ اور قابل
 قبول بھی جس طرح زندہ رہنے کی خواہش ایک ناقابل تر و حقیقت
 ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لحاظ غم کو حاصل حیات تصور کرنا
 فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ شاید اسی لئے انسان غم کے لحاظ کو
 جلد سے جلد فراموش کرنا چاہتا ہے اور خوشی کے لحاظ کو غم کی یادیں
 غم گن مٹانا گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے حقیقت کے خلاف جو خالص ہستی
 ہیں ان کی حقیقت مستحیات کی ہے۔

غم کی طرح سانس کی بھی قافی کی یہاں بے حد خرد فانی ہے۔
 یاس کا جذبہ اگر سے جذبہ کبہا درست ہو (روح رواں کی طرح ان
 کلام میں جاری و ساری ہے۔ ان کو اپنی بیانیسی و دھرمی پر عین کامل تھا
 امید و حوصلہ کی کوئی رمق ان کے کلام میں نہیں مٹی۔ جذبات کا فقدان
 یاس کی کیفیت بدل کرنا ہے جو جذبہ غم سے زیادہ عظمت رسا ہے۔
 خوشی کی طرح غم کا بھی ایک انشائی پہلو ہے۔ مگر یاس کی یہ بھی کیفیت
 ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں کوئی رولہ، کوئی
 آئینہ، کوئی خواہش اور کوئی امید باقی نہ رہ جائے۔ زندگی میں ایسے
 لحاظ آتے ہیں جب انسان پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن کیفیت
 زیادہ دیر تک قائم نہیں ہوتی وہ نہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہ
 رہ جائے۔ دنیا کی رنج و جد بات سے عبات ہے۔ جذبات کے
 فقدان سے یاس کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا مٹنا ہو جانا شخصی اور
 اجتماعی زندگی کے لئے یکساں طور پر ہلاکت آفریں ہے۔

قافی میں یاس کی یہ شدت کچھ تو ان کی فطری طبیعت کا
 اثر ہے اور کچھ بھی لغتوں کا عمل اور جدوجہد میں ناکامی کی صورت میں
 یاس اور ناامید کی احساس فطری ہے مگر یہ ناکامی ایک صاحب عمل
 اور بلند حوصلہ انسان کے حق میں مزید کوشش کے لئے ایک تازہ ناز
 ہے۔ اقبال نے اسی لئے زندگی کو جہد مسلسل کہا ہے۔ اس جہد میں جو
 لوگ کھپ جاتے ہیں وہ دوسروں کے لئے راستہ ہم و راہر بن جاتے ہیں۔
 قافی کے یہاں عمل اور جدوجہد کی مثالیں نہیں ملتیں۔

ان کے کلام میں شدت یاس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنی عمر کو
 دنیا مرادی یاس درج بلقین راسخ تھا کہ ان میں کبھی حوصلہ عمل پیدا ہی
 نہ ہوا اور یاس کی کیفیت دل و دماغ کے ساتھ ساتھ ان کی ساری شاعری
 پر مستولی ہو گئی۔ دوسرا اثر بھی لغتوں کا ہے۔ بھی لغتوں کا شاعر فانی
 کو بے حد راسخ آج بھی لغتوں نے فانی کی زبانیں تباہ کی ہیں انہیں
 مرد اور بے عمل بنا دیا ہے۔ زندگی سے فراہم کی راہ دکھائی ہے۔ پھر اس
 لغتوں کا فانی کے کلام کو بے ذوق اور فساد بنا دیا تو ایک معمولی سی
 بات تھی۔ جیسا کہ اوپر کی جگہ ذکر آیا ہے۔ فانی کے یہاں ایسے اشعار
 ہیں جن کا گلوڑا ہمارے دل میں کسک پیدا کر رہا ہے۔ لیکن ان کی شاعری
 کی عام فضا دانتی سرد اور حوصلہ شکن ہے اس میں اس جہت عالی کی وہ
 تلقین نہیں ملی جو در ابھی قبول نہ کرے وہ عمل افزا و دوحیات افزا
 جذبہ نہیں ملتا جس کا زمانہ مفتضی ہے اور جس کی گنج ہم اقبال کے
 یہاں پاتے ہیں۔

غم و یاس کی طرح موت بھی فانی کی شاعری کا ایک مستقل اور
 محبوب موضوع ہے۔ اردو کے کسی شاعر نے موت کو اپنی شاعری میں اتنی
 موندگی حقیقت نہیں دی لیکن اس کے سبب نہیں کہ اردو شاعر
 نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ موت چونکہ ایک موضوع حقیقت ہے
 اس لئے ہر شاعر اس کے متعلق اشعار کہے ہیں لیکن غالب کی حقیقت
 اصغر اور اقبال کی چھوڑ کر دیگر شعراء کے یہاں بالعموم مفکرانہ انداز
 فکر مفقود ہے۔ موت کا بیان ہاں ہے یہاں زیادہ تر دو طرح سے
 ملتا ہے۔ ایک نوستالوجیک یا زمین و زمانے سے تعلق ہے۔ دوسرے موت
 کے بیان سے دوسروں کو عبرت دلانا مفقود رہتا تھا مگر قافی نے اس
 سلسلے میں ایک انفرادی حقیقت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اس موضوع
 پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن چونکہ اظہار خیال شاعر میں کیا گیا ہے
 اس لئے ان کے یہاں وہ بلند فکری اور وہ تسلسل خیالی جو اسی موضوع
 پر انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ان کے اشعار میں تفکر کا انداز
 ضرور ملتا ہے۔ قافی نے موت کو حسین بنانے کی کوشش کی تھی اسے
 ہمارا دل کی قرار اور علاج درد نہیں کہا ہے۔ قافی کے حق میں ممکن
 ہے یہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ ان کی غم نصیب و تسکین باری زندگی کی ممکن ہے

۱۰ CHRONIC ۱۱ تجر و اختیار ۱۲ اسلامی کلام کی اصلاحات ہیں اگر اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جہد میں دل خداوندی ہے۔ مگر قافی
 نظراس سلسلے کے تاریک پہلو پر ہی اس نے ان کے یہاں جو کلام معلوم ان کی مجاہدگی محض ہے۔ صحیح اسلامی عقیدہ باہمیں جہد اختیار ہے۔
 ۱۳ شاعر کی افرامہ و اندر وہ ذوق انکار چہاں سرسخت نہ خواہیدہ نہ بیدار۔
 ۱۴ ہاں تاہم ایشیا فردی مفکر ہے۔

مرگ موت کی آغوش میں سکون کی تلاشی ہو مگر ہم اسے زندگی کا موت
مندانہ نظر سے کبھی نہیں کہہ سکتے۔ حیات اپنی تمام غریبوں اور غریبوں کے
باوجود نہایت عزیز ہے۔ اسے اور موت ایک خوف ناک حقیقت ہے۔ ہم
زیادہ سے زیادہ موت کی طرف سے بے اعتنائی برت سکتے ہیں۔
ہمارا یہ انداز جو سکتا ہے کہ جب تک جیتے ہیں۔ جیتے ہیں جب تک
آجائے گا تو جلیں نہیں گئے۔ مگر انسان کے پہلو میں جب تک ایک حرکت
ہو ادل ہے جو اسے صوفیوں کا احساس دلاتا ہے۔ اور جس کی بدولت
دنیا نے اب وہاں سے اس کی وابستگی ہے۔ وہ موت کو حسین نہیں
سمجھ سکتا۔ اور اس کی تمنا میں مر نہیں سکتا۔ فانی کے داغ پر موت کا
خیال ایک COMPLETE کی طرح مسلط تھا۔ وہ زندگی کے ہر لحظہ
کو موت سمجھتے تھے۔ اور پھر گھڑی انھیں موت کا انتظار تھا۔
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر کے بجائے جانے کا
بجھتی ہی نہیں سمجھ جاتی ہے
کشتی ہی نہیں رات دھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی

سینے میں پھری ہے کہ چل جاتی ہے
اب سوال یہ ہے کہ فانی کی دائرہ موت کو اتنا ہی حسین اور عزیز
سمجھتے تھے جتنا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ سبک دین کے
فانی نہیں مہر القادری صاحب کا ایک مضمون ہے اس میں فانی کی
شخصیت اور سیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کا بیان
ہے۔ بیماری کے زمانہ میں ایک دن میں اور نواب خاں یار جنگ ملے
مزاج (پیشتر کلکڑ) فانی کے ہمال گئے۔ مزاج پرسی کے بعد فانی سے
نواب صاحب نے کہا۔ فانی تم نہیں سمجھتے، تمھاری زندگی
(موت) ضائع نہیں ہوئی۔ وہی فانی جو میت مرگ ہمارا کی تمنا کرتا
تھا ان لفظوں کو سن کر اس کا چہرہ خوش ہونے لگا تھا۔ زندگی کتنی

عزیز ہے! اگر اس بیان میں صداقت ہے اور کوئی دوجہ
نہیں کرے سمجھ نہ سکا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی خواہش
مرگ میں صداقت کا وہ درجہ تھا جس کے باوجود اس نے فانی کے
کے صغیر رنگ ٹٹلے ہیں۔

فانی کی خواہش مرگ میں کتنی صداقت تھی وہ موت کو کتنا حسین سمجھتے
تھے ان بحثوں سے قطعاً نظر ایک حقیقت ہے کہ فانی نے جنس انداز میں
اس موضوع کو پیش کیا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہے۔ موت کے مضمون
کی کثرت نے ان کی شاعری کو اس درجہ سوگوارہ رنگ دے دیا ہے
کہ وہ کبھی مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ حیات و موت کے متضاد
ایسے مسائل میں جنہوں نے فلسفہ، ماسٹریں اور مذہب کو یکجا ملود
پر اپنی طرف متوجہ کر کے شرفائے بھی ان مسائل کی طرف توجہ کی ہے
مگر ان مسائل کی حیثیت بھی نہ حل ہونے والے سوئے کی ہے۔ ان مسائل
پر جن مختلف زاویوں سے بحث ہوئی ہیں۔ ان کا تفصیل میں پڑنا
نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ اس مختصر مقالہ میں اس کی تلاش ہے۔ ہمارے
مقصد کے لئے صرف اتنا ذکر نہیں کر لینا کافی ہو گا کہ زندگی کی ان
ذویت چاہے ایک لحظہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اس کے جالیانی ترے پر خود
چار شاخہ۔ خواہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خوشی اور رنج، یاس و
اسید، نور و ظلمت، صلیح و دلیک، ادا و اسرار، مدد و کد کے بے شمار
جوشے آپس میں ٹکرائے زندگی کے دکھاتے کو آگے بٹھائے لئے
جاری رہے ہیں۔ یہ دو امر نہ جانے کب سے جاری رہے اور نہ جانے کب
تک جاری رہے گا۔ پھر یہ تذکرہ تو اس ڈرامہ کا ہے جو ہم اپنی دنیا
میں دیکھتے ہیں۔ ہمارے دنیا سے باہر کائنات کی مبدیہ اور لا انتہا
فضائیں ہیں کیا درجے ہوتے ہیں۔ ان کا اندازہ کمزور نگاہوں سے
زندگی کے اس ڈرامے میں ہم ایک لمحہ کے لئے پروردہ پر کرتے ہیں
اس ذمہ میں ہر کوئی طرح بڑھتا جائے۔ ہم اس ڈرامہ کے (جس میں
طربہ اور ایسے کا قابلِ تفسیر استراخ ہے) خاموش ناگشتا کی تو بن

لے جوش نے اسی چیز پر بحث چڑا کی ہے۔ دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے۔ دریا تیری آنکھوں سے بہا کر تپا ہے
بیک نشست اجل کو جانِ نیا بہتر مرنا ہے باقائے کبریا کرتا ہے
موت کی خواہش اور زندگی سے بڑا راز کی جو شدت فانی کے یہاں نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے تو فانی کو یہ سنسکر اور کبھی غم گین
ہو جانا چاہئے تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتے۔ انبیاء کے ماہر گنڈہ فراموش ایک جیسی ہوتی بات کہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ہم اس
بیزر سے اپنی سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس کے لئے ہمارے دل میں ایک لمبی موتی خواہش ہوتی ہے۔

نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ تو اپنی فطرت کے خلاف ہے ہم جتنے
لینے پر مجبور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لئے قسمت کو محض اس قدر
باواختر کرنا ہوتا ہے جو صرف کر دینے پر ہیوں لائے گئے
پانسی خوشی اس میں شریک ہو کر اسے اپنی باطاہر خوشی سے
خوب تر بنانے کی کوشش کریں۔

یہ خیال کہ انسان مجبور محض ہے اور قدرت کی اندیشہ
اسے سینے پر رکھتی ہوئی ہے عجیب تصوف کا اثر ہے۔ جس کی بنیاد حقائق
زندگی سے گریز پر قائم ہے یہ خیال شکست خوردہ ذہنیت سے پیدا
ہوتا ہے اور دوسروں کو شکست پر نہ دیتا ہے۔ آئی گئی ہے سے فانی
کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔ یہ زندگی کو صرف بے رنگ ہی
نہیں بناتی بلکہ انسان سے زندگی کا سارا حوصلہ چھین لیتی ہے
ان انخار کو بڑھانے اور دیکھنے کہ ان کے افراط کتنے حوصلہ شکن ہیں

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ بوجھ

ہر نفس ہے ایک جائزہ آہ بے تاثر کا

ہے موت ہی اب زندگی دل کا سہارا

جیسے کی جوالی ہی تنہا ہے تو مرجا

یہ زندگی کی ہے دودھ و دھنچکا فانی

وجود در مسئلہ علاج نامعلوم

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں

اسے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

میں کہاں اور کہاں عمر دور و نہ فانی

زندگی اب بدلتا فضا ہے گراں جانی ہے

پھر اگر یہ خیال یا نظریہ تصوف کے دیگر مسائل کی طرح

محض "برائے شعر گفتن خوب است" تک محدود رہے تو

ہر جرح نہیں۔ لیکن شاعر کی اس ذہنیت یا نظریہ کا قوی اور

اجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا انتہائی ہلاکت آفرین ہے۔

اقبال اس عجیبے کی زہر آگین سے آنکھ تھے وہ اس رنر سے

واقف تھے کہ صوفی، فقیہ اور شاعر نے مل کر کتنے سے ٹھوٹے

ہیں۔ اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے قومی زندگی کو

اس زہر آگینی سے بچانے کی کوشش کی اور اس میں ایک نئی

روح ایک نئی تڑپ اور زندگی کا ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔

فانی کا ایک شعر ہے

اب نئے سرے سے چھپرہ سادہ سبز بنی تھی تھا اک شکست کی آواز
معلوم ہوتا ہے کہ فانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کا سارا
زندگی کا سارا ہے اور وہ سارا ہے جسے ہمارا وہان حیات
کے لئے باہگ در اکہہ سکیں، زمانہ کو جس سار کی ضرورت تھی
وہ سارا اقبال کے پاس تھا۔ اب اقبال کے بعد والے دور میں
اس سار کی لئے کیا ہوگی اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے
باہر ہے۔

غم دیاس، خواہش مرگ اور ان کی مسوری محض
فانی کی شاعری، اور شاعری کیا ان کی زندگی کے سنگ
بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جس زندگی کی تعمیر ہوگی ظاہر ہے
کہ وہ مدعاے حیات سے محروم ہوگی۔ مدعاے حیات سے
محرومی اور بھرسہ بہ وقت اس کا احساس ہلکے پھلکے حیات کو
کتنا تنگ کرتا محمد و در کتاب بے رنگ دے آہنگ بناد تیار
یہ کاروان حیات کس منزل کی طرف رواں دواں

ہے اور کہاں جا کر دم لے گا؟ ان سوالوں کا جواب دینا تو

آسان کام نہیں، ہاں انسان تو جو محسوس ہوتا ہے کہ انسان

اپنی تمام کوتاہیوں، تمام کمزوریوں اور تمام کمزوریوں کے

باوجود آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ زندگی خود اپنی

نکد ایک معنی حقیقت ہے۔ لیکن فانی کے نقطہ یہ حیات کا نقطہ

عروج دوسری انتہا پر جا کر رکا۔ جہاں زندگی محض خواب ہے

اور بے مدعا دے مقصد۔ اگر فانی کا یہ خیالی صبح ہے تو پھر

اقبال کا یہ شعر کیا سنی رکھنا ہے۔

عروج آدم خاکی سے اجم سبے جاتے ہیں

کہ لٹوٹا ہوا سارا نہ کامل نہ بن جائے

زندگی کو بے مدعا اور بے مقصد تراویں دینے والی شاعری

اور اس عمل انروز اور حیات انفر شاعری میں جو آدم خاکی میں

مکمل ہے بھی روشن ترین آئینے کا حوصلہ پیدا کرے انتخاب کرنا

زمانہ کے لئے دشوار نہ ہوگا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ زمانے کا

تناظر جیسے جیسے دور ہوتا جائے گا۔ موخر الذکر شاعری کی تعلیمیت

اور اہمیت میں دقتار سے ٹرسے گی۔ اول الذکر شاعری اس قدر

لہ ہر گاہ کہ راہ پیش نظر می آید
خوش محاسن و دلخواہی را ز ان می باید
عہ جبر نہیں کہ سینے بوجھ سکتے
فقیہ صوفی و شاعر کی تاثریں اندیشی
عہ مرگ حیات ہے محروم مدعاے حیات
وہ وہ کہ در ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

سے پس پشت پڑتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ حیات مرثیائی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے دنیا میں ایسے بہت سے روحانی پیشوا اور فلاسفہ گزر چکے ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو غم کہہ تصور کیا ہے اور اس تلک تاریک غم کہہ سے فساد کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن ان کے خیالات کا اثر ہمیشہ محدود اور وقتی رہا ہے۔ دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیاں وہی شاہرہ کی حافی ہیں اور انہیں کے پنیات کو عالم گیر اثر اور قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ جنہوں نے انسان کو روحانی اڈ

ماوی خستیوں میں مٹا دیا ہے اور ان کی ترقی کے لئے نئی راہیں سمجھائی ہیں۔ زندگی کو بے مقصد اور بے مدعا سمجھ کر اور دنیا کو غم کہہ تصور کر کے اس کے ہنگاموں اور محشر سامانہوں سے گریز انسانی فطرت کے منافی ہے۔ جس دن انسان انسان نہ رہ جائے گا اور اس کا دھڑکنے والا دل خاموش ہو جائے گا اس دن شاید دنیا محض غم کہہ بن جائے اور اس کی زندگی بے مقصد و بے مدعا۔

مازہ ایڈریشن

زیر طبع

رنگ محل

ساعر دور جدید کا پیامی ہے، اس کی بہار آفریں شاعری ایک صبح نو کی قہقہہ ہے۔ اس کے نغمے میں ماضی کی خنایت نہیں ہے بلکہ اُس رنگ محل کا انکاس ہے۔ جس کے سندس رنگس اور برج اور کتبہ مستقبل کی زریں دھوپ میں بچتے نظر آتے ہیں۔ جب ساعر شہاب کی مازہ اور سرخ شراب زندگی کے جام میں آمٹھلیتا ہے۔ تو خوشامعنی "ساقی بکلوہ دشن وایمان و آغوشی" بن کر محفل نشاط میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس دھن جاوداں کی دلرو زبوں کو اس کی بلاخیروں کو رنگ محل کے ایوان خاص میں دیکھئے۔

جب ساعر بہار جوانی اور ابدیت کے گیت گاتا ہے تو اس کی شامسہ کی کی ترتم نغنا بے تہوروں کے بہارِ نغمے کی یاد مازہ کر دیتی ہے، وہ جب "حسن، سندسما اور کنزاد یوں کی موہنی کو اپنے نغموں پر سمجھ دیتا ہے تو کوئی بڑے ترکش سے اندھے تر بے اختیار پھسل کر باہر نکلنے نظر آتے ہیں۔ وہ جب اشتراکیت کے خوشنہد رنگ محل کی بکلوہ آفرینوں کو اپنے مخصوص رجائی انداز میں دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن میں ساند کے مستقبل کی ایک ایسی واضح روشن اور خوبصورت تصویر کھینچ جاتی ہے کہ ساری کائنات پر اک عجیب کیفیت اک عجیب مرستی چھانے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (The Great Gatsby) مہوش ہو کر اس طوفان لے کی لہروں پر ناز رہا ہے۔ رنگ محل میں ساعر نے زندگی کے پیکر نو کی تخلیق کی ہے، آپ کے لاشعور کے پسوں کو اگلی کیفیت بخشی ہے ساعر کے ایک ساعر نو کی تشکیل کی ہے جس کی نازک حکاریوں کے حسین نقش رنگ محل میں دیکھئے۔

کرشن چندر

ملے کا پتہ:-

ادبی مرکز ہند پبلشرز کراؤٹسٹ چمپ روتو، بانٹکھ بیٹی

انسان کی لاش!

بولتی نہیں۔

میں ہندوؤں کے گھر میں گئی ہوں اور مسلمانوں کے گھر میں بھی، ہندو بچوں کو اس کو دی میں پالاسہ اُن کو ان چھاپوں سے دودھ پلا پالاسہ، ان ہاتھوں سے تعین نہ لیا ہے، کھلا ہے، اور اسی طرح مسلمانوں کے بچوں کو پالاسہ، بوسا ہے، میں سب کی ماں ہوں؛ ایک کھانے آئے بڑے۔ اُس کا باپ اور اس زور سے روڑا کر دیا کہ من سے اللہ کا کلمہ نکل گیا وہ اچھو نہ سانا لے کر سکھ کی گربان اس دوا یہ کے پیٹ میں تھی۔ اور دیر لڑکھرائی ہوئی نہ میں پر گر پڑی اور دوبارہ زمین سے ڈاٹھ سکی۔

۷۳

آج ہندوؤں اور مسلمانوں کی مائیں مرجی تھیں، دونوں کے بچے خون کی مٹی کی گھیل رہے تھے، — اسکول کے مسلمان آستانی یہ سوچ رہی تھی کہ گھنٹی بجی، اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ آج بچوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس سے بڑے ہندوستان کا نقشہ شک ہوا تھا۔ آستانی نے رجسٹر سے لڑکیوں کا نام پکارا۔ سب کی چھری لی اور پھر نقشے کی طرف دیکھنے لگی، اور کھنڈ لگی، یہ ہے ہندوستان یہ ہے ہمارا دیس، یہ ہیں اس کے بھائی، یہ ہے مونٹ اور رست، دنیا کی سب سے بڑی چوٹی، یہ ہے کشمیر، ہندوستان کی جنت، اور یہ جنگل، دریا، سمندر، — یہ ہے پنجاب۔ رادی کے اس پار مسلمان بستے ہیں، اور ادھر مسدود، — میں تھیں ہر مذہب سبق پڑھاتی ہوں، اس نقشے کی طرف دیکھو، اس کی حدیں بھول کر جانا (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) بھلا کہاں دیکھ رہی ہو، آستانی نے کرخت لہجے میں یہ الفاظ کہے۔

بتلانے آستانی کی طرف دیکھی اور کچھ گھر لاسی گئی، وہ کچھ سوچ رہی تھی، اس کا دھواں نقشے کی طرف نہ تھا۔ بھلا کی عمر ہوئی، آٹھ نو برس، اس کی ننھی ننھی سی آنکھیں حیران اور ششدر

شرما رہی تھیں کے لئے کیسب کھل گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے میمنٹ میں اسکول کھولا گیا تھا۔ اس اسکول میں صرف ہندوؤں کی لڑکیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں زیادہ نہ تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں، جو پاکستان سے بچ کر آئی تھیں، ان میں کسی کی مائیں مر گئی تھیں کسی کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی لڑکیوں کی مائیں بھی ملک پاکستان میں تھیں۔ اور کئی کا سارا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور کئی لڑکیوں کو یہی علم نہ تھا۔ کہ ان کے والدین زندہ ہیں یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ لڑکیاں ہندوؤں کی تھیں۔ لیکن اسکول کی آستانی مسلمان تھی۔ جب دہلی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں پر دھکم پور کیا۔ جن کی نظیر، ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں سے بد لایا تھا لیکن کن مسلمانوں، کن مسلمان عورتوں سے کن مسلمان بچوں سے؟ شاید، ان لوگوں نے یہ نہ سوچا، کہ وہ جتنے مسلمانوں کو تریخ کر رہے ہیں، ان کا مغربی پنجاب پر ظلم دھلانے میں کوئی ہاتھ نہ تھا، بربریت کے اس لمحے میں کسی نے تجھ نہ سوچا کہ یہ عورت جس کو وہ مٹا کر کے بازار میں سے لے جا رہے ہیں، یہی ان کی دادی اماں تھی، اسی سے دہلی کی گلیوں میں وہ مٹی بارسل چکے تھے، اسی دادی اماں نے ان کے بڑے پر شفقت کا ہاتھ پھیلا تھا۔ دراز مٹی تھری دغا کی تھی۔ ان کی مثنائی چوکی تھی، ان کے بیاہ میں دھولک بجی تھی، گیت گائے تھے، تھیں اپنی مسئلہ خانی ہاتھوں نے دادی اماں کا گلہ گونٹ دیا۔ اس کی کھوپ کو نیزہ پر چڑھا کر اپنی اندھی جوانیت کا ثبوت دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہندو خاندانوں کے ہاتھ میں ایک دیر لگی تو انھوں نے اس سے پوچھا۔

ہندو ہو یا مسلمان؟

دوایہ!

تمہارا نام؟

دوایہ!

ہو کر رہ گئی تھیں کبھی وہ آستانہ کی طرف دیکھتی، کبھی پورڈ کی طرف
ادھر کبھی بیٹھی ہوتی پورڈ کی طرف، جو اس کی طرف بار بار دیکھ رہی
تھیں، جب کبھی آستانہ کی بلال سے کوئی سوال پوچھتی۔ بلال اوٹ
ٹانگہ جواب دیتی۔ آستانہ کی جواب سن کر ہمیشہ اسے جھڑکتی، آج جب
بلال نے پھر اس کے سوالوں کا ٹھیک جواب دیا۔ تو آستانہ آپسے
باہر ہو گئی۔ اور چرخ کر بولی۔

ہندوستان کی تعمیر کس نے کی؟ جو اب نہاد۔
ہندوستان میں کس قوم کے باشندے رہتے ہیں، بلا خا مویشی
پاکستان میں کون کی قوم رہتی ہے، بلا خا مویشی تھی،
جائے ہر کہاں ہے، بلال آستانہ نے کوڑک کر پوچھا۔
وہ بلال سے، بلال نے لہجے کی طرف دیکھ کر کہا۔
وہاں کہاں۔ ہندوستان میں پاکستان میں،
پاکستان میں، بلال نے حیران کن نگاہوں سے دیکھ کر
یہ جواب سن کر سب لوگ حیران ہو گئے۔

آستانہ کو اور غصہ آیا اس نے بلال کی طرف تھراؤ لگا دیا
سے دیکھا اور کہا۔ تم کیا کرتی ہو، تمھاؤ دھیان کی طرف ہے، کڑی
ہو جاؤ، پنج پر، دیکھ اننگلی کو زمین نہ ڈال۔ سیدھی کھڑی رہ،
تھیں یہی نہیں بدھو ملو کہ جانے ہر کہاں ہے، اتنی سی بات کیا کرتی
ہو دونات، پڑ آتی کیوں نہیں ہو، ناخوں کو دانا تو ملے کا شتی
رہتی ہو، اگر تم اس طرح پڑھتی رہیں، تو کبھی آستانہ پاس نہ کر کوئی
بلا چپ چاب کھڑی رہی، اور پریشان کن نگاہوں سے
آستانہ کی طرف دیکھتی رہی۔

تو یہ ہے ہندوستان کا نقشہ۔ اور ہر پاکستانی، میان
مسلمان کہتے ہیں، مسلمان جناحی توپی پہنتے ہیں، وہ ہندو اور
انگوں سے نفرت کرتے ہیں، پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے، پھر
آرام اور بار سے ہٹ گئے، اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہوتا تھا۔ تو
خود ہی منٹ لیتے تھے، اب کے جھگڑا ہوا۔ تو انھوں نے انگریز کو بلا دیا۔
اور انگریز نے دونوں کو اپنا حصہ دے دیا۔ اور ہندوستان
ہے، میان زیادہ تر ہندو رہتے ہیں، ہندو دھوتی پہنتا ہے، ماسٹر
بڑے تلک لگاتا ہے۔ اور اکثر برقعہ یا ترکہ کرتا ہے، ہندو مسلمان
سے نفرت کرتا ہے۔ تو یہ ہے ہمارا ملک، اور ہم ہیں اس کے باشندے
اگر پاکستان جانا ہو تو پاسپورٹ لے کر جاؤ اور ہندوستان
آنا ہو، تو کبھی پاسپورٹ لے کر آؤ۔ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے

۷۴

یہاں کا کارخانہ ہیں۔ ملیں ہیں۔ جوانی جا رہی ہیں، ٹیکسٹائل ہیں
چھتی موٹریں ہیں اندر پیرا داسکانی ہے۔ لیکن لوگ بھوکے مرتے
ہیں۔ سیرا ہینٹ جسکے ہے، لیکن لوگوں کو نکال رہے کا خوف ہے
اس ملک میں جو نے کی کالیں ہیں، چاندی کی کالیں ہیں، کوئلے کی
کالیں ہیں، ہندوستان میں تاج محل ہے، قطب صاحب کی مینار
ہے، لال قلعہ ہے، اور دل میں کی آبادی چالیس کروڑ سے چونتیس کروڑ
رہ گئی ہے، سمجھ گئیں بلال، کیا کہا میں نے،

شناختی۔ دنیا میں سچے آدمی کی عزت ہوتی ہے یا جھوٹے کی!
سچے آدمی کی آستانہ کی جی، شناختی نے خود جواب دیا،
نہ دنیا باختر۔ آستانہ نے خوش ہو کر کہا
لوگید! ستاؤ کہہ۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان؟
ہندو، سب لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔
شاہنشاہ۔ آستانہ نے چرخ کر کہا
تم بتاؤ۔ بلال نے کوئی ناخوش ہو۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان؟
بلا خا مویشی تھی۔

دونوں کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی۔ نقشے کی طرف
گھور گھور کر بولی۔ سچی ہو۔ انگریزوں سے نہ کیلو، گردن اونچی
کرد۔ سمجھے نہ دیکھ، سیدھی کھڑی رہ،
آج آستانہ کی کو ضرورت سے زیادہ غصہ آ رہا تھا وہ غصہ
میں بھری ہوئی بلال کے قریب گئی۔
بتاؤ۔ ہندو بڑا ہے یا مسلمان۔ آستانہ نے چرخ کر کہا۔
بلا خا مویشی تھی۔

نکل جا یہاں سے، اسی وقت چلی جا، نہیں مارا مار کر جان
نکال لو گی۔
بلال جانے لگی!
بلال بھڑکا!
باقی سب لوگوں کو آستانہ نے چھٹی دیدی۔ لڑکیاں
چلی گئیں اور کمرے میں بلال اور آستانہ کی رہ گئیں۔
بلال وہی تھی۔
اسے روتا دیکھ کر آستانہ کی کو رحم آ گیا۔
لوگوں میں رہ رہی ہو میری بچی!
آستانہ کی جی، بلال نے انگوں کو پوچھتے ہوئے کہا۔ میں
میں۔ رات بھر نہ سو سکی۔

دیکوں پیری بچی، آواز میں شفقت اور ہمدردی تھا۔

رات بھر ناں جاگتی رہی، اور دعویٰ رہی؟
”وہ کیوں؟“

ماں بچی نے مجھے بتایا کہ میرے چاچا کو کل گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں پھیرے ہوئے تھے کہ باقی لوگوں کو علم ہو گیا۔ انھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے چاچا کو یہ کہہ کر ہلاک کرنے لگی، میں رات بھر جاگتی رہی، مجھے بالکل نیند نہ آئی، میرے چاچا معلوم نہیں، اب کہاں ہوں گے؟ ماں بچی کہتی ہیں کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر آستانی کی آنکھوں میں آنسو آئے غصہ کا فور ہو گیا اُس نے اپنی ساڑھی کے تلوے ہلا کر آنسو روکے، اور کہنے لگی رو دو مت پیری بچی، میں بھی رات بھر نہ سوئی، میں بہت پریشان تھی۔ ایک پل بھر نہ سو سکی۔
”وہ کیوں، ہبلانے دے دے ہوئے کہا

”میرا بھائی جالندھر میں تھا، ہندوؤں کے قبضے میں آگیا اور بھارا مارا گیا۔ ایک بچی بھائی تھا میرا۔ خاندان کی آخری نشانی تھی وہ بھی بچا راستہ کر دیا تھا۔

بڑے نے مارا، آستانی جی؟
”ہندو نے“

دو لڑکے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سامنے نقشہ لٹک رہا تھا۔ ہندوستان کا نقشہ!

ایک طرف ہندو۔ دوسری طرف مسلمان، ایک دل کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک ہی وطن، جتنی تقسیم میں خون کی ندیاں بہہ لگیں، نہ ہندو بڑا تھا۔ نہ مسلمان، دونوں رہنمائی تھے۔ دونوں

دونوں نے گھور کر نقشے کی طرف دیکھا۔

ایک طرف ہندو کھڑا تھا، دوسری طرف مسلمان کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان انسان کی لاش تھی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں!

ترقی پسند تحریکوں کا ترجمان

پندرہ روزہ

نیا پرچم

جو فروری ۱۹۴۹ء سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

ترتیب دینے والے
وشوا متر مبادل
نظر جعفری
محمد حیدر اسد

پہلے نمبر کے چند صفحات: - کرشن چندر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساغر نظامی، ہندو تاتہ نظامی، مجروح سلطان پوری، ممتاز حسین، حبیب تنویر، رمیش سنگھوی، چیخوت۔

”نیا پرچم“ حسن چمبرز، پارسی بازار اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی۔

۱۹۴۹ء

لرزشیں

میراجی

سکوں کا سایہ ابھی اس طرف سے گذرا تھا ،
یہ کون ؟ آج بھی تم دوریوں کو طے کر کے
اسی طرح میرے خوابوں کو گدگداتے ہو ؟
زمانہ سر پہ گھڑا قبضے لگاتا ہے

ہجوم — سرد ، خموش ،
کبھی تو دور سے ملتا ہے ، مسکراتا ہے ،
کبھی قریب جو آئے تو جیسے ایک خیال
اندھیری رات کی تنہائی میں ڈراتا ہے
وہ آگے بڑھتے ہی جلدی سے لوٹ جاتا ہے ،
ہجوم کب ہے ؟ جھجھکتا ہوا خیال ... جھجھکتا ہوا خیال تو ہے !

تمہیں بھی میرے ستارے میں لطف آتا ہے —
تمہیں بھی شوق یہ راز دروں بتاتا ہے —
کہ اک ٹپ کو دوام حیات کہتے ہیں ؟
ہجوم جہل کی بکھری ہوئی نمائش ہے
ہجوم قتل کی جرأت نہ ہو تو دور سے ہی
ہزاروں پارہ سنگ

آنکھ کے پھینکتا ہے ، اور بھول جاتا ہے
کہ ایسے اپنی جہالت کے نقشِ محکم کو
سوارِ وقت کا وہ ہمنما بناتا ہے ،
شکارِ خونِ رگِ دل کے پھوٹ پڑنے پر
سکوں کے سایہ خاکی میں ڈوب جاتا ہے
سکوں کا سایہ نہ تھا ، تم نہ تھے ، وہ میں بھی نہ تھا ،
یہ چند لمحے تھے جو وقت سے جدا ہو کر
ہمارے دورِ مکاں میں گداز لائے تھے
اور اب ہمیشہ کو اک کا ہش بقا ہو کر
ادھر ہی لوٹ گئے جس طرف سے آئے تھے

نوبت حقایق

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
یوں تو انسانی الفت تھا ازل سے نہیں
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا
ہم نے کچھ اور بھی رنجین بنانا چاہا

سمجھ بوجھ کر پریش حال کیجے
کہیں کوئی عرض متناہ کر دے

پہلے وہ جور پریشیاں تھیں
ادرا ب لطف پریشیاں ہیں

وہ نقاب آپ اٹھ جائے تو کچھ دہریں
خاطر اہل نظر حسن کو منظور نہیں
در نہ میری نگہ شوق بھی مجبور نہیں
اس میں کچھ تیری خطا دیدہ مجبور نہیں
جرات عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن
ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظور نہیں
دل دھڑکٹھکا ہو خواہی ہی ہر آہٹ پر
اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں
ہائے وہ وقت کہ جب بچے مدہوشی تھی
ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہو تجار
اہل عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

مارشل پلان

بنیاد اپنے وسائل پر رکھیں اور اس انداز کو وسائل میں اضافہ کرنے میں استعمال کریں اسی کے ساتھ یہ انداز دیتے وقت ان ممالک کے اندر دینی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور انھیں اس کی پوری آزادی دی جائے کہ وہ اپنی معاشی زندگی کو جس طرح چاہیں تشکیل دیں۔

برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں نے اس نقطہ نظر کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ بیرونی انداز ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اور اسی پر یورپ کی تعمیر کا دارومدار ہے۔ برطانیہ اور فرانس امریکہ کی طرف سے یورپ میں اس منصوبہ کو عملی شکل دیں گے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو اندازہ لگائے دے گی کہ ان کے اندر دینی معاملات میں مداخلت کمرے گی۔

سوئیٹ یونین اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوا اس لئے کہ سوئیٹ منافع طویل مدتی کے امریکہ کی سرپرستی میں ایک ایسا ادارہ قائم ہو جاتا جو یورپ کے ہر ملک کی معاشی زندگی میں مداخلت کرے گا اور اس کا تصفیہ کرے گا کہ کون سا ملک کس قسم کی صنعت قائم کرے گا اور اس طرح امریکہ سارے یورپ کو اپنا معاشی غلام بنالیا اس مسئلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں نے اسے کیوں نہ کر دیا اور مشرقی یورپ کے ملکوں نے قرضہ کی تھوڑی سی رقم کی خاطر اپنی آزادی کا سودا کیوں کر لیا۔

اس کا جواب بہت آسان ہے مگر شہنشاہ جگ میں تقریباً سارا یورپ تباہ ہو گیا۔ جنگ کے بعد پیداوار گر گئی۔ لوگوں کا غلاں ختم ہو گیا۔ بے روزگاری عام ہو گئی اور معاشی بحران پڑنے لگا۔ مشرقی یورپ کے ملکوں نے اس بحران پر قابو پانے کے لئے اپنے یہاں جاگیر داری، شادی، بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دیا اور سارے ملک کے لئے ایک معاشی منصوبہ بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ ممالک

مارشل پلان گزشتہ سال بھر سے ساری دنیا کا موضوع بنا ہوا ہے اور کوئی دن نہیں جاتا کہ اخباروں اور رسالوں میں اس کی موانعت اور مخالفت میں صفائی نہیں جھپٹے۔ خود ہندوستان میں لوگوں کو اس سے کافی دلچسپی ہو گئی ہے اس لئے کہ اکثر لیڈر اس کا چرچا کرتے ہیں کہ یہی منصوبہ کے تحت ہندوستان بھی اندازہ لگائے کرے۔ امریکہ کے سابق سینئر مشرکریڈیٹا جب یہاں تھے تو انھوں نے بھی اس کا بہت پروپیگنڈہ کیا اور سنا دیا کہ ہندوستان بھی ایک ہندو پلان بنائے اور امریکہ ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہے۔

اس منصوبہ کو شروع ہونے پر ایک سال ہوتا ہے اس لئے اسے سمجھنے کے لئے امور کی بحث کی ضرورت نہیں رہی ہے بلکہ ایک سال کے تجربات سے ہم کافی صحیح نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

اس منصوبہ کا اعلان سب سے پہلے امریکہ کے وزیر خارجہ مارشل نے ہارورڈ میں کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ پورے جگہ کی وجہ سے بڑا تباہ ہو گیا ہے۔ وہاں معاشی بحران برہم رہا ہے امریکہ کی خواہش ہے کہ وہ یورپ کی مدد کرے تاکہ وہاں کی زراعت اور صنعتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اور یہ ملک بحران سے نکل سکیں اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خود یورپ کے ملکوں کو اس کا تصفیہ کرنا چاہئے کہ انھیں کس قسم کی امداد کی اور کتنی ضرورت ہے اور اس کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک کانفرنس کی جائے اور سب ملک مل کر ایک مشترکہ پروگرام چلیں کریں۔

اسی کے مطابق جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں سوئیٹ یونین برطانیہ اور فرانس کے وزیر داخلہ کی ایک کانفرنس میں یہی پہلی سوئیٹ یونین کے نمائندوں نے امریکہ کی امداد کا یہ مقدمہ کیا اور کہا کہ بات بڑی قابل قدر ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ یہ امداد یورپ کی ملٹی تعمیر کے لئے اسی وقت مفید ہوگی جبکہ یہ تمام ممالک اپنی تعمیر کی بنیاد اسل مدد پر نہ رکھیں بلکہ اپنی

بڑی تیزی کے ساتھ بحران سے نکل رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی یورپ میں بھی ایک ایسی طرح سرمایہ داری نظام عادی ہے۔ پیداوار منصوبہ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار سرمایہ داروں کے منافع پر ہے اور اس لئے بحران گھٹنے سے بچا جاتا ہے اور برقرار رکھا جاتا ہے لہذا سرمایہ دار دولت لوٹ کر اور دیر جوتے جاتے ہیں اور غریب اور مریض ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے افزائش اور زرخیز بازاری کے ساتھ ساتھ بے روزگاری اور فاقہ کشی شرمی جاتی ہے۔

مغربی یورپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو موجودہ سرمایہ داری نظام ختم کر کے صنعتوں کو قومی ملکیت بنا کر منصوبہ بندی کریں یا بحران بڑھتا چلا جائے۔ دباؤ کے حکم سے سرمایہ دار سرمایہ داری بھی باقی رہ سکتا ہے جتنے ہیں اور ساتھ ہی بحران کو بھی روکنا چاہیے ہیں چنانچہ جب امریکہ نے ادا کا اعلان کیا تو وہ اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اپنی آزادی کیچنے پر تیار ہو گئے۔

اب دوسرے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ جو خود سرمایہ دار ملک ہے اس قدر جھڑپ کیسے بنایا اس کی جھڑپ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ یورپ سے سرمایہ داری ختم ہو جائے اور نہ ہی وہ یہ چاہتا ہے کہ جنگ میں امریکہ کا نقصان نہیں ہو بلکہ سرمایہ داروں نے دنیا ڈھائی لگا کر بڑھتی ہے اور اس کے لئے اسے منڈیوں کی تلاش ہے اور اس لئے وہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں کو معاشی طور پر غلام بنانا چاہتا ہے تاکہ انھیں اپنی منڈی بنائے۔

۱۹۲۹-۳۹ء کی امریکہ کی اوسط برآمد سالانہ ۲۴ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۳۰ فی صد تھی۔ ۱۹۳۹ء میں یہ ۱۰۰ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۴۰ فی صدی اور ۱۹۴۷ء میں ۱۵۰ کروڑ ڈالر یا کل پیداوار کی ۷۰ فی صدی ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں درآمد ۱۰ کروڑ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال میں امریکہ اپنا مال بہت زیادہ قیمت پر بیچتا رہا اور وہ مال سستے داموں خریدتا رہا یورپ کی معاشی زندگی پر ان کا کنٹرول بڑھتا رہا اسے سفادات اور مہم کا نام دیتا رہا۔

ماہرین کی تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے مغربی یورپ کے ۱۷ ملکوں کی کانفرنس ہوئی تو پہلے ہی دن سے اس کی اصلی تصویر سامنے آئے گی پہلے تو کانفرنس میں بین الاقوامی بین الاقوامی بین الاقوامی بحث کے بعد سب نے ملکر ایک مشترکہ فہرست پیش کی اور چار

سال کے لئے ۹۰ کروڑ ڈالر کا مطالبہ کیا۔

امریکی اتنی بڑی رقم اور چیزوں کی فہرست دیکھ کر ناراض ہو گیا۔ نائب وزیر خارجہ جیکبین اور گریس نے اور اس کے ۶۰ کروڑ کر دیا۔ جب یہ تجویز امریکی حکومت کے سامنے آئی تو اسے اور گھٹا کر ۵۰ کروڑ ڈالر کر دیا۔ اور اس کے بعد یہ تجویز کانگریس میں پیش ہوئی تو امریکی گری گئی اور صرف ایک سال کے لئے خارجی امداد منظور کی گئی۔

اس کو عملی شکل دینے کے لئے امریکہ نے یورپ میں اپنے سابق وزیر تجارت ہیری ٹریمن کو مقرر کیا اور امریکہ میں ایک کمیٹی بنادی جس کے صدر امریکہ کی کوئٹوں کی کمیٹی کے ایک سابق صدر ہانڈین مقرر کئے گئے۔

یہ کمیٹی اتنی طاقت ور ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ممبر اس کے متعلق کہا تھا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے سوائے مرد کو خود بنانے کے۔

ہانڈین ان ۱۷ ملکوں میں سے ہر ایک کی معاشی زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ امداد روک سکتا ہے۔ اور انھیں اس پر مجبور کر سکتا ہے کہ صرف انھیں ملکوں سے تجارت کریں جن کی وہ اجازت دے۔

جن مسئلوں میں ہانڈین نے ان ملکوں میں سے ہر ایک کے سامنے معاہدہ کا ایک مسودہ پیش کیا اور کہا کہ وہ تین چار فی صد اس پر دستخط کر دیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہر ملک کو جو امداد ملے گی اس کا نصفہ ہر سال کانگریس کرے گی۔ امریکہ ان میں سے ہر ملک کو اپنے مسئلہ کی قیمت کرنے پر مجبور کرے گا امداد ہر ملک کو ملی جائے گی اور وہ اپنی قیمت کرے گا۔ یہ عالم کہ درآمد پر آمد کا محصول گھٹا دیں گے۔ یعنی اس طرح امریکہ نے صرف یورپ کے ان ملکوں کی معاشی زندگی پر اپنا کنٹرول قائم کر دیا بلکہ انھیں اس پر بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی خود امداد میں تجارت کے لئے بھی راستے کھول دیں۔

جب یہ منصوبہ منظور ہوا تو اس وقت سوئٹل یونین نے کہا تھا کہ یہ یورپ کو غلام بنانے کا منصوبہ ہے لیکن اس وقت یورپ اور امریکہ کے سارے پریس نے سوئٹل یونین پر حملہ کئے لیکن اب ایک سال بعد ہانڈین کے سرمایہ داروں میں بھی یہ دم غم نہیں رہا کہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھ سکیں۔ گزشتہ جنوری میں ہی میں برطانیہ کی قدامت پسند جامعہ کے

اخبار لوٹنگ نوز نے کھا تھا۔

”امریکہ میں دنیا تو خفک اندوں کا مسقوف ہے لیکن اس کے معاوضہ میں باری آزدادی چھین رہا ہے“
۲۰۔ مروجہ لوٹک اور رجعت پرست اخبار سڈے ٹائمز نے بالکل اسی طرح کی شکایت کی تھی۔

اسی تاریخ رائٹر نے فرانس سے خبر دی تھی کہ وہاں کے ذمہ دار طبقے یہ تجویس کرتے ہیں ’امریکی بڑے سرمایہ داروں کو کسی معاشی زندگی کا کھلا گھونٹ دیں گے۔‘

آخر کیا بات ہے کہ امریکہ کے قصبہ خواں آج اس کے ظلم منکھوئے کی جرأت کر رہے ہیں آج اصل حقیقت آنکھوں کے سامنے آگئی ہے اور امریکہ میں سود خوری سودی کی طرح پیش آ رہا ہے وہ بات چاہے کہ نہیں کہنا بلکہ صاف صاف منہ پر کہتا ہے۔ داخل ملک کو چلانے والے سب سے بڑے انٹر لوف میں نے ۱۳ مئی ۱۹۳۰ء کو سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”ہم بے فکر ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک پیسہ نہیں دیں گے جب تک ہمارے شرطیں پوری نہ ہوں۔“

اور یہ شرطیں کیا ہیں؟ برطانیہ کے سخت احتجاج کے باوجود فرانس کے سکے فراک کی قیمت کو کم کر دیا گیا۔ جرمن لینڈ میں امریکہ کو فوجی لاڈ دے دیئے گئے جرمنی کے ملک کے کر دیئے گئے۔ برطانیہ کا اسٹریٹنگ بلاک ٹرکرو یا تریکی کو بے شمار امریکی ہتھیار کھنڈے پڑتے ہیں اور ان کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں۔

ہاں میں نے ڈی جی میل کے نمائندوں کو کسی میں بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ اب امریکہ برطانیہ کی ایک تہائی درآمد کو بھی اپنے کنٹرول میں لے گا۔ برطانیہ کو اس پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کو قومی ملکیت بنانے کا پروگرام منسوخ کرے۔

جب مارشل پلان آیا تو یورپ کے ان سودہ ملکوں نے یہ سوچا تھا کہ اصل مدد سے وہ مشین خریدیں گے اور اپنے یہاں کی مصنوعات کو ترقی دے کر اس بحران سے نکلنے کا راستہ پیدا کریں گے اور اس لئے..... انھوں نے امریکہ کے سامنے جو فرہیت پیش کی تھی اس میں سب سے زیادہ جگہ مشینوں کو دی گئی تھی۔ لیکن ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

داخل آمد داخل کرنے والے ملکوں میں ایک بلجیم بھی ہے یہ صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں یہ زیادہ

تیار بھی نہیں ہوا لیکن یہ آج معاشی بحران کا سخت شکار ہے۔

غذائی صنعت کے لئے کچا مال نہیں ملتا ہے۔ فولاد کے کارخانے بند کر دیئے ہیں۔ یہاں کے فولاد کے کارخانوں کے وائس پریذیڈنٹ نے حالی ہی میں اخباروں سے کہا تھا کہ چند دن سے ہم ایک عجیب و غریب صورت حال کا شکار ہیں مارشل امداد سے ہماری حالت بہتر بننے کی بجائے بگڑ رہی ہے۔

یہی حال ناموس سوڈن اور ڈومارک کا ہے۔ ایک سال ہوتا ہے کہ مارشل پلان کے پرستاروں نے یقین دلایا تھا کہ اس امداد سے وہاں کی معاشی معیار میں انھیں اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ان تین ملکوں نے پانچ سال کے لئے کروڑوں ڈالر کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اس قیمت کا انھیں کوئٹہ، لوہا اور فولاد دیا جائے تاکہ وہ اپنے کارخانے چلا سکیں۔

انھیں نہ صرف اپنی امداد نہیں ملی بلکہ لوہا اور کوئٹہ بھی نہیں ملا اور امریکہ نے انھیں مجبور کیا کہ وہ لوہے اور فولاد کی بی

ہوئی چیزیں خریدیں یعنی اپنے کاغذ کے مندرکریں۔ سوڈن سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی لوہے کی پیداوار بڑھائے۔ لیکن یہ کچھ ذہات اپنی مصنوعات کے لئے استعفیٰ نہ کرے بلکہ جرمنی بھیج دے اور اس کے معاوضہ میں، اور کوئٹہ سگرٹ دے دیئے جائیں گے اور ڈومارک کو پندرہ مہینوں میں امریکہ کی بی بی اوئی کوٹنگ مینا دی جائیں گی جو وہ شاید پانچ سال میں بھی نہیں بچ سکے گا۔

ناموس جہاز کی اور ایلیوینٹر کی مصنوعات کو بڑھانا چاہتا تھا یہ تجویزیں رد کر دی گئیں اب اسے امریکہ کے پڑنے چاہئے خریدنے ہوں گے اور امریکہ کو مانا ہوا ایلیوینٹر کا سامان وہاں بھیجا جائے گا۔

اسی طرح آئنگلنڈ نے زرعی مشینری، لوہے فولاد اور فولاد کے سامان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اسے ملا کیا؟ شکر، کافی، مچھلی، اخباری کاغذ اور جیٹ۔ جن میں سے اس نے کوئی بھی چیز نہیں مانگی تھی۔ لیکن چونکہ امریکہ کے پاس حاصل ہیں اس لئے کسی کے سر تو منڈھنا ہی ہے۔

برطانیہ نے ۱۹۳۷ء میں جتنی موٹر بیل امریکہ سے منگوائی تھیں اس سال اس سے ۳۳ فی صدی زیادہ منگوئی ہیں گی اس لئے کہ لفٹینن صاحب جو مارشل پلان کے گزرتا دھرتا ہیں تو بڑوں کے بہت بڑے کارخانہ دار ہیں۔

یعنی یہ امداد اس لئے نہیں ہے کہ یہ مالک اپنی ضرورت

کی چیزیں حاصل کر سکیں بلکہ اس لئے ہے کہ امریکہ کا مل بکے
ان ملکوں کو اس طرح جو مال مناسپ ہے اس کے بکنے کے
بعد اس کی قبح مذکب انگلینڈ میں جب کر دی جاتی ہے اور اس پر
امریکہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی مل موچی مٹھن کے اخراجات
اسی فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔
جرمنی اور آئلی کو جو مال دی گئی ہے اس سے بے حساب
فائدہ اٹھا لیا گیا۔ اریوں روپیہ امریکی سیکور میں منتقل کر دیا
گیا ہے۔ کئی بڑے بڑے ناہر کار خاڑنے امریکہ منتقل کر دیئے
گئے ہیں۔ جرمن صنعتوں کے پیٹنٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔

منزلت جرمی کی تجارت پر روپیہ ہی طرح امریکہ کا قبضہ ہو چکا ہے
امریکہ جہاں کا بنا ہوا مال مثلاً سونے، کیمیا، آشیاد اور ذوقی کالسا
چھپت سے دھاموں وغیرہ ہے اور اس سے باہر سوزنا ہوتا ہے۔
ٹرکی جیسے ملک کو جو جرمیوں کے ساتھ پوری طرح ملا بھی
نہیں تھا، نہیں بٹھا گیا ہے جو قبضہ دیا گیا تو اس کے ہاتھ چارہ و زور
کشتیاں بیچ دی گئیں۔ جن کی قیمت پورے قرضے سے کم کر دی گئی
زیادہ ہے۔ ٹرکی میں امریکہ کے جو مشیر اور سفیر ہیں ان پر ترکی حکومت
کے حکمرانوں کا لکھ والہ رسالہ خارج ہوتے ہیں۔

حال ہی میں اس سلسلہ میں فرانس اور امریکہ میں جو معاہدہ
ہوا ہے اس کی رو سے فرانس کسی ملک سے ایسے تجارتی تعلقات پیدا
نہیں کر سکتا۔ جس سے امریکہ کے تجارتی مفاد پر ہلکا تر بڑھے۔
فرانس جو جرمی درآمد کرے گا اس کا استعمال امریکہ کے مشورہ
سے کرے گا۔ فرانس کو باکسٹل کو پیسہ اور دوسری کچھ دھاتیں
امریکہ کو بیچا کرنی پڑیں گی یعنی فرانس کو اپنے کارخانے بند کر کے
فرانس جے۔ فرانس میں امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کو دی
حقوق حاصل رہیں گے جو ان سیمیں کو حاصل ہیں۔ فرانس اپنی
معاشرتی زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات امریکہ کو دیتا رہے گا۔
معاشرتی تعلقات کے سلسلہ میں فرانس جس قسم کی قوت امریکہ کو دے
اسی طرح کی منزلت جرمی، جاپان اور کوئٹا بھی دے گا۔ یعنی
فرانس امریکہ کا محکوم بن جائے گا۔ صنعتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور
ایک ذمہ کی ملک بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ مارشل پلان کے ذریعہ نہ صرف یورپ کو غلام
اور زرعی ممالک بنانے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اب ان کی نوکلیار
سے بھی انہیں نکال رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ملاوٹین کے گٹھ نہیں

اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ نوکلیار بائیکاٹ کے دواڑے امریکہ
کے لئے کھول دیں۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ دہانہ پہ
پڑ رہی ہے اس لئے کہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ
نہیں تھیں۔

مثلاً ہندوستان بھی کو لیجئے۔ ۱۹۴۷ء میں امریکی درآمد
۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۱۰ گنا بڑھ چکی تھی۔

اس کے علاوہ انڈونیشیا، انڈونیشیا اور ملیم کا نکلیں
امریکی سرمایہ تفری کے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ ان نوکلیار بائیکاٹ
پر انشا اور قافلوں کے امریکہ کا بیٹا ہے کہ ساری دنیا کے کچھ مال
اور منڈیوں کو اپنے قبضہ میں کر لے۔ تمام دنیا کے صنعتی ملکوں کی
صنعتیں ختم کر کے انہیں زرعی ملک بنادے۔ تاکہ یہ سب کچھ مال
امریکہ بھیجیں اور امریکہ اپنا صنعتی مال دیاں بھیجے۔ جس طرح انگلستان
ایک زمانہ میں ہندوستان میں کیا کرتا تھا۔

اس سلسلہ کی یہ بڑی دیکھ چیز ہے کہ مغرب کے سامراجی مثلاً
برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس وغیرہ مشرق کے محکوم ملکوں (دربار)
ملا، انڈونیشیا وغیرہ کی انگریزی ہوئی عوامی تحریکوں کو کھینچنے
کے لئے کروڑوں روپیہ خرچ کر رہے ہیں اور اس کا سامان فائدہ
امریکہ اٹھا رہا ہے وہ قوت پر مشورہ دیتا ہے کہ دنیا والی اور
روپیہ دے دیتا ہے۔ اس سے یہ خطرہ ہر ہوتی ہے کہ امریکہ ساری
دنیا کے خلاف ایک ذمہ دہرست معاشرتی لڑائی چھڑے ہوئے ہے
اور پوری دنیا کو غلام بنانے کے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلا قدم ہی اٹھایا
کہ مارشل پلان کے ذریعہ یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور
مغربی یورپ کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مشرقی یورپ سے کوئی
تجارتی تعلق امریکہ کی مرضی کے بغیر نہ کرے۔

اس سے خود مغربی یورپ کو زبردست معاشرتی دھچکا
لگا۔ اس جنگ سے پہلے مشرقی یورپ مغربی یورپ کی ذمہ دہرست
منڈی تھی۔ مغربی یورپ کا صنعتی مال مشرقی یورپ جاتا اور
دہاں کا غلہ اور کھانے پینے کی ضروریات مشرقی یورپ سے ملتی
ہوتیں۔ اور یہ سلسلہ منقطع ہو جانے سے مغربی یورپ اپنی
غذائی ضرورتوں کے لئے امریکہ کا محتاج ہو گیا اور امریکہ
ایسے استعمال کر کے اپنا معاشرتی غلام بنائے جا رہا ہے۔

یعنی مارشل پلان سے مغربی یورپ خوش حال ہونے

کے بجائے تباہ حال ہو رہا ہے۔ اس امداد سے بڑے مالدار طبقہ اور حکمران طبقہ کی جبین توجہ بازاری سے بھر جاتی ہیں۔ لیکن عوام میں بے روزگاری اور افلاس بڑھ رہا ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود امریکہ کے سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے سوئٹ لینڈ اور جمہوری محاذ کو کمزور نہیں کر سکے اور نہ مغربی یورپ اور خاص طور سے فرانس اور آئلی میل در ایٹیا میں جمہوری تحریک کو کچلے۔ میں کامیاب ہو سکے۔ بلکہ یہ دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک انھیں کھلانے والے تیل کی ساری درآمدیں قائم ہو سکتا اور جب تک تسلط قائم نہ ہو اور ساری دنیا امریکہ کی مٹھی میں نہ ملے تب تک اس کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ اس لئے وہ اپنی کوشش بڑھا رہا ہے۔ امریکہ سمجھنے لگا ہے کہ صرف معاشی اور سیاسی لڑائی سے جمہوری طاقتوں کو زیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے فوجی لڑائی ضروری ہے۔

اور آج امریکہ یورپی تیزی کے ساتھ اس طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کی سرپرستی میں مغربی یورپ کا متحدہ فوجی محاذ قائم کیا جا رہا ہے۔ کانفرنس ہو رہی ہیں اور جنگی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ مغربی یورپ کی حکومتوں کے فوجی بجٹ تیزی کے ساتھ بڑھائے جا رہے ہیں۔ فوجوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ساری دنیا میں جنگ کا بخار پیدا کیا جا رہا ہے۔ امریکہ نے فوجی اڈے آئرلینڈ، آئلی، یونان، ترکی

جاپان، اسٹریا، مغربی جرمنی، ایران، مصر، شمالی افریقہ اور سعودی عرب میں قائم کر دیتے ہیں اور انہیں مضبوط بنایا جا رہا ہے۔

مغرب میں جرمنی اور مشرق میں جاپان میں فوجی منصوبوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ پرانے فاسٹمنٹوں کو کھیر سے منظم کیا جا رہا ہے۔ تمام ملکوں میں زبردستی رجعت پرست حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں مثلاً آئلی، یونان کو زیادہ غیرتیں بھی ہو چکا ہے۔ ایشیاء کی عوامی تحریکوں کو کچلنے میں پوری مدد دی جا رہی ہے۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عوامی قوتیں بھرپور اس کی مزاحمت کر رہی ہیں۔ خود امریکہ میں ہنسنری ویس اور ان کے

سامنے اس کی سخت مزاحمت کر رہے ہیں۔ مغربی یورپ میں مزدور تحریکیں، با برٹھ رہتی ہیں اور مقابلہ کر رہی ہیں۔ سوئٹ لینڈ اور مشرقی یورپ کی جمہوریہیں تیزی کے ساتھ معاشی اور سیاسی ترقی کر رہی ہیں اور مضبوط ہو رہی ہیں۔ چین میں رجعت پرست چیانگ کائی شک کی حکومت آخری سالوں کے رہی ہے اور برما، ملایا، انڈونیشیا اور دوسرے محکوم ملکوں میں زبردست عوامی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔

امریکہ آج بالکل اسی راہ پر چل رہا ہے جو راہ ہٹلر نے اختیار کی تھی لیکن آج عوامی طاقتیں بہت زیادہ مضبوط ہیں اور امریکہ کا بھی وہی حشر ہو گا۔ جو ہٹلر کا ہوا تھا۔

مگر یہ دل کہ مجھے جیسے اختیار نہیں کہ جیسے مجھ کو کسی شے کا انتظار نہیں کہ جس بہار کو سوچا تھا وہ بہار نہیں یہ صبح نو کا اُجالا ہے کچھ غبار نہیں

عالمی جعفری

ماہنامہ ایشیا فروری ۱۹۶۹ء

نہیں کہ تیسری محبت کا اعتبار نہیں گذر رہے ہیں کچھ اس طرح رات دن میر یہ کیسے مان لوں گلشن میں اب نہیں صیاد نیا زمانہ جنم لے رہا ہے خوف نہ کھا

دیوالی

وقار روح کے تاروں کو کیوں چھوا تم نے
چنتاری نظم مد دیوالی بہت ہی اچھی ہے
مگر — یہ رات کی گردن میں دیپ بالا میں
سیاہیوں میں اجالے کے بد نما ڈھبے
غریب مہشی کو جیسے زکام ہو جائے
یہ ٹٹمائے دے —
یہ ٹٹمائے دے صبح کا بدل تو نہیں؟

میں سوچتا ہوں کہ اس رات چمن و برما میں
کسی محاذ پر کتنے دسے چلے ہو چکے
جوان خون کی ہر بوند اک کرن بن کر
ایک ایسی صبح کی تشکیل کر رہی ہوگی
ہزار صدیوں کی تاریک سرد راتوں میں
بنی رہی ہے جو انسان کے خواب کا معبود
وہ صبح دور نہیں
اندھیری رات کے سینہ سے نور کا چشمہ
اُبلنے والا ہے

یہ ٹٹمائے دے — لکشی کے چرنوں میں
تبھی نے حسن حقیقت کے پھول ڈالے ہیں
وہ جن کو لکشی دیوی سے قرب خاص نہیں
کدروں میں اپنے بھی دیپک جلائے بیٹھے ہیں
شگستہ جھونپڑیوں کو سجا کے بیٹھے ہیں
کہ اس طرف بھی عنایت کی اک نظر ہو جائے
گروہ بھوسکتے ہیں
شگستہ جھونپڑیوں - ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں
کبھی بھی لکشی دیوی نہ مسکرائے گی
کبھی بہار نہ آن کے چمن میں آئے گی
اگر وہ خود ہی نظام چمن نہ بدلیں گے

سیاہیوں کے بزمائندے — رات کے بیٹے
ہمارے فکر و غمیل کو ماندھنے کے لئے
توہمات کی زنجیریں ڈھال لیتے ہیں
کبھی دیوالی بھی شب برات آتی ہے

کے آدھ ٹھکے ہن کی کیلو نہ پاپ کو اتنا بھی ٹوچے گا سوچ کر نہ دیا۔
 ہاں دیکھنے کے اندر یہ دیکھ کہاں سے بہہ کر گیا تھا۔
 صحت خوش خوش رام دین ایک لال ساڑی اور پہلا جہان پی
 بیٹی کے لئے لیکر شام کو اپنے گاؤں کو چلا گیا۔ جیسے جیسے اس
 کا گھر قریب آتا جاتا۔ اس کے پیادہ خوشی سے اٹھتے جاتے۔ وہ بار بار
 ہنس پڑتا تھا۔ سوچ کر کہ دعوتی دیکھ کر دوا تاج اٹھنے کی۔
 اور پوچھی اچھی ہی۔۔۔۔۔ رو پائے وہ کپڑے کھینٹ کے تیار کر کے
 لئے رکھ دیتے جس کے بھی تین جینے تھے۔
 کڑنات نے اپنا چوہلا دلا۔ درختوں نے نئے پائے پہنے۔
 کھیتوں نے رنگ برنگی چادریں اور ڈھکیں۔ گھر گھر میں جھولنے کے گیسٹ
 ڈھولکوں پر گونج اٹھے۔ جنگل میں بھیچرے جھون جھون کرنے لگے۔ اور بڑے
 نے نئے مارگ کا شروع کیا۔ بہت رت آگئی۔۔۔۔۔ نوجوان
 دلوں میں نیں منگیوں جاگ اٹھیں۔۔۔۔۔ اودہ۔۔۔۔۔ اور
 ۔۔۔۔۔ وہ پائے نہا کر اپنی وہ لال دعوتی اور پہلا چر پہنا۔
 ۔۔۔۔۔ کٹو لے کے پانی میں جوڑ دیکھا۔ تو غور جوڑ اس کی آنکھیں
 تھوڑی دیر کے لئے بند ہو گئیں۔۔۔۔۔ اپنی شارب سے خود ہی ہوں
 ہو گئی۔۔۔۔۔ چندا کی آنکھیں بھی اپنی بیٹی کی طرف اٹھ گئیں۔
 اس کے ہونٹ خوشی سے تھوڑے ہی سے تھکے۔ کہ کیا ایک اسکا منہ بیلا
 پڑ گیا۔۔۔۔۔ اس کا دل کا تب کیا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔
 ۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ جاتی تھی کہ غریب کے گھر کی مالہ۔۔۔۔۔ عزت اور دن
 سب کچھ ان دیر الوں کے کھیل کا سامان ہوتا ہو۔
 وہ بھی ایک دن وہ پاپی طرح جوان تھی۔۔۔۔۔ سنہ۔۔۔۔۔ اس نے
 اس کے گاؤں کے زچہ دار نے ایک دن کھیت پر کام کرتے ہوئے
 اس کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بڑے گرائی تھی۔ پڑ پڑ پر
 رہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ ظالم کی لاتیں بھی پیس۔۔۔۔۔ اس کی
 عزت کے بدلے میں اس کی کہہ رہی تھی۔ اگر کچھ ادنیٰ ادھر سے نہ ملے
 ہوتے۔۔۔۔۔ پائے اس بھوکے جالور کے ہاتھ ڈھیلے ہوئے تھے
 کس طرح جان لیکر بھالی تھی۔۔۔۔۔ وہ یہ سوچ ہی وہی
 تھی کہ وہ اپنی اٹھی۔۔۔۔۔ ماں۔۔۔۔۔ یہ ساری تھی اچھی
 لگتی ہو۔۔۔۔۔ ماں جو کچھ گئی۔۔۔۔۔ اور ہاں "اگر کچھ اٹھ گئی
 گئی۔۔۔۔۔ گھر سے تھوڑی دور پر دام دین نے وہ پائے لئے آگول
 کے پٹروں میں جھولا ڈال دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ پوچھی
 دھڑکی۔۔۔۔۔؟

زمیندار کا شوقین اکلو تانیا زمینچوں کو لکھتے ہوئے بڑی کام
 گزیر جھوٹ تھا۔۔۔۔۔ اپنے اردلی کے ساتھ اپنی ٹم ٹم پر بیٹھتے موسمی
 اور ان کا لکھتے لینے گھر سے نکل پڑا۔ اردلی جان مالک کی عادت
 سے واقف تھا۔۔۔۔۔ اور اسی لئے اس نے ٹم ٹم کا کوچ گاؤں کی طرف
 کر دیا۔۔۔۔۔؟
 اس شہر کے رہنے والے۔۔۔۔۔ عوامی میں پلے ہوئے اکلو نے ابھی
 نہ کیا جوانی دیکھی تھی۔۔۔۔۔ لیکن رنگا انری ہوئی۔۔۔۔۔ پاؤں
 اور لپٹا شک میں بھی ہوئی۔۔۔۔۔ ساڑیوں اور چھڑوں میں ڈھکی ہوئی۔
 ۔۔۔۔۔ لیکن آج اس نے قدرت کی خوبصورتی دیکھی۔ جس پر یہاں
 رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ جس میں عجیب الہیہ تھا۔۔۔۔۔ تھی مصیبت تھی۔
 اور جو رہ نہ تھی۔۔۔۔۔ آج اس نے وہ صحن دیکھا جو خود اپنے صحن
 نے تیر تھا۔۔۔۔۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔۔۔۔۔ ایسے اچھے
 اچھے پھول۔۔۔۔۔ اور دھول میں کھیل رہے ہیں۔۔۔۔۔
 اودہ اس سے تو زندگی کی بہت سی باتیں سجاتی جا سکتی ہیں۔۔۔۔۔
 کتنے لطف ہوں گے اس زندگی میں۔۔۔۔۔ کون لوگ سکتا ہے۔ ۸۵
 ۔۔۔۔۔ یہ سب ہمارا ہی تو کھاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم ہی فائدہ نہ
 اٹھائیں گے تو۔۔۔۔۔ ایک منٹ کی گھڑی کی الاپ نے اس کے
 ہوائی قلوں کی عادت کو اودہ۔۔۔۔۔ بنی حالت ہی میں ڈھال دیا۔
 ۔۔۔۔۔ وہ باہر کا کر پٹنگیں بڑھا رہی تھی۔
 ساری اس سے ڈھل گئی تھی۔۔۔۔۔ جھولے کے پچھلے پچھے سانپ کی
 طرح لہر لکھا رہی تھی۔۔۔۔۔ زمینچوں نے دیکھا اور۔۔۔۔۔
 دیکھا ہی رہ گیا۔ کس غضب کی جانی تھی۔۔۔۔۔ کیا جس کی
 بارش تھی۔ مصیبت نے جس کو جا رہا تھا لگا دیا تھے۔۔۔۔۔
 اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اپنی پوزیشن میں کبھی اس سے زیادہ
 خوبصورت لڑکی دیکھی ہو۔۔۔۔۔ ٹم ٹم کو لگی۔ اردلی نے مالک
 کی طرف دیکھا جیسے وہ مالک کے دل کا حال جانتا ہو۔۔۔۔۔
 زمینچوں کو تڑپا۔۔۔۔۔ جیسے شکاری گھات لگاتا ہے۔ کہ عمر سے شکار
 پر وار کرے۔۔۔۔۔ اردلی اور مالک میں اٹھائے ہوئے
 ۔۔۔۔۔ اور دونوں آگے بڑھے۔۔۔۔۔؟
 "لے لڑکی۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ لے۔۔۔۔۔ سنہی ہو جائیں۔ ذرا
 جھولا دو کو۔۔۔۔۔ اردلی نے آواز دیکر کہا۔ نیچے ایک بیت لئے
 صاحب کو جو روئے دیکھا۔ وہ سمجھی اور جھولا روک دیا۔
 "نہارا کیا نام ہے"

”روپا“
”کس کی لڑکی ہو،“
”رام دین کی“

ادھو۔ جو تالے بہاں نوکر ہے۔۔۔۔۔ تب تو کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ نرین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ بدیا بھی اس سے کوئی خطا ہوئی تھی لیکن اس بات سے اسے اس کی معافی مل گئی ہے۔ اُسے تسلی ہوئی اور کچھ ہنسنے پر خوشی کی جھلک دکھائی۔۔۔۔۔ نرین کچھ ادا ہو گیا۔۔۔۔۔ سوچا کہ بیڑیا چھین گئی ہو؟
”دیہ گھاس جو بیڑی ہو۔۔۔۔۔ ذرا اٹھا کرو تم ٹم کے گھوٹے کے آگے ڈال تم۔“۔۔۔۔۔ اردلی نے مونچھوں پر بتا دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔؟

مالک کا کام بھلا کیسے ثابتی۔۔۔۔۔ اردلی وہیں رہ گیا اور نرین اس کے ساتھ چلے گیا۔

بدیا گھاس ڈال کر گھومی ہوئے کو مین نرین نے اس کی کمر بنے ہاتھوں میں جکڑ لی تھی۔ اور ٹم کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ روپا نے مالک کا چہرہ دیکھا اس کی ذہن پر سلی آنکھیں دیکھیں۔ اس کی گرم سانس سے اپنے کو جلتے پایا۔ اس نے اپنے بدن کو برہنہ کرنے پایا۔۔۔۔۔ وہ ڈرے کانپ گئی اور دھڑکھڑاس کے منہ سے نکلی۔۔۔۔۔ ”کیا کرتے ہو مالک مجھے چھوڑ دو۔“۔۔۔۔۔ میں ٹم کے اندر نہ جاؤنگی۔

نہیں۔۔۔۔۔ مجھے دوسرے نہ چاہئیں۔۔۔۔۔ میری ماں مجھے دھونڈ رہی ہوگی۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ بچنے میں چھنی بیڑیا کو

باز اس کے آنسو کی حیرت نہیں دیتا۔۔۔۔۔ روپا نے دوسرے اپنے پاؤ کو آواز دی۔۔۔۔۔ نرین نے اس کا منہ مل دیا۔۔۔۔۔

وہ مصیبت کے درد میں ڈوبی ہوئی پکا جھگ میں گونج اٹھی۔۔۔۔۔ اور رام دین کے کانوں میں بھی۔۔۔۔۔ جو حکایت سے بھرنی بیڑی توڑ کر گھروٹ رہا تھا۔۔۔۔۔ لاشی سبھاٹا ہوا ہوا کے مانند وہ ادھر لپک گیا۔

۔۔۔۔۔ رام دین تڑپ کر ایک گز زمین سے اچھل پڑا۔ جیسے بجلی اس پر گری ہو۔۔۔۔۔ جیسے کسی نے اس کے سینہ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔۔۔۔۔ جیسے دو بہاڑوں کے بیچ رکھ کر اس کا دل سل دیا ہو۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نرین

نے اس کی بھول سی ہوئی کے لات ماری۔۔۔۔۔ رام دین کی آنکھیں خون سے لگ گئیں۔ اتنی دور کا بھڑوہا تھا مارا کہ نرین

نے اس کی بھول سی ہوئی کے لات ماری۔۔۔۔۔ رام دین کی آنکھیں خون سے لگ گئیں۔ اتنی دور کا بھڑوہا تھا مارا کہ نرین

نے اس کی بھول سی ہوئی کے لات ماری۔۔۔۔۔ رام دین کی آنکھیں خون سے لگ گئیں۔ اتنی دور کا بھڑوہا تھا مارا کہ نرین

زمین چاٹنے لگا۔ اتنے ہی میں غصہ کم ہوا، اس کے سر پر اور نہ پر نہ معلوم کتنی لائیں لگائیں۔۔۔۔۔ وہ تو اسے ماری ڈالتا اگر روپا اسے اپنے ساتھ نہ کھینچ لیتی۔۔۔۔۔ روپا ابھی تک مسک رہی تھی اور رام دین زخمی سانپ کی طرح بھینکارے مار رہا تھا۔۔۔۔۔ روپا کا بدن ڈرے کانپ رہا تھا اور رام دین کا شے اور اتقام کی آگ سے۔۔۔۔۔ چندانے جب یہ حال سنا۔ اس کا خون سر ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے صرف یہ نکلا۔۔۔۔۔

”کیا دین آدمیوں کا یہی بھائیہ ہو تہا پریشور“

تھوڑی دیر بعد اردلی ٹوٹا۔ مالک کو چھوٹے پڑے دیکھا۔۔۔۔۔ جان باقی تھی۔ گھر بھاگنے گیا۔۔۔۔۔ زمیندار کو سب بات معلوم ہوئی۔ اپنے بیٹے کی اس درگت پر خون کھول گیا لیکن اس وقت چپ رہا۔ یہ کہہ کر ایک مودوں میں اس کین کو اس کا منہ کچھا دو

”کا۔۔۔۔۔؟“

سر سے اچھا راستہ اپنی عزت کی بخت کا ان غریبوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی شادی فوراً تین چار دن کے اندر ہی کر دی جائے۔

۔۔۔۔۔ کرشن داس پاس کے گانوں کا انھیں غریبوں میں ایک کلاہ کا تھا جو اس ضلع کے اچھوتوں میں پہلا گریجوٹ تھا۔

۔۔۔۔۔ اس نے دو پکاویک دن اسی کے گھر پر رکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ راضی تھا۔۔۔۔۔ شادی طے ہو گئی۔

۔۔۔۔۔ اس واقع کے تیسرے دن کی

غریبوں کے گھر کی شادی ہی کیا۔ دوسرے گاؤں سے لڑکا اور اس کے پتا۔ چاچا چلے آئے۔ گانوں کے برہمن نے شادی کی رسم

ادا کر دی۔۔۔۔۔ بڑا کی تیاری ہونے لگی۔ اپنے منکر کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنے والی۔ باپ انھیں لے کر گھر سے نکلے۔

۔۔۔۔۔ دیکھا تو دو ایک لال کپڑی والے سپاہی اور کچھ زمیندار کے نوکر رام دین کا انتظار کر رہے تھے۔

بڑے کچھ کے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں والیں۔۔۔۔۔ یہی ہیں بلکہ بیڑوں میں لوہے کی بیڑیاں بھی۔۔۔۔۔ جس سے وہ بھاگ نہ جائے۔

۔۔۔۔۔ مجھے آخری بار اپنی بیٹی کو ملے تو گالینے دو۔ یہ کہہ کر رام دین اپنی بیٹی کی طرف بڑھا۔ لیکن حاکم صاحب کے

بید کی ایک جوت نے رام دین کا منہ پھیر دیا۔۔۔۔۔ بید اس کی آنکھوں پر پڑا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ چندالے سے سنبھالنے کے

پزند چیں، چیں، کر کے اڑ گئے دلم دین نے بوباکو
 بلا کر دیا ان سب بھنا ہوں گے دریا ہاں یہ تھا دیا
 کی شادی کا مقرر ہوا اس کی زندگی کے سب سے زیادہ
 خوشی کے وقت کا ہوا ؟

لے آگے بڑھی۔ ایک دن اس کے ہاتھوں پر کئی پٹا
 ادھر وہ لوہے کی بیڑیاں بھٹکا رہی تھیں۔ اور ادھر چندا کی مہاگ کی
 بیڑیاں بھینچن چھن کر کے زمین پر بکھر گئیں پر دے سے
 ڈھکے منہ سے ایک چمچ نکلی چھپتے ہوئے

افلاس

ضمیر کی ملامت و ندامت، احساس و قار کی پامالی،
 نفرت، حقارت، افسردگی، انسانیت کے حلقہ میں ناقابل
 بیان تلخی !

کس طرح ایک مفلس اس تلخی کو نگھٹتا ہے اور
 کس طرح اکثر اوقات بھی غذا بھنگنے اور پیٹ بھرنے کے
 لئے دستیاب ہوتی ہے۔ افلاس ان حقائق کا معلم ہو۔
 افلاس کچھ اور حقائق کا کشف بھی ہو سکتا ہے
 اگر انسان اس سے بے نیاز ہو کر اپنی روحانی دولت کا
 احساس کرے۔ اگر قدرت اور سماج کی نا انصافی کیسرا
 تیری جستجو کے ہاتھ پڑ جائے تو تیرے ٹوٹے ہوئے اعضاء
 میں آہن کی سی صلابت اور شعلے کی سی حرارت دوڑنے
 لگے۔

نسمبھی یہ سوچ قدرت اندھی کیوں ہے؟ اور کبھی یہ
 غور کر سماج کی آنکھیں چھوٹی اور دانت بڑے کیوں ہیں؟
 کیا تو اس کی طویل انگلیوں میں دو دو گر کے ناخن نہیں دیکھتا؟

زندگی کا ایک ناقابل برداشت دور! جس کے دن
 بغیر روٹی کے، قصیمیں بغیر تازگی کے، مٹا میں بغیر روشنی
 کے اڈراتیں بے خواب ہوتی ہیں۔

بے آگ کے چولے، بغیر روشنی کے ہفتے اور امید
 سے تہی مستقبل، کپکپاتا ہوا احساس، لڑنے ہوئے ادا
 تھر تھراتے ہوئے پاؤں اور شکست خوردگی کے گہر میں لپٹے
 ہوئے تصورات آنکھوں میں احساس کمتری کا سہ درپونہ لڑی
 پھیلائے، ثابت و سالم لباس میں سے نکلی ہوئی کنپیاں اک
 غمی گذری ٹوپی پر زندگی کا بارگراں، چہرہ پر آفات کی گرد،
 لبوں پر نفسِ گرم کے جھکڑ، بغیر تلوں کی چوتیاں تپتے ہوئے
 راہیوں کی تپش سے محفوظ برسات کے پانی کی پناہ تھا ہیں
 اور پھر تاریک و خاموش گھر میں دالسی اور پھر لڑتے ہاتھوں
 سے دروازے کا ہڈ کرنا، وہ ہسالیوں کی طعن زنی اور گرجتی
 ہوئی قرض خواہی سے محفوظ ہونا، وہ مکاندار کی گرج و ماراؤاز
 سے بچنے کی کوشش ناکام۔ سچ ہے افلاس زندہ صحت ہے۔

تغ

غزل

بے سوز پیشِ نغمہ، بے ذوقِ خلشِ محفل
 کچھ اور ابھی تر سے زخمہ کو ربابِ دل
 ناقہ کا نشان پیدا، غائبِ زلفِ محفل
 منزلِ جیسے ہم سمجھے تھی گردِ رہِ منزل
 غافل نہ رہے دل کے سرمایہ سے اہلِ دل
 کھو نا ہے اسے آساں پا نا ہو اُسے مشکل
 پیمانہ و ساغر بھر پیمانہ و ساغر ہیں
 دریا سے نہیں بھتی لبِ تشنگی سے اصل
 اُس راہ کو طے کر لے گزرے مہِ وسال اپنے
 جس راہ میں تھا اپنا ہر نقش قدمِ منزل
 عجبی کے مناظر تو آنکھوں سے نہاں ٹھہرے
 دنیا کی طرفِ دل کی وحشت نہیں کیوں ہائے
 واغظ! ترے دوزخ کی یہ آگ معاذ اللہ!
 جینا تو کٹھن تھا ہی مرنا بھی ہوا مشکل!

اور انسان دوستی کی قدر دہا کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا شمار غلطی اور ترقی پسند ادب میں کیا جاتا ہے۔

کبھی منٹو ایسے ادبی تجربے کا گریبان پہنے جو اکثر پڑھنے والوں کو متفرک کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی چیت وسطی کہانی "موتری" جس میں اس نے آج سے چار سال پہلے آکاہی کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کتنی علاقیت اچھالی جائے گی، اس انوکھے اور بے دھج دماغ نے (جو فادات کی ہولناکی) سے پوری حد تک متاثر ہوا تھا جس کا اظہار اس کی کہانی "گھول دو" اور (راغوشہ محمدیوں کے ہلکے میں اس کے مضامین میں ہوتا ہے) فادات کا ایک دوسرا پہلو بھی دیکھ کہ قتل اور لوٹ کرنے والوں میں مشاق اور عادی مجرم ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مسخ کردہ خرد تک سیدھے اور بے وقوف قسم کے مولی انسان تھے جن سے وقتی جنوں کے زیر اثر شرمناک مذمات لائے جاتے تھے۔ مگر غلطی سیران میں ان قاتلوں کا "ماٹری" ہیں۔ "بھولا پین" فادات کی ہولناکی کو کم نہیں زیادہ کرتا ہے۔ اگر ایک پیشہ و عادی مجرم قتل کرتا ہوا پایا جائے۔ تو کوئی خاص تعجب کی بات نہیں مگر جب سیدھے سادھے انسان انسانیت کا راستہ چھوڑ کر قتل و خون کرنے ہوئے پائے جائیں تو سمجھ لیجئے کہ ہلکے تمدن اور تہذیب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

صحافت کا بڑا نا اموں ہے کہ اگر ایک شخص نے ادبی کو کاٹ لیا ہے تو یہ کوئی خامی ہم خبر نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کے کو کاٹ کھائے تو ضرور ایک منہ کی خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ "سیاہ حاشیہ" والے لطیفوں کو شائع کر کے منٹو اپنے انوکھے اور بے دھج دماغ میں فادات کے اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا تھا کتاب کا نام ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ ان حرکتوں کے بیان سے لطف اندوز ہونا یا کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقت کے نشیپے میں انسانیت کو اس کا نیا اور مسخ کردہ انجیل جیٹک کردہ چہرہ دکھانا

چاہتا تھا۔ تاکہ ہم پہچان لیں کہ فادات میں کون اور لوٹ مار کرنے والے صرف تھے عادی مجرم اور غنڈے ہی نہیں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمی بھی تھے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ "سیاہ حاشیہ" لکھنے اور شائع کرنے میں منٹو کی نیت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہوگا کہ ان فادات کے انتخاب میں وہ کسی فرقہ وارانہ جذبے سے متاثر نہیں ہوا ہے اور اس نے "ان" "ماٹری" قاتلوں اور لٹیروں کی فہرست میں ہندو، مسلمان، اور سکھ سب کو شامل کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ باوجود اپنی تنگ بینی کے منٹو نے کتاب لکھ کر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ توجہ عسکری کا دیباچہ ہی ہے جس میں منٹو کی تعریف کے پانے نہ صرف ان دنوں ترقی پسندوں پر حملے کئے گئے ہیں بلکہ منٹو کے مقاصد اور اس کی ادبی قدموں کو سب سے کمر کش کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن عسکری کو اپنی رجعت پسندانہ ذہنیت پر پردہ ڈالنے کے لئے منٹو کی آڑ لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ تعجب اور انوکھ قسم کی عسکری اور ترقی پسندوں کی ضرورت پڑی۔

عسکری کے دیباچے سے قطع نظر بھی منٹو "سیاہ حاشیہ" نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔ جس نظر سے منٹو نے فادات کے اس منہ تک المیہ کو دیکھا ہے۔ بہت کم پڑھنے والے وہ نظر یا سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو ان ہولناکیوں کو بڑے کر ہی پڑھتے، ظلم اور حیوانیت کے بعض مناظر صرف خون کے آنسو روکنے کے لئے ہوتے ہیں۔ دیباچہ منٹو کا نہ ہندو بھی نہیں ہوتا۔ منٹو تاہم نشر سراج کے پھوڑوں اور ناسودوں میں سے پیپ نکالنے کے لئے اکثر موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر اس نشر سے اس نے چالیس کروڑوں کے پھوڑوں کو نہ چھڑا ہوتا تو پتہ تھا۔

بامن آمیرش اُو صورت موج است و کنار
دبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

گورگی اور ٹاسٹائے

اس کو خواہ اتفاق کی تکتے خواہ قدرت کا طوقہ کار خیال کیجئے کہ بیشتر مشاہیر کی زندگی دنیاوی اعتبار سے معائب و آلام کا شکار ہی رہی۔ اول تو بہت کم ایسے ہیں جو آسودہ گھروں میں پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی انھوں نے بھی شہرت کی زندگی اختیار کر لی۔ شاہد عشرت اور مصائب کی زندگی ہی انسان میں وہ خاص اردک اور نفسی پختگی پیدا کرتی ہے جو اس کو دنیا کا امام بنادیتے ہیں جتنا ہی اور نفسانی اعتبار سے بھی شایان انسان اسی وقت تکمل ہوتا ہے جبکہ وہ آسودگی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر دواجی اقدار کو اپنے لیے شعل راہ بنالیتا ہے۔

گورگی بھی مثل دیگر مشاہیر کے ایک نادار گھر میں پیدا ہوا اور ابھی کچھ ہی تھا کہ یتیم ہو گیا۔ گورگی کے نانا نانی اس حادثہ سے بڑے پریشان ہوئے۔ کچھ دن تو وہ خاموش رہے پھر انھوں نے اپنی بیٹی (گورگی کی ماں) کا نکاح ایک گھڑی ساز سے کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ گھڑی ساز اتفاق سے اتنا بدصورت تھا کہ گورگی کی ماں اس سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوئی تھی۔ گورگی اسے بچپن کے حالات تکبند کرتے ہوئے لکھتا ہے، "اس زمانے میں تیسری ماں بڑی افسردہ تھا تھی، اس کی رنگت اوڑنے لگی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہوا گیا تھا۔ ان بچپن کے زمانے میں مجھے یوں ہی سا خیال تھا کہ نانا میری ماں سے زبردستی پھر کرانا چاہتے ہیں جس کو میری ماں پت نہیں کرتی اس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک روز نانا نے دروازہ سے سڑنکالا اور میری ماں سے کہا، "وہ آجیا ہے دروازہ کھڑے ہیں کہ آجیا، میری ماں نے یہ سن کر تیش تک نہ کی اور گردن پیچے کیلئے ہوئے دریافت کیا، کہاں آ جاؤں؟" نانا بولے، "خدا کے لیے

آ جاؤ۔ وہ اچھا آدمی ہے اپنے گھڑی سازی کے کام میں ہوشیار ہے اور ایکسی (گورگی) کے ساتھ باب کا سا سلوک کرے گا۔ ماں نے تیزی سے جواب دیا، "میں کہہ رہی ہوں میں نہیں کروں گی، اس جواب پر نانا لال چلے ہوئے اور چلائے، چلتی ہے تو چل ورنہ میں تیری چٹیا کھڑکھٹیا ہوا لے جاؤں گا۔" اس پر میری ماں جلتی، ہجم کھینچ گئے، وہ غصہ میں گھڑی ہو گئی اور اس نے سوائے ایک کپڑے کے باقی تمام کپڑے اتار ڈالے اور کہا، "ماں اب تجھے کھینچو، اور وہ خود دروازہ کھول کر اسی حالت میں باہر جانے لگی۔

91

میرے نانا، آپا بہت تھکے انھوں نے بہت دانت سے اور کہا، "میری عزت خاک میں ملانی ہے تو میں تباہ کر دے گی، نانی اناں پہلے ہی سے دروازہ روک کے گھڑی عین اور میری ماں کو پرستے اس طرح ڈھکیل رہی تھیں جیسے مریضوں کو ڈورے میں ڈھکیلے ہیں میری ماں نے نانی سے کہا، "ماں کھول کر سن لو میں اس کے پاس نہیں جانے کی" اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گورگی کس طبقہ کا آدمی تھا اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی تھی۔

اگر مصائب صرف یہیں ختم ہو جاتے تب بھی غنیمت تھا لیکن گورگی کی قسمت میں طہریں، سیر ہو نا بھی لکھا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد گورگی کی ماں فطری جذبات سے متاثر ہو کر ایک شریف زادے کے ساتھ سبکدوش ہو گئی۔ وہ مایاں ابھی کالج ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ جب تک روپیہ رپاں اسکو میں خوب پیش کرتے رہے جب روپیہ ختم ہو گیا تو روایت بھی ختم ہو گئی اور وہ لکھا صاحب بھی اس پر مجبور ہوئے کہ ساس و سسرالے پاس پناہ میں۔ گورگی کی زندگی کا یہ زمانہ بہت تاریک گزرا ہے،

کیونکہ اس کا سوتیلہ باپ نہ صرف گوری کے ساتھ بلکہ اس کی ماں کے ساتھ بھی مڑا سلوک کرتا تھا۔ اب اس نوجوان کا دل محبت سے سرور چکا تھا۔ گوری کی ماں جب بائیس سو سے واپس آئی تو حالت اسید میں تھی اور کچھ اس وجہ سے اور کچھ مالی مشکلات اور شوہر کی بے جرمی کے سبب اپنی رونق کھو رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی صورت کا مذاق اڑاتا اور چڑانے کے لئے اپنی ہی عیاشیوں کے اضافے اس کے سامنے قریہ بیان کرتا۔ درود اس کی ان باتوں سے اس قدر کڑھی کہ اس کو دق ہو گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے گوری دیوار کے پاس کھڑا تھا اگلاس نے اپنی ماں کو نوجوان سے یہ درخواست کرتے مٹا کر وہ بھی اس صورت کو دیکھنا چاہتی ہے جو نوجوان کی محبت کی مالک ہو گئی ہے۔ گوری کی اپنی سوانح میں لکھتا ہے: میں یہ سن ہی رہا تھا کہ دیوار کے نیچے سے گونے کی آواز آئی۔ میں فوراً لپکا۔ دیکھنا کیا چوں کیسری ماں گھٹنوں کے بل گری پڑی ہے۔ اس کی برتی حالت ہے اور میرا سوتیلہ باپ پکدار بو شاکر بیٹے پاس کھڑا ہے اور اس کے سینے پر غصہ کریں مار رہا ہے۔ گوری کو یہ منظر دیکھ کر تباہ نہ رہی اور اس نے نیز سے چھری اٹھا کر اسے سوتیلے باپ کے ساری جس سے کپڑے تو بچے۔ لیکن چوٹ نہ آئی۔ گوری کی آگے چل کر لکھتا ہے کہ اسی روز شام کو وہاں جان میرے پاس آئیں۔ مایکسیا اور روکر کہنے لگیں، یہ خود کو بچر محسوس کرتی ہوں مجھے صاف تر دقت یہ اس زمانے کے واقعات ہیں جب گوری چھ سال کا تھا۔ جب ۶ سال کا ہوا اس وقت لکھتا ہے: چالیس برس گزر گئے لیکن آج بھی اس کیفیت پر کو ایک عورت کی چھاتی پر ضرب لگاتے دیکھتا ہوں۔ اس چھری کے واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد گوری کا سوتیلہ بھائی پیدا ہوا۔ ماں نے بھی اس کے زمانے ہی میں بھتیجی اور ماں کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ بچہ بھی چل رہا۔

ماں کے بعد گوری کی نانا نانی کے سوا کوئی تھا چنانچہ وہ وہیں رہنے لگا۔ یہاں کا ماحول بڑا خراب تھا۔ گوری کے اموں خرابی، کبابی اور عیاش تھے۔ ہر وقت یا تو آپس میں یا اپنے ماں باپ سے برسر پیکار رہتے تھے ایک دن ایسی لڑائی ہوئی کہ گوری کی نانی کی بائیس ٹوٹ گئی۔ گوری کا استبداد بھی ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گزرا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو نانی نے اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن اسکول کے وقت کے علاوہ گوری ایک پوری بلے طرحوں پر متمدنی۔ دھیان اور کیلیں وغیرہ چننا۔

پھر نانا اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا نانی ماں کو لا کر دیتا۔ لوگوں مشروط ہوا تو تعلیم ختم ہو گئی نانی نے ایک جوتے والے کی دکان پر لڑ کر لایا۔ اس دکان پر پہلا سبق یہ ملا ہے کہ انہی کے بغیر گوری نہیں ہوتی۔ گوری اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ دکان کے نوکر بے ایمان تھے دکان کی چیزیں اڑا لیتے تھے۔ ایک دن تریب کے گریج کا دربان میرے پاس آیا اور مجھے پھسلانے لگا کہ اس کے بر کا ایک جوتا چرا کر اس کو دیدوں۔ میں نے کہا اچھا تم بڑے آدمی ہو تمہارے سفید بالوں کا خاطر مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربان بولا اگر میں تمہاری چوری کا ذکر مالک سے کروں تو کیا ہو؟ دربان کی اس دھمکی سے میں بہت ڈر رہا۔ یہ خوف دیکھ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور چوری کے ادا دہہ مجھے بڑا بھائی لگا۔ بھڑکنا۔ میں اس لڑکے کی خیال کرتے ہو کر انسان انسان کے ساتھ بُرائی نہیں کر سکتا۔ ابا اتم مجھے یہ یقین ہو کہ گوری کی ملازمت چھوڑ کر نانا نانی پر بار ہو گیا۔ اب نانی اور نواسے مشکل میں جاتے اور وہاں سے دس بھری اور مشکل میوے چن لاتے اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا وہ نانی نانا کو لا کر دیدیتیں۔ اس پر بھی نانا نا نہیں لگاتے، غراتے، اور کہتے تم تو کھانا جانتے ہو مگر انہیں جانتے کچھ دن بعد نانی نانی نہیں کے لڑکے کے دفتر میں گوری کو ریل سالانہ پر مدعو کیا۔ وہاں رشتہ کی نانی نے گوری کو نا پریشان کیا کہ ایک مذکورہ اس نے بیج کا شے لانے کے لئے گوری کو پیسے دیئے تو کھائے ناشتہ لے کر دفتر جانے کے وہ دربارے والے کے کنارے نکل گیا اور ایک جہاز پر ملازمت کر لی خدا کی قدرت کہ اس جہاز کے بڑے باوجودی کو کتا میں سننے کا شوق تھا اس نے گوری کو یہ خدمت سپرد کی۔ اس طرح گوری کو اٹھانے پڑے گا خوب موقع ملا اور شوق بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ یہ ملازمت ایک خاص مبادیگ کی تھی اس لئے جب وقت پورا ہو گیا تو ملازمت بھی ختم ہو گئی اور گوری کے سامنے پھر نئی کا مسئلہ اٹھایا وہ تلاش معاش میں کشمیر، مشہر، بھرتا پھر ناٹھلس پہنچا جہاں میں اتفاق سے اس کی ایک ایسی شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ہمدردی نے گوری کی زندگی نیا دی۔ یہ شخص کی آزادی نامی ایک انقلابی تھا جو سا بریا میں چھ سال کی قیدی با مشقت کاٹ چکا تھا اس کا ایک بہت اچھا ذاتی کتب خانہ بھی تھا یہ شخص گوری کا مشتاق ہو گیا اور اس نے آوارہ گرد گوری کو اپنے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی۔ جب دوسری بڑھی تو ایک دن کی آزادی نے گوری

کو کرے میں منکر دیا اور کہا کہ جب تک اپنی زندگی کے حالات ایک معنوں کی شکل میں قائم نہ کر دو گئے دروازہ نہ کھلے گا شاید گود کی یہ حکم کی تعمیل کی اور وہ معنوں مقامی سرکاری اخبار میں ۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں طبع ہوا۔ گود کی نے جب اپنی خود فرستہ سوانح حیات سرکاری اخبار میں دیکھی تو بہت سرور ہوا اب وہ کہانیاں لکھنے لگا اور رسائل میں بھیجے گا جس سے اس کی کچھ کچھ شہرت بھی ہونے لگی لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی اس زمانہ میں ایک وکیل کی محوری کر لی۔ تنخواہ ملی تو عشق کی سوچی ایک پولیڈ کی عودت سے شادی کر بیٹھے ایک مکان دو روہل جہیز کر لیا پر لیا دہاں عصرت میں بسر کی بیچہ یہ لکھا کہ جیسے ٹوں کی دق ہو گئی۔ بھلا دماغی انسان اودے رماخ عودت کی کتب نہ کھسکتی ہے ایک دن گود کی اور اس کی بیوی ہم آغوش تھے تو گود کی نے اس کو محبت کے متعلق اپنا نظریہ سمجھانا شروع کیا۔ گود کی لکھتا ہے۔ "وہ میری باتیں سن کر مجھ کو بھی سی ہو گئی اور کہنے لگی کیا واقعی تمھارا یہ خیال ہے۔ کیا واقعی تم یہ خیال کرتے ہو؟" وہ گود کی کی ہم خیال نہ تھی۔ اس کا نظریہ محبت محض نفرت ہی تھا۔ وہ گود کی کے دوستوں نے بے تکلف بھی اس سے اس کو حسد ہوتا تھا۔ گود کی اپنی اس کمزوری کو فلسفہ کے رنگ میں دھال کر یوں بیان کرتا ہے۔ "مرد کی زندگی میں چند لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اپنا دل عودت کے سامنے اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے جس طرح کہ خدا کا پرستار خدا کے سامنے اپنے ظاہر و باطن کتبے نقاب کرتا ہے۔ جب عودت کے درمیان وہ باطن بے نقاب ہو جاتا ہے تو خود خدا اپنے آپ سے اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ شاید مرد میں حسد اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کی شریک حیات دوسرے مرد سے اتنی مانوس نہ ہو جائے کہ وہ شوہر کی لائیک بائیں دوسرے سے کہہ دے "فقہہ کو تار کچھ عرصے بعد گود کی اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو گئی اور گود کی انزبہ آورہ گردی کرتا رہا سارا پہنچ گیا جہاں اس نے اخبار کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

اخباری دنیا میں داخل ہوجانے سے زیادہ میل جول اور شہرت پہنچ جاتی ہے چنانچہ گود کی کی بھی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو گئی۔ اگر ایک طرف شہرت بڑھی تو دوسری طرف اسکو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ گود کی ۱۹۳۸ء میں بہت سخت بیمار ہو گیا جیسے ٹوں کی دق تو دن کرتی ہی تھی لیکن جب کمزوری بڑھی تو ایک اور دم عود کر آیا۔ افلاس و مصائب کے زمانہ میں گود کی نے خود کشی کی نیت سے اپنے گولی مار لی تھی جو کہ میری رہ گئی تھی اب اس گولی نے بھی تکلیف دینی شروع کر دی۔ حرارت ۱۰۳ درجہ پہنچ گئی۔ ڈاکٹروں نے بچوں کو علاج کیا پھر زندگی سے ناامید ہو کر فلاہر کی لیکن گود کی کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ وہ بیماری کو سنبھال لے گیا۔ صحت ہو گئی تو دوستوں نے زور دیا کہ اناؤ کا مجموعہ طبع کر لیا جائے۔ شاید اس سے گزراے کے لئے کچھ رقم وصول ہوجائے بڑی مشکل سے افسانے طبع ہوئے اور اس سے زیادہ دشواری سے دوکانداران کو وہ نفعی کی کشش کے کو فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ لیکن کتب فروخت کی تو تنوع کے خلاف ایک سال ہی میں ساری کتابیاں فروخت ہو گئیں۔ جب افسانے دوسری مرتبہ شائع ہوئے اور ناشروں نے گود کی کو ایک ہزار روہل روانہ کیے تو اس غیر متوقع خوش قسمتی پر گود کی بہت خوش ہوا۔ اس کے پڑوسی کا بیان ہے جب گود کی کو ایک ہزار روہل ملے تو اس کو خوشی کی بہت ۹۳ حیرت ہوئی وہ میری ماں کے پاس آئے اور مانگیں جو میری کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "دیکھو! دیکھو! انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روہل بھیجے ہیں۔ شیطان ان کو سمجھے انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روہل بھیجے ہیں۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا۔ اسی دن سے گود کی کی فغول خرجیاں شروع ہو گئیں۔ سارا میں گود کی سے ساتھ ایک اور چپ و تہ پیش آیا جس کو اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک روز دریا نے آگ کا کنارے ٹہل رہا تھا کہ آواز آئی مدد کرنا! بارے بھائیو مدد کرنا! بات اندھیرا تھی کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دریا میں با تھہ ہوا رہا ہے۔ میں فوراً دریا میں کود پڑا تیرتا ہوا دوڑنے والے کے پاس پہنچا اتفاق سے اس کے بال میرے ماتھ میں آ گئے۔ میں بال پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا لے آیا جب کنارے پر آ گئے تو اس آدمی نے اچانک میرا گلہ پکڑ لیا اور کہنے لگا اے! تجھے کیا حق تھا کہ میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچا، میں نے

جواب دیا، اسے بھائی تم دوب رہے تھے۔ مدد کے لیے چلا ہے
تھے وہ بولا، ارے احمق پانی تو میرے کندھوں تک تھا۔ رستی
میں نے پکڑ رکھی تھی پھر میں کیسے ڈوبتا ہوا کیا تو اندھا ہے، میں
نے جواب دیا۔ لیکن تم مدد کے لیے تو چلا رہے تھے کیا نہیں چلاؤ
اس نے کہا، پھر کیا ہوا اگر میں مدد کے لیے چلا یا۔ فریضہ کرو کہ میں
چلاؤں تو احمق ہے۔ تو احمق ہے تو کیا تو اس کا یقین کر لے گا۔
اچھا اب یا تو مجھے ایک دو بل دے ورنہ تمھانے جل، میں نے کچھ
دیر تو اس سے محبت کی پھر احساس ہوا کہ اس نے غلط سمجھا۔ سے
یہ بھی درست کہتا ہے میرے پاس تانے کے کچھ کتے تھے وہ اس
کو دے کر جان بھڑائی اور گھر ہولیا۔ اس بھڑکی بنا پر دنیا
کو زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھنے لگا۔

گورنگی کی شہرت ہوئی تو اسے درست چیخوت..... حنف
گورنگی کو فخر محض وطن ترک کرنے اور ماسکو کی رہائش اختیار
کرنے کا مشورہ دیا لیکن گورنگی نہ مانا۔ آخر کار چیخوت کو ایک
ترکیب سوچی اس نے گورنگی کو لکھا۔

مکمل میں مارشائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انھوں
نے تمھارا بڑی تعریف کی اور خیال ظاہر کیا کہ تم
قابل قدر مصنف ہو۔ انھیں تمھارے دو افسانے،
گو لگو آئیر اور ایوان۔ دی راقظ، بہت پسند ہو گئیں
مادون نہیں آیا۔ وہ فرماتے تھے کہ جبکہ تمھارا دل چاہے تم ایجاد
کر لو لیکن نفسیاتی کیفیات ایجاد نہیں ہو سکتیں تم کی کیفیات ایجا
کرنے ہو کہ مکمل مارشائے کے قریب میں ہیں آئیں میں نے ان کی
خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ جب بھی تم اسکو آؤ گے تو تم
اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

مارشائے تمھارے متعلق مدت سے دریافت کر رہے
تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمھاری بابت بہت
اچھا خیال رکھتے ہیں۔

یہ معلوم ہونا مکمل مارشائے کے دلنا چاہتے ہیں کسی نوخیز مصنف
کے لیے باعث فخر تھا۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملنے بھی گورنگی
نے ماسکو جانے کی ٹھان لی لیکن اس زمانہ میں اخباری زندگی
کے انقلابی مقالے رنگ لارہے تھے اند پولیس سمجھے بڑھی ہوئی
تھی ایک مدت بعد جب پولیس سے رہائی ملی تو جو بڑی مشاعرہ
میں گورنگی مارشائے سے ملنے گیا مارشائے اس ملاقات کے

مستقل اپنی ڈائری میں اندراج کرتے ہیں۔

گورنگی نے آئے ان کے ساتھ باتوں میں اچھا وقت گزرا
مجھے گورنگی پسند آئے۔ ایک عام روسی کی نفسیاتی کیفیت
کے پورے تر جان ہیں۔ اور خود بھی انھیں میں سے ایک ہیں
گورنگی اس پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”مکمل مارشائے مجھے کتب خانے میں لے گئے مجھے بھجایا اور خود
میرے سامنے بیٹھ کر میرے افسانے ”دارنکا“ کی تحلیل
کرنے لگے کچھ لگے۔ تمھارے افسانے کی وہ لڑکی دارنکا
صحت کی اچھی اور بھیخیر پندرہ سال کی لیکن وہ تخلیقی قوت
سے بے پروا اور وہ نوجوان پر فیر سے ہم آغوش ہو گیا
نہیں ہوئی ہے کیسے ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی طور پر غلط ہے
پندرہ سال کی نوجوان لڑکی یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس
کو چھوئے اور اس سے ہم آغوش ہو۔ مارشائے نے دو دن
گفتگو میں ایسی بے ججائی برتی کہ میں پریشان سا ہو گیا۔
کچھ بھی ان کی گفتگو صرف مناسب ہی نہیں بلکہ گندی
نیک ہوجاتی تھی۔“

مارشائے کی اس غیر متوقع طرز گفتگو پر پہلے پہلے تو گورنگی کو یگان
ہو کر شاید مارشائے اس کی سبھ پر اگر اس سے گفتگو کرتے ہیں
خاید یہ روسی ادب کے جزل اس کو دیہاتی خیال کرے اس سے
مکمل مارشائے والوں کی کسی شخص گوی کرتے ہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے
بعد گورنگی پر یہ راز افشا ہوا کہ مارشائے اصولاً دیہاتی زبان
بولنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں فصیح اور بناوٹ نہیں ہوتی
وہ زبان دلی اور شہری زبان کے تکلفات کو اچھا نہیں سمجھتے
جب دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو پھپھکیں جاتے ہیں گورنگی
کا بیان ہے۔ بعض مرتبہ مارشائے ایسی عریاں گفتگو کرتے تھے
کہ ہمارے چہرے غم سے سرخ ہوجاتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مارشائے، گورنگی اور چیخوت مل
رہے تھے کہ کو دفعتاً مارشائے نے چیخوت سے اس کے انوائی
تجربات بیان کرنے کی فرمائش کر دی۔ چیخوت بہت پریشان
ہوا۔ جب مارشائے نے چیخوت کی گھبراہٹ دیکھی تو خود
انے انوائی تجربات ایک خاص لطیف اور رنگینی کے ساتھ
بیان کرنے شروع کر دیے گورنگی لکھتا ہے ”اس وقت گندے
سنگین افسانے جو زبانوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے

نکلیں تھا وہ اپنی غلامت کھودیتا تھا اور سادہ قدرتی معلوم دیتا تھا، کرسیا کا ٹیک اور دھاتو گورکی کا ایک درست گورکی کی زبانی اس طرح بیان کرتا ہے۔

”ایک دن میں اور اس کا دوست سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ نا ملہرا لٹائے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک سمند کی شے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ ہم نے ادھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کبوتر کا جو بڑا بڑا سڑک پر غلیظ نجاست میں مفلوج ہے اور جہاں دیدہ و ملت آستانہ لٹھا جان کی طرف آنکھ مار رہا ہے کرتیرا ہے داپسی پر گورکی اور لٹائے میں خط و کتابت شروع ہو گئی، چند خطوط نوشتا پیش ہیں۔

گورکی کا خط لٹائے کے نام۔

”کیونکہ لیوچ۔ اس جن اخلاق کا جو آپ نے مجھ سے روادار کیا شکر ہے مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور آپ سے نیاز حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہوں۔ اگرچہ مجھے پہلے سے اس کا علم تھا کہ آپ ہر ماہ سے سادہ اور پر غلوں طریقہ پر لٹے ہیں لیکن جو محبت آپ نے میرے ساتھ دیا رکھی ہے اس کی مجھے امید تھی۔ مگر آج سب خیال نہ فرمایا تو اپنی ایک تصویر میرا نہ فرمائی۔ میں بھی ہوں کہ تصویر میرے محرم نہ فرمائی ہے۔

اسے پیشوتہ (گورکی کا نام)

لٹائے کا خط گورکی کے نام

”محان کرنا کہ میں ایک عرصہ کے بعد جواب دے رہا ہوں اور منہ زور تصویر بھی دواؤں دیکھ سکا مجھے تم سے مل کر اودھم گرنا یاد ہے۔ میں نے جان کر بہت خوشی ہوئی اور میرے دل میں جو تھا وہی محبت ہے وہ مجھے مسرور کرتی ہے۔ اگ لگوں کہا کرتا تھا کہ اپنی تصنیف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتے ہیں ہاؤ چند خواب۔ میں تمھاری تصانیف کا مطالعہ ہوں لیکن ان سے زیادہ تمھارا مذاہج ہوں میرے اس حیلہ سے سمجھاؤ کہ میں تمھارا کس درجہ مذاہج ہو گیا ہوں۔ تمھاری منبت میری تعریف اگر قابل قدر ہے تو صرف اس لئے کہ یہ بے لوث ہے۔ اچھا رخصت میں محلوں سے اپنا ہاتھ تمھارے مصافحے کے لئے پیش کرتا ہوں۔

لیوٹا لٹائے

گورکی کا خط لٹائے کے نام

”آپ کی تصدیق پر محبت بھرے الفاظ کا بہت بہت شکر ہے۔ لیونیکو لیوچ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ذات میری تصانیف سے بہتر ہے لیکن سولہ خیال منور ہے کہ مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتا ہے، اگر کتاب پر کیا؟ ایک محرک ادا کتاب بھی مردہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو صرف حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بر خلاف اس کے انسان کی زندگی ذات خدا کی صفات کی حامل ہوتی ہے میرا خدا کا مفہیم وہ جذبہ ہے جو انسان کی حقیقت شناسی، انصاف اور اپنے آپ کو مل بنانے پر آمادہ ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑا انسان بھی ایک اچھی کتاب سے بہتر ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ میرا یہ تاریخ یقین ہے کہ اس زمین پر انسان ان اشرف المخلوقات ہے اور مجھے دیو کرکس کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ صرف انسان کا وجود حقیقت ہے باقی سب زاید یا بیکار ہے۔ میں انسان کا پرستار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ ہاں میں اس جذبہ کو پوری طاقت سے ادا نہیں کر سکتا۔ میں تقدیر ملاقات کے لئے مضطرب ہوں۔ مجھے اب انوس ہے کہ فوراً ہی اپنی آندہ پوری نہیں کر سکتا مجھے کبھی کسی ہے اور دودان مرکی شکایت چوتھی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں تیری سے کام کر رہا ہوں۔ آج کل ضرورت سے زلیو عقلند لوگوں کے مستحق افسانہ نگار رہا ہوں میرے خیال میں ایسے افراد جہاں آپ کو عقلند و فقور کر رہے ہیں اور ان المخلوقات ہوتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ مزید تجھ پر کہیں آپ کو آگنا نہ دے۔ اچھا رخصت میں توبانہ آپ سے مصافحہ کرتا ہوں۔ میری طرف سے گھر والوں کو آداب۔

میں ہوں آپ کی محبت کا دعا گو

اے۔ پیشوتہ

کچھ عرصے بعد گورکی پھر دسی ظنند کے پاس آئے اور اس کی ہولناکیاں منور مٹانے کرنے کے دوڑوں ساتھ ٹھیسے جاتے تو لٹائے گورکی کا خفاؤں کے کرداروں کا برا مذاق ادا کرتے اور کہتے۔ گورکی تم اپنے کردار بجا کرتے ہو کبھی کہتے تمھاری تصانیف سے تمھاری

..... بائیں زیادہ لمبے ہیں، ایک فہم پہننے لگے۔
گور کی تہ بند اہمیت پسند ہوا، شہر ہوا، اس قسم کے لوگ انتشار کی
مہمیں ہوتے ملکہ ملکیت پسند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہولو پاکل فتنوں،
بکواس، باب مختار افانہ ساز، مجھے پسند ہے کہ بکواس میں تم نے
ایجاد سے کام نہیں لیا ہے اور وہ مختار اور دست چھوٹ شکایت بھی خراب
ڈرائے تھے، ایک دن ٹانسانے کھنے لگے ہم سب ادیب بے
منجے توجہ ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھو جب میں افانہ لکھتا ہوں تو کسی
کردار پر مجھے رحم آنے لگتا ہے اور اس میں چند اچھی خصوصیات پیدا
کر دیتا ہوں اور کبھی کسی کردار کو اچھی خصوصیات سے محروم کر دیتا ہوں
ہاں سب کردار ایک دوسرے سے گرنے نہ پائیں۔ اور پھر تنجیدہ لکھیں
فرمایا، اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ ادب بھڑوٹ ہے، ایک دھوکا
ہے اور اس وجہ سے مذموم ہے۔

۱۹۰۷ء میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر گور کی اپنے ہی شہر
کی جیل میں بند کر دیا گیا۔ جب ٹانسانے گور کی کے تجربے
اس حادثہ کی خبر دی تو ٹانسانے نے خود اسی دن رات روس کے پہنوی
اور وزیر خارجہ کو خط لکھے جو حسب ذیل ہیں۔
ٹانسانے کا خط نہ آدے کہ پہنوی کے نام

جناب قزاق صاحب!
وہی مصنف گور کی جس کی بابت گزشتہ سال میری اور آپ
کی باتیں ہوئیں، تعزیرات میں کی تصانیف کی آپ نے تعریف
فرمائی تھی۔ اس پر ایک حادثہ گزرا ہے۔ وہ اپنے اہل و
عیال سے جیل میں لایا گیا ہے اور بلا کسی عدالتی سماعت کے دو گور
روڈ کی جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی بیوی حالت اُمید میں
ہے۔ جیل کے محنت پسندانہ اہل کا آپ خود نوازہ دیا کرتے ہیں
اور خود کچھ کسے ہیں کہ وہ ایک دن کمر لینے کے لئے کھڑا
تھوڑا سا وقت ہو سکتا ہے۔ گور کی کی بیوی وہ اس کے دوستوں
کو چونکہ اس کا علم ہے کہ کثرت ایک انسان اور مصنف کے
ہیں گور کی کو لے کر لے جاتا ہوں اس لئے انھوں نے مجھ سے
یہ درخواست کی ہے کہ اس مصیبت میں جو کچھ ممکن کی
مدد کر سکتا ہوں کروں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف
دے رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ گور کی کو اس مصیبت سے
نجات دلانے میں آپ کی مبینہ فرمائیں گے اور نیکی کرنے کا
جبر نہ ہوئے گا ہے اس کو تاہم سے دیکھ دیکھ کر ان کا فتنوں
میں بند ہوا

ٹانسانے کا خط وزیر خارجہ کے نام

جناب عالی گور کی کی بیوی اور اس کے دوستوں نے مجھ سے
یہ درخواست کی ہے کہ پیشرو اس کے گور کو مدد جیل میں ملا
سماعت یہ قدر سرگرمی کو کس کو دیا جائے میں اس کی رہائی
کی کوشش کروں جس خاص جیل کے محنت پسندانہ حالات مجھے
معلوم ہوتے ہیں ان کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ایک دن کا
مصلحت ان حالات میں نہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا
ہیں گور کی کی عدالت میں اس حدیث سے نہیں جانتا کہ یہ کوا ایک شہر
ادیب ہے بلکہ اس کو ایک محفل اور ایک انسان ہو چکا ہے
اسے بھی جانتا ہوں۔ اگرچہ مجھ کو اس کی طور پر آپ نے بتا دیا ہے لیکن
مجھے اُمید ہے کہ گور کی اور اس کے اہل و عیال سے آپ ہمدردی
فرمائیں گے اور کچھ آپ کے تہذیب و قدرت میں ہے اس سے دریغ
نہ فرمائیں گے۔ اُمید ہے کہ مجھے تا اُمید نہ فرمائیں گے.....
لبرٹا ٹانسانے

ان خطوط کا یہ اثر ہوا کہ گور کی کو جیل سے نکال کر صرف حراست میں
رکھا گیا اس حراست کے دوران میں گور کی ٹانسانے کو خط لکھتے ہیں۔

تھوکیو لیج۔ میرے ساتھ میں آپ نے جو فرمائی اس
کا بہت شکریہ۔ جیل میں سے رہ کر دیا گیا ہوں لیکن
حراست میں ہوں۔ میری بیوی حالت اُمید میں ہے
اس لئے حراست میں بھی رحمت ہے شاید ایک ماہ
جیل میں رہا ہوں گا۔ اس عرصے میں میری صحت پر
پرکھنی خاص برا اثر نہیں پڑا اور نہ میری بیوی کی صحت پر
عدالتی تحقیقات جاری ہے، جہاں تک میں خیال کرتا
ہوں اس تحقیقات کا نتیجہ نکلے گا کہ مجھے وطن سے
دور کہیں بھیج دیا جائے اور پولیس کی نگرانی میں
رکھیں گے۔ دوبارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں
اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس معمولی سے معاملہ
میں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔

یہ حراست پڑی تھی کہ میرے اگر ایک سیاسی باورچی
خانہ میں ہے تو وہ سراسر مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں
گھر کے قریب جیل قدمی کر سکتا ہوں لیکن پولیس
کا سپاہی سایہ کی طرح ساتھ ہے۔ مجھے ان سڑکوں
پر جانے کی اجازت نہیں جہاں آمد و رفت زیادہ ہو

ساحس کو کسی ایک ایسے انسان کی نظرانی کرنا مستحکم
 معلوم ہوتی ہے جس کا ارادہ کبھی بھی وطن سے فرار نہ
 کا نہیں۔ اچھا شخصیت، آپ کو محنت، طاقت اور
 سکون قلب حاصل ہو۔ میں غرضوں کے ساتھ آپ کے
 حصہ فیہ کے لئے اپنا ہاتھ پیش کرتا ہوں۔
 اسے بچھو

۱۷ جولائی ۱۹۱۹ء کو جب ملاٹا نے ایک خطرناک حالات کے
 جو محنت باب ہوئے تو دنیا کی ہر سمت سے تہنیت و مبارک باد کے
 ہمارے گوتے کے وطن سے بھی حسب ذیل تار یا جس پر سب سے
 پہلے دیکھ کر کی گئے تھے۔

”سب لوگ بے حد سوچ رہے ہیں کہ آپ عدہ صحت ہیں۔
 اسے بزرگ انسان ہمارے دلی متعلقہ ہے کہ قیامت
 کے لئے تو اس دنیا میں صحت باب رہے مگر ہر
 انتہائی شہرہ یافتہ لفظ محض ہے، کینہ اور لفظ کے
 خلاف ہمیشہ جھاکتے رہیں؟“

۱۸ جولائی میں جب ملاٹا نے صحت کے خیال سے کر گیا
 گئے تو اس زمانہ میں دونوں دق کے مریض گور کی اور حیوت بھی
 روٹی قلندر کے پاس پہنچ گئے گور کی نے ایک یادداشت چھوڑی
 ہے جس کے حسب ذیل اندراجات درج ہیں۔

”ایک دن گور کی نے دیکھا کہ ملاٹا نے اپنی طبی
 ہاتھ دیے کھڑے ہیں اور ایک گویہ (ڈری قسم کی
 چھپکلی) سے جو دوپ کا لہری تھی کہہ رہے ہیں
 ”مزارا رہے نا، پھر چاروں طرف دیکھا اور گور
 سے کہنے لگے میں ہوں کہ زندگی میں کوئی لطف محض
 نہیں کرتا یہ“

گور کی لکھا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ملاٹا نے اپنے
 پوشیدہ پوشیدہ واقعات کے ہم دگاست ہر نظم کر دیے ہیں
 اور ان کا ذہنی رجحان مشقت سے مذہبی تھا لیکن وہ زندگی کا
 مستعدہ محل کر کے تھا اور ان کی نگاہ جب بھی اٹھی تھی تو ظلم کے سوا
 کچھ دیکھتی تھی گور کی لکھا ہے ”یہ خلا میں دیکھنا ملاٹا نے کے
 ہر اشیائے کئی کرتا ہے وہ جب اپنے بے تکلف دوستوں
 میں بیٹھے تھے تو کبھی کسی اس پردہ سے نقاب اٹھاتا تھا
 ایک دن حیوت نے یوٹیوٹ کی کتاب ”نئے اور ملاٹا نے“

کی تعلیمات میں خود شریعت کی کلاؤں کا احساس برتتے ہوئے
 ہونے لگا کہ اس کو کتاب بند نہ آتی، ملاٹا نے اس کی فوراً
 مخالفت کی اور کہا کہ کتاب درج ہے۔ میں مری قسم کے لوگوں
 کو اسے بکرتا ہوں بشرطیکہ ان کے دل میں غرضوں پر حیوت کتا
 ہے کہ حقیقت کی جستجو غفلت سے وہ درست کرتا ہے۔ حقیقت کس
 معرفت کی حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو آخر جاننا ہے پھر تری سے
 بوسہ ایک مرتبہ ان کی فکر کرنے کا عادی ہو جائے پھر وہ
 خواہ کسی مسئلہ ہی پر خود کہوں ذکر سے درہمیل وہ موت پر غور
 کرتا ہے اور جہاں موت ہے وہاں کیا حقیقت ہو سکتی ہے؟

ایک دن ملاٹا نے کہنے لگے: خلیفہ عبدالرحمن کہا کرتے
 تھے کہ تمام عمر میں ان کے چودہ دن خوشی سے گزرے ہیں لیکن میرے
 اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی وجہ ہے کہ میں بھی
 اپنے لئے زندہ نہیں رہا۔۔۔ دیکھا دے اور خود غمازی کے لئے
 زندہ رہا ہوں۔ اس خود غمازی کے سلسلہ میں گور کی اور ملاٹا نے
 کا حسب ذیل مکالمہ درج ہے۔

ملاٹا نے: گور کی اسکو تب جا رہے ہو؟
 گور کی: اب تک جلا جاتا لیکن نوجوانوں کی لیگ نے مجھے دعوت ۹۴
 دی ہے کہ ان کے جلسہ میں اپنا کوئی آواز نہ اٹھوں۔

ملاٹا نے: کیا تم بہت اچھا پڑھتے ہو؟
 گور کی: نہیں تو۔
 ملاٹا نے: تب دعوت قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا خود
 غمازی مقصود ہے؟
 گور کی: بد شرم سے شرح ہو کر (نوجوانوں کی لیگ مصر ہے اس
 لئے مجھے دعوت قبول ہی کرنی پڑی۔

ملاٹا نے: خود کوئی معری کیوں نہ ہو لیکن اس طرح صحت خود
 غمازی کے لئے کہیں جانا نا جائز ہے۔ ایک دفعہ اہرین
 سائنس کی کانفرنس ہوئی ایک دوست مجھے بھی لے گئے
 جب میں صدر مقام بریمنجا تو حاضرین نے مجھے ہجیان
 یا اور بلا استقبال کرنے کے لئے تالی بجائی بیترتے
 دوست نے مجھے کہی ماری اور کہا تو متھارا استقبال
 ہند ہمارے۔ حاضرین کے سامنے جھکو! میں نے کہا کیوں
 جھکوں میں نے کیا نقص کیا ہے؟
 اس مکالمے سے اگلے روز گور کی کے ایک دوست پولیسی

ٹالٹائے سے ملے اُسے تو ٹالٹائے نے کہا بھئی کل میں نے
سمٹائے دوست کا دل دکھا دیا میں نے اس سے یہ نہیں کہا
کہ اس کی سب سے بڑی ادنی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہمارے
سامنے ایک اوارہ انسان کا حیا جاننا مرتع پیش کیا ہے۔ تو کوئی
نے ایک جرم کا اور گور کی نے ایک اوارہ انسان کا قاتل دا مرتع
پیش کیا ہے جو دنیا کے ادب میں یادگار رہے گا۔ گور کی میں صرف
یہ کہی ہے کہ وہ بہت کچھ ایسا کر دیتے ہیں نفسیاتی کیفیات کو وہ
قدرتی نہیں رکھتے، ہمارے ٹالٹائے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں
"گور کی شاید غیر شعوری طور پر ہنسنے کی مقبول تعلیم سے متاثر معلوم
ہوتے ہیں مجھے ہنسنے کی تعلیم سید محمد کریم سے معلوم ہوتی ہے"

گور کی کے جو افسانے ٹالٹائے کی نظر سے گزرے ان کے
دو اشیاء ٹالٹائے کے قلم کے اس قسم کے۔۔۔ - فوٹ راج ہیں
"حلط، نفرت آمیز، کمرہ، جب ٹالٹائے نے گور کی کی تصنیف
"اعترافات" پڑھی تو فرمایا یہ عقل سے بالاتر ہیں۔ وفات سے
دو سال قبل ٹالٹائے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "گور کی کی
تصانیف پڑھیں بہت بُرا سمجھے ان کی ایجاد و اختراع بہت
غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گور کی کے لطیف انداز ہوتا ہے تو
ان کی اس قسم پرچس بکوان کی خوبصورتی پر نظر رکھی جائے ڈائری
میں دوسرا انداز ہے گور کی کی تصانیف ختم کیں ایک معنوی نیانی
طوفانی جذبہ جو سب غلط اور اختراع معلوم ہوتے ہیں لیکن
گور کی قلم سے دہی ہیں ان کو شاعری کرنی چاہیے کیونکہ شاعری
میں خیال اور دماغ کے لیے آوازہ گزری کرے کامیدان بہت
وسیع ہے۔ شاعری میں ہر قسم کا اختراع سمجھ جائے یا پھر ڈراما
لکھنا چاہیے کیونکہ اس میں بھی منظر انداز ایک ڈرامے کے مستقیم
جھپا لیتے ہیں۔

ایک دن جو فوٹ اندھا ٹالٹائے باتیں کر رہے تھے دہلوان
گھنگو میں گور کی کا ذکر کیا جو فوٹ نے کہا نہ گور کی بڑا اصل
انسان ہے، ٹالٹائے نے فوراً گردن ہلائی اور بولے نہیں
نہیں ان باتوں کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں اس کی لطیف کی
سینا ناک ہے ایسے لوگ دل کے ٹرے خراب ہوتے ہیں در
ہاں دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں گور کی کو نہیں کرتیں اور
جس طرح کتاب نیکدل انسان کو فوراً شو نگہ بنا ہے اسی طرح
عورتیں بھی ایک نیکدل انسان کو شو نگہ لیتی ہیں کیونکہ عورتیں

گور کی سے محبت نہیں کرتیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
نیک دل نہیں ہے

ایک دن ٹالٹائے اور گور کی چل رہے تھے کچھ جگہ
میں سے ایک جڑیا کے بولنے کی آواز آئی، ٹالٹائے نے اس
کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا
گور کی جڑیا سے ہنس مچکا تھا۔ اس لئے جڑیوں کی بابت اس کی
معلومات کافی تھی گور کی نے اس جڑیا کی یہ خصوصیت بیان کی
کہ یہ جڑیا بہت حاسد ہوتی ہے۔ اس پر ٹالٹائے بولے
"صرف ایک راگ سینے میں ہے اور اس پر بھی حاسد ہے۔ کیا
ظلم ہے کہ انسان کے سینہ میں ہزاروں نغمتیں ہیں اور جب
وہ حد تک تڑپے تو دنیا اس کو تڑپا کہتی ہے پھر حد کی بات لگتو
ہونے لگی اور ٹالٹائے نے اسے پہلے خیال سے جڑ کا اظہار
دہانے ناول کو کر دسٹیا" میں کر چکے تھے۔ اعتقاد کیا گور کی
نے کہا کہ کر دسٹیا، میں تو آپ نے اور خیال ظاہر کیا ہے اس
پر ٹالٹائے نے ہنس کر جواب دیا۔ میں جڑیا نہیں ہوں کہ ایک
ہی راگ گائے جاؤں

اگر ٹالٹائے گور کی کی تصانیف پر سخت تنقید کرتے تھے
تو گور کی بھی ٹالٹائے کے فلسفہ پر تنقید کرنے میں کچھ کم نہ تھے
گور کی کا خیال تھا کہ ٹالٹائے کا فلسفہ (

نراجی اور جینیوں کا فلسفہ ہے۔ ان کا عدم تشدد اور اپنہا کا
فلسفہ قوت عمل کو مفلوج کرتا ہے۔ ایک ذمہ دار گور کی
ڈاکٹر، الکوت اور ٹالٹائے باتیں کر رہے تھے تو ٹالٹائے نے ایک
منزنی حنف کے ناول کے ایک سین کی بڑی تریف کی جس میں
ایک شرابی میاں نے اپنی بیوی کو زور دیکوب کیا تھا لیکن باوجود
خاندان کے اس تشدد کے شریف سوبی نے میاں کا ہتھیار اس
کو آرام سے لٹایا اور اس کے سر کے نیچے ٹیکہ رکھا، ٹالٹائے
کا رائے تھی اس سین میں ادبی جہر موجود ہے۔ گور کی اس وقت
ٹوٹا ٹٹائے کی رائے منتظر رہا لیکن جب ڈاکٹر الکوت کے
ساتھ گھر واپس ہوا تو خیال میں متفق خود ہی خود ملین سے
کہنے لگا تنکیر سر کے نیچے رکھ دیا یہ ادبی جہر ہے! ایک کئی گھر
اٹھا کر کھوپڑے پر راتی، باوجود ان اختلافات کے گور کی
ٹالٹائے سے بہت محبت کرتا تھا۔ کمریا کے حالات میں گفتا
ہے۔

”ایک روز جیل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا اٹا لٹکائے پتھروں میں لٹکے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے پتھر میں جان ٹر گئی ہے۔۔۔۔۔ ایک پتھر پر کھینچی ہوئی سب سے عجیب و غریب بات تھی۔ ڈاکو کی سفید بالوں میں سے انگلیاں نکلی ہوئی تھیں اور سمندر کے بار نظر ڈال رہے ہیں۔۔۔۔۔ سمندر کی موجیں اس بناٹ سے ٹکرا رہی ہیں۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تاجا دوگر سمندر کی موجوں کو حکم دے رہا ہے۔۔۔۔۔ اس سین نے میرے قلب پر عجیب اثر کیا۔۔۔۔۔

اس وقت مجھے ایسا احساس ہوا کہ جس وقت تک یہ انسان روئے زمین پر موجود ہے۔ میں ہمہ دلیس نہیں ہوں، جب اٹا لٹکے کی دھات کی غیر آبی تو گور کی کی روتے روتے پنجکی بندھ گئی اور اس وقت واقعی اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ یتیم دلیس ہو گیا ہے۔

گور کی اگرچہ اٹا لٹکے کے مذہبی تعلیمات سے بیزار تھا، لیکن اتنا نہیں خفا سمجھا جاتا ہے گور کی لکھتے ہیں:-

”اٹا لٹکے نے اچانک مجھ سے دریافت کیا گور کی تم خدا کو کیوں نہیں مانتے؟ میں نے عرض کیا یوینیکو بوج مجھے یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ فرمائے لگے یہ غلط ہے۔ تم نہ خدا میں یقین رکھتے ہو۔ خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں تم سمجھ لے یہی عرض میں اس حقیقت کا احساس کرو گے۔ دنیا ویسے نہیں جیسا کہ تم اس کا ہونا چاہتے ہو۔ تمہارا خدا پر یقین نہ رکھنا صرف ہٹ دھرمی کا بنا پر ہے۔ کچھ گور صرف فرم کی وجہ سے خدا پر یقین نہیں رکھتے جیسے چند نوجوان ہیں کہ عورت ان کو پسند تو ہوتی ہے لیکن شرم یا کم سن کی بنا پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے یقین مثل محبت کے جراثیم پھیل جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے کہے میں یقین کرتا ہوں تو سب کام درست ہو گیا تم اپنی پیدائش سے خدا پر یقین رکھتے ہو اب یہ کہنا بیکار ہے کہ تم یقین نہیں رکھتے۔ تم کہتے ہو حال اندھا مال کیا ہے ہو؟ یہ خدا کا بلند درجہ اور مکمل نور ہے کہ نہ کہ اٹا لٹکے نے اس سے قبل کبھی مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اس لئے اس غیر متوقع گفتگو نے مجھے حیرت زدہ کر دیا اور میں کچھ جواب نہ دے سکا پھر اٹا لٹکے نے مجھے ہنسنے کا اشارہ کیا میری طرف ہلکا ہونے کا تم چپ کر رہا تھا پھر نہیں چھڑا سکتے۔ ہرگز نہیں

چھڑا سکتے۔ اس بات کے یو گور کی لکھتے ہیں۔

”میں اگرچہ خدا پر یقین نہیں رکھا لیکن اس وقت میرا دل میں کہا کہ انسان خدا سے قریب تر ہے۔“

ایک خط جس سے گور کی کی طبیعت شرافت کا تذکرہ ہے حب ذیل ہے جب گور کی کی تعریف کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی گئی تھی اور وہ دنیا کا ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بنا چکا تھا اس وقت اپنے دوست اور ضربی لکھی آئی گور کی کو سوانحیات لکھنے پر مجبور کیا گیا تھا:

میرے حبیب دوست اور استاد!

آج ۴۴ سال گزر چکے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ آپ سے نیا زچہ مل جوا تھا۔ جب آپ اور میں آخری مرتبہ ملے تھے اس کو بھی آج ۲۲ سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں مجھے سیکڑوں انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جس میں امریکی تھے اور عالم بھی لیکن یقین کیجئے کہ ان میں سے کسی کی محبت نے اس جذبہ کو دم نہیں کیا جو آپ کے لئے میرے دل میں موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ پہلے شخص تھے جس نے میری طرف خاص انسانی ہمدردی کی نظر ڈالی۔

آپ پہلے انسان تھے جس نے مجھ میں خود بخود سی پیدائی اور یہ آپ کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ ۳۰ برس سے میں روسی ادب کی خدمت کر رہا ہوں اس امر کے تحریر کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ انسان کی انسان سے ہمدردی کرنا کتنی عجیب شے ہے۔ میرے دیرینہ دوست۔ میرے حبیب استاد میں محبت اور تشکر سے اپنا ہاتھ آپ کے مصافحہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

ایکسی حیثیت (گور کی کا اصل نام)

سینی بک مینوفیکچرنگ ڈپو

لیٹریٹک، رائٹنگ پیڈ، نوٹ پیپر، اکسرسائزنگ، نوٹ بک
ڈیلیکیٹ بک

ہر قسم کی اسٹیشنری کچھ ہول سیل اور ریل کیلئے

ہماری خدمات حاصل کر کے فائدہ اٹھائیے

سینی بک مینوفیکچرنگ ڈپو

۷۲۔ عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی ۳



کتابخانه آفتاب

پروپرائٹرز: سیفی فقیہ برادران

محمد علی رودبختی نمبر ۳

آغازی ریس و مفسر
آغازی محمد حسن زریں
نوعی دوسرے

دستی علی دن
سی علی
صلاتی کس

بیت برادران
بن آواز اصلان

تورقون ریس و مفسر
تورقون محمد حسن زریں
نوعی دوسرے



چند روزہ تکسول کے استمال سے

کہ اور اوڑھے اشتیاق میں بھی خانوں کی کسی حالت پیدا ہو جاتی ہے اس طاقت کا ارہ مدار جسم کے غددوں پرست دیا کہ صورت میں بتایا گیا ہے **مکسول** ان تمام غددوں کی طاقت فنی کرنا کہ مضبوط کرنا ہے قیامت راجس ٹھہرے وہ بھی کھن تن رہ رہے ۔ اچھے ، واڈوشس سے ٹاپ کب سے ا

نکسول ڈیو، پوسٹ باکس ۳۰۶۵، ممبئی ۴۰

